ماہنامہ
حنا
نومبر 2013
ناولٹ نمبر
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مستقل سلسلے

کتاب نگر سے — سمی کرن 223
حاصل مطالعہ — تحریم محمود 237
بیاض — تسنیم طاہر 240
رنگ حنا — بلقیس بھٹی 243
میری ڈائری سے — صائمہ محمو 245
حنا کی محفل — عین غین 247
حنا کا دسترخوان — افراح طارق 249
کس قیامت کے یہ نامے — فوزیہ شفیق 252

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماهنامه حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690 , 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامیات

حمد — منیر نیازی 7
نعت — عنایت علی 7
پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں — سید اختر ناز 8

انشاء نامہ

سونا شہر — ابن انشاء 13

انٹرویو

ایک دن حنا کے نام — فوزیہ شفیق 15

سلسلے وار ناول

وہ ستارہ صبح اُمید کا — فوزیہ غزل 18
تم آخری جزیرہ ہو — ام مریم 164

ناولٹ

تم بن صنم — سیدہ شگفتہ شاہ 48
حقوق — شاہینہ چندا 142
دن لگیں گے — خالدہ نثار 188
کاسۂ دل — سندس جبیں 120

افسانے

ابھی اُمید زندہ ہے — دُرِ نجف 41
گلشن کا خدا حافظ — روبینہ سعید 210
صبح کا بھولا — کنول عمران 24

کچھ باتیں ہماری

قارئین کرام! نومبر 2013ء کا شمارہ بطور ناولٹ نمبر پیش خدمت ہے۔

ساری دنیا میں جو ادارے عوام کو زندگی کی سہولیات فراہم کرتے ہیں اس چیز کو ممکن بناتے ہیں کہ عوام پر کوئی اضافی بوجھ نہ پڑے، جبکہ حکومت چاہے وہ فری مارکیٹ اکانومی پر کاربند ہو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ یہ ادارے کسی بھی طریقے سے شہریوں کا استحصال نہ کریں، ہمارے ہاں صورتحال اس کے برعکس ہے، حکومت غیر ملکی مالیاتی اداروں سے اندھا دھند قرض لیتی ہے اور ان اداروں کی سخت شرائط کو پورا کرنے کے لئے عوام کی بنیادی ضروریات کو ذیل میں آنے والی چیزوں کے نرخوں میں بے تحاشا اضافہ کر کے ان کا جینا محال کر دیتی ہے، اس کی مثال گزشتہ دنوں میں بجلی اور پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ ہے، دنیا بھر میں تیل کی قیمتیں کم ہوئی ہیں مگر ہمارے ہاں ان میں اضافہ کیا گیا ہے، اب جب شور مچ رہا ہے تو شاید تھوڑی سی کمی کر کے عوام کی اشک شوئی کی جائے مگر جس تناسب سے اضافہ کیا گیا تھا، کمی اس تناسب سے نہیں ہو گی۔

اس طرح بجلی کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کیا گیا ہے، جس کا عدالت اعظمیٰ نے از خود نوٹس لیا ہے اور دوران سماعت جناب چیف جسٹس نے استفسار کیا کہ 2 روپے یونٹ والی بجلی کس طرح عوام کو 16 روپے یونٹ دی جا رہی ہے، حکومت نے کس فارمولے کے تحت قیمتوں میں اضافہ کیا ہے، سب سے بڑے سٹیک ہولڈر عوام ہیں، نیپرا ٹیرف میں اضافہ کرتے ہوئے ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی، حکومت لائن لاسز کا سارا بوجھ بھی غریب صارفین پر ڈال رہی ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چوری کریں اور جو چوری نہ کریں ان کو ایک ہی قیمت پر بجلی فروخت کی جائے، اس طرح تو حکومت نالائقوں کو نواز رہی ہے، چیف جسٹس صاحب کے یہ ریمارکس پوری قوم کے دل کی آواز ہیں اور پوری قوم یکجان ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ وہ حکمرانوں کو غریب عوام کی بھلائی کے لئے درست فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے نام میں ملئے سیمی کرن سے، طیبہ ہاشمی کا مکمل ناول، شگفتہ شاہ، شاہینہ چندا مہتاب، خالدہ نثار اور سندس جبیں کے ناولٹ، دُر نجف، روبینہ سعید اور کنول عمران خان کے افسانے، فوزیہ غزل اور اُم مریم کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر

سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیان جو ہیں مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے
ستارے چاند سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خواب ہستی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوف باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پرانی داستانوں میں

منیر نیازی

نعت رسول مقبول ﷺ

مرا جذب دل میرے کام آ گیا ہے
مدینے سے آخر پیام آ گیا ہے

جہاں ذکر خیر الانام آ گیا ہے
لبوں پہ درود و سلام آ گیا ہے

چمن میں جو وہ خوش خرام آ گیا ہے
بہاروں کو گویا پیام آ گیا ہے

کہا جس کی آمد پہ انسانیت نے
کہ خیر البشر لاکلام آ گیا ہے

ستاروں کو تابندگی بخشنے کو
افق پہ وہ ماہ تمام آ گیا ہے

ازل سے زمانہ تھا مشتاق جس کا
وہ محبوب بالائے بام آ گیا ہے

خدا کے کرم کی کرامت تو دیکھو
کرم بن کے راس الکرام آ گیا ہے

کوئی کاش آ کر عنایت سے کہہ دے
غلاموں میں تیرا بھی نام آ گیا ہے

پروفیسر عنایت علی خان

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

توبہ

عبد اللہ بن کعب بن مالکؓ سے روایت ہے، یہ (عبداللہ) حضرت کعب کے بیٹوں میں سے ان کا رہبر تھے، جب وہ نابینا ہو گئے تھے، یہ کہتے ہیں، میں نے (اپنے باپ) کعب بن مالکؓ کو وہ واقعہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے، جب وہ غزوہ تبوک میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے۔

حضرت کعبؓ نے فرمایا۔

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی غزوہ (جہاد) کیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا، سوائے غزوہ تبوک کے، البتہ غزوہ بدر میں بھی میں پیچھے رہا تھا، لیکن غزوہ بدر میں پیچھے رہنے والوں پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، اس غزوے میں تو دراصل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان قافلہ قریش کے تعاقب میں نکلے تھے، (یعنی ابتدا جہاد کی نیت نہیں تھی) یہاں تک کہ اللہ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدے (بغیر ارادہ اعلان قتال) کے ایک دوسرے کے مقابل جمع (صف آرا) کر دیا، اور عقبہ کی رات (منیٰ میں) میں حاضر تھا، جب ہم نے اسلام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد وفا باندھا تھا، اگرچہ واقعہ بدر کا چرچا لوگوں میں عقبہ کی رات سے زیادہ ہے، لیکن مجھے بدر کی حاضری سے اس رات کی حاضری زیادہ محبوب ہے، (کیونکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے)

اور میرے غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہنے کا واقعہ اس طرح ہے کہ میں اتنا زیادہ قوی اور اتنا زیادہ خوش حال کبھی نہ تھا جتنا اس وقت تھا، جب میں غزوہ تبوک میں آپ سے پیچھے رہا۔

اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی اکٹھی دو سواریاں نہیں ہوئی تھیں، جبکہ اس موقع پر مجھے بیک وقت دو سواریاں میسر تھیں، (مطلب یہ ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے میرے پیچھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے غیر کے ساتھ توریہ فرماتے، (یعنی سفر کی اصل سمت چھوڑ کر عام طور پر دوسری سمت کا ذکر فرماتے، تاکہ دشمن سے اصل حقیقت مخفی رہے) حتیٰ کہ یہ غزوہ تبوک ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت گرمی کے موسم میں یہ غزوہ فرمایا، سفر دور کا اور جنگل بیابانوں کا تھا اور مدمقابل دشمن بھی بہت بڑی تعداد میں تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (توریے کی بجائے) مسلمانوں کے معاملے (یعنی اس محاذ جنگ) کو مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان فرما دیا، تاکہ وہ اس کے مطابق بھرپور تیاری کر لیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں وہ سمت بھی بتلا دی، جس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارادہ فرما رہے

تھے۔

مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بڑی تعداد میں تھے اور کوئی یادداشت کی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں ان کے نام درج ہوتے، اس سے ان کی مراد رجسٹر تھا، حضرت کعبؓ فرماتے ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص جنگ سے غیر حاضر رہتا تو وہ یہی گمان کرتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخفی رہے گا اور وحی الٰہی کے بغیر اس کی غیر حاضری آپ کے علم میں نہیں آئے گی اور یہ غزوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب پھل پک چکے تھے اور ان کا سایہ عمدہ اور خوشگوار تھا اور میں ان ہی (پھلوں اور سایوں) کی طرف میلان رکھتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے تیاری کی اور میرا حال یہ تھا کہ صبح کو آتا، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تیاری کروں، لیکن بغیر کوئی فیصلہ کیے لوٹ جاتا اور اپنے دل میں کہتا کہ میں جب چاہوں گا (چلا جاؤں گا، کیونکہ......) میں پوری طرح اس پر قادر (وسائل سے بہرہ ور) ہوں۔

میری یہی (گوموگی) حالت رہی اور لوگ جہاد کی تیاری میں لگے رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسلمان ایک صبح کو جہاد پر روانہ ہو گئے اور میں اپنی تیاری کے سلسلے میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر پایا۔

میری کیفیت یہی رہی، حتیٰ کہ مجاہدین تیزی سے آگے چلے گئے اور جہاد کا معاملہ بھی آگے بڑھ گیا، میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی سفر پر روانہ ہو جاؤں اور ان سے جا ملوں، اے کاش! کہ میں ایسا کر لیتا، لیکن یہ میرے مقدر میں نہ ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چلے جانے کے بعد جب میں لوگوں میں نکلتا تو یہ بات میرے لئے حزن و ملال کا باعث بنتی کہ میرے سامنے اب کوئی نمونہ ہے تو صرف ایسے شخص کا جو نفاق سے مطعون ہے، (یا نفاق کی وجہ سے لوگوں میں حقیر ہے) یا ایسے کمزور لوگوں کا جنہیں اللہ نے معذور قرار دیا۔

(سارے راستے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یاد نہیں فرمایا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک پہنچ گئے، تبوک میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں تشریف فرما تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔

"کعب بن مالک نے کیا کیا؟"

بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا۔

"اسے اس کی دو چادروں اور اپنے دونوں پہلوؤں کو دیکھنے نے روک لیا ہے۔" (یعنی دولت اور اس کے عجب اور کبر نے اسے نہیں آنے دیا۔)

معاذ بن جبلؓ نے اس سے کہا۔

"تو نے ٹھیک نہیں کہا، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے اس (کعب) کے اندر خیر کے علاوہ کچھ نہیں جانا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سفید پوش آدمی کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ابو خیثمہ ہوگا۔"

اور واقعی وہ ابو خیثمہ انصاری تھے اور یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے (ایک مرتبہ) ایک صاع (تقریباً ڈھائی کلو) کھجور کا صدقہ کیا تو منافقین

نے انہیں (اس کے تھوڑا ہونے کا) طعنہ دیا تھا۔

حضرت کعبؓ نے کہا، جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک سے واپسی کا سفر شروع فرما دیا ہے تو مجھ پر غم کی کیفیت چھا گئی اور جھوٹے بہانے گھڑنے کا سوچنے لگا اور (دل میں) کہتا کہ کل (جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لائیں گے تو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضی سے میں کیسے بچوں گا اور اس معاملے میں، میں اپنے گھر کے ہر سمجھدار آدمی سے بھی مدد طلب کرتا رہا۔

جب مجھے بتلایا گیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آنے ہی والے ہیں تو (جھوٹے بہانے گھڑنے کا) باطل خیال میرے دل سے دور ہو گیا اور میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ بلاشبہ میں جھوٹ سے کبھی بھی بچاؤ حاصل نہیں کر سکوں گا، چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر لوگوں کے سامنے بیٹھ جاتے۔

(اس سفر سے واپسی پر بھی) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو منافقین نے آ کر عذر پیش کرنے اور حلف اٹھانے شروع کر دیے اور یہ تقریباً 80 آدمی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ظاہری عذر کو قبول فرم لیا، ان سے بیعت لی، ان کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کی باطنی کیفیت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا، جب میں نے سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراض آدمی والا تبسم فرمایا، پھر فرمایا۔

"آگے آ جاؤ۔"

میں آگے آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سامنے بیٹھ گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں کس چیز نے (جہاد سے) پیچھے رکھا؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟"

میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کی قسم! میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو یقیناً میں کوئی (جھوٹ موٹ) عذر کر کے اس کی ناراضی سے بچ جاتا، مجھے بحث و تکرار کا بڑا ملکہ حاصل ہے، لیکن اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ اگر آج میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جھوٹ بول کر سرخ رو ہو جاؤں اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں تو عنقریب اللہ تعالی (وحی کے ذریعے سے مطلع فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی بات عرض کر دوں تو اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ پر ناراض ہوں گے، لیکن اس میں مجھے اللہ سے اچھے انجام کی امید ہے، (اس لئے سچ سچ عرض کرتا ہوں) اللہ کی قسم! (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جانے میں) مجھے کوئی عذر نہیں تھا، اللہ کی قسم! میں اتنا طاقت ور اور خوش حال کبھی نہیں رہا جتنا میں اس وقت تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے رہا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس شخص نے یقیناً سچ کہا ہے، چنانچہ تم (یہاں سے) کھڑے ہو جاؤ، یہاں تک کہ

تمہارے متعلق اللہ تعالی فیصلہ فرمائے۔"

"میرے پیچھے بنو سلمہ کے کچھ لوگ آئے اور مجھ سے کہا۔"

"اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے قبل تم نے کوئی گناہ کیا ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا عذر پیش کرنے سے کیوں قاصر رہے جیسا دوسرے پیچھے رہنے والوں نے پیش کیا، تمہارے گناہ (کی معافی) کے لئے یہی کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے لئے مغفرت کی دعا فرماتے۔"

حضرت کعبؓ نے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! مجھ وہ (میری سچائی پر) ملامت کرتے اور ڈانٹتے رہے، یہاں تک کہ میرے جی میں آیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو کر اپنی پہلی بات کی تکذیب کر دوں (اور کوئی جھوٹا عذر پیش کر دوں) لیکن پھر میں نے ان سے پوچھا۔

"کہ میرے ساتھ والا معاملہ کسی اور کو بھی پیش آیا ہے؟"

انہوں نے کہا۔

"ہاں تمہارے جیسا معاملہ دو اور آدمیوں کو بھی پیش آیا ہے اور انہوں نے بھی وہی بات کہی ہے جو تم نے کہی ہے اور انہیں بھی (بارگاہ رسالت سے) وہی کچھ کہا گیا ہے جو تمہیں کہا گیا ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا۔

"وہ شخص کون ہیں؟"

انہوں نے کہا۔

"مرارہ بن ربیع عمری اور لال بن امیہ واقفی۔"

یہ دونوں آدمی جن کا انہوں نے میرے سامنے ذکر کیا، نیک تھے اور جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے اور ان میں میرے لئے نمونہ تھا، جس وقت انہوں نے ان دونوں آدمیوں کا میرے سامنے ذکر کیا تو میں اپنے سابقہ موقف پر جم گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے رہ جانے والوں میں ہم تینوں سے، لوگوں کو گفتگو کرنے سے روک دیا۔

حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ہم سے کنارہ کش ہو گئے، یا یہ کہا کہ لوگ ہمارے لئے بدل گئے، حتیٰ کہ زمین میرے لئے اوپری بن گئی، یہ زمین میرے لئے وہ نہ رہی جو میری جانی پہچانی تھی۔

اس طرح پچاس راتیں ہم نے گزاریں، میرے دوسرے دو ساتھی تو عاجز آ گئے اور گھروں میں بیٹھے روتے رہے، لیکن میں بالکل جوان اور نہایت قوی و توانا تھا، چنانچہ میں گھر سے باہر نکلتا مسلمانوں کے ساتھ نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا، لیکن مجھ سے کلام کوئی نہ کرتا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام بھی عرض کرتا اور اپنے دل میں کہتا کہ سلام کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مبارک لبوں کو جنبش دیتے بھی ہیں یا نہیں؟

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہی نماز پڑھتا اور دزدیدہ نظروں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا، (تو میں نے دیکھا کہ) جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رخ کرتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے اعراض فرما لیتے۔

یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی (میرے ساتھ) سختی اور بے رخی زیادہ دراز ہو گئی تو ایک

روز میں ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا اور وہ میرا چچازاد بھائی اور لوگوں میں مجھے محبوب ترین تھا، میں نے اسے سلام کیا، لیکن اللہ کی قسم! اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، میں نے اس سے کہا۔

"ابو قتادہ! میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تو میرے متعلق جانتا ہے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہوں؟"

وہ خاموش رہا، میں نے دوبارہ قسم دے کر پوچھا تو بھی وہ خاموش رہا، حتیٰ کہ تیسری بار دے کر سوال دہرایا تو اس نے یہ کہا۔

"کہ اللہ اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔"

جس پر میری آنکھوں سے (بے اختیار) آنسو جاری ہو گئے اور میں (جیسے گیا تھا ویسے ہی) دیوار پھاند کر واپس آ گیا۔

اسی اثنا میں (ایک روز) میں مدینے کے بازار میں جا رہا تھا کہ اچانک اہل شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی جو مدینے میں غلہ بیچنے کے لئے آیا تھا، کہہ رہا تھا۔

"کہ کون ہے جو کعب بن مالک کی طرف میری رہنمائی کرے؟"

لوگ اس کے لئے میری طرف اشارہ کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ میرے پاس آ گیا اور اس نے مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا، میں پڑھا لکھا تو تھا ہی، میں نے اسے پڑھا، اس میں اس نے لکھا تھا۔

"امابعد! ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم پر ظلم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت کے گھر میں رہنے یا ضائع کرنے کے لئے نہیں بنایا ہے، ہم تمہیں دعوت دیتے کہ ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تم سے پوری ہمدردی کریں گے۔"

جب وقت میں نے یہ پڑھا تو میں نے کہا۔

"یہ بھی ایک آزمائش ہے۔"

میں نے اس (خط کو) تنور میں ڈال کر جلا ڈالا، حتیٰ کہ جب پچاس دنوں میں سے چالیس دن گزر گئے اور (میرے بارے میں) وحی کا سلسلہ بھی (ابھی تک) موقوف ہی تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قاصد کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا، اس نے آ کر کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے (بھی) علیحدگی اختیار کر لو۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا میں اسے طلاق دے دوں یا کیا کروں؟"

اس نے کہا۔

"(طلاق) نہیں، اس سے علیحدگی اختیار کرو، اس کے قریب مت جاؤ۔"

اور میرے دوسرے دو ساتھیوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی پیغام بھجوایا، میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ اور ان ہی کے پاس رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا فیصلہ فرما دے۔"

☆☆☆

ابن انشاء

کوئی ملاح بیٹھا نہیں ناؤ میں — کہنہ صدیوں کی افسوں زدہ خامشی
دیواروں کے جھنڈوں کے پھیلاؤ میں — ایک ویرانی جاوداں و جلی

جیسے ہاری ہوئی فوج کے سنتری — ایک کہرا ہے پھیلا ہوا دور تک
بام چھونے میں کیوں دیر اتنی کری — ایک مذبح کی دیوار کے اس طرف

جانے کس دیس سے جانے کس شہر سے — گھاٹ خالی ہے پانی ہے اترا ہوا
خالی فردا کی خالی امیدیں لیے — دھندلا دھندلا افق کھو گیا ہے کہیں

ٹھنڈے چولھوں میں ٹھٹھری ہوئی آگ ہے — رنگ رودو دکش سرنگوں ہو گئے
کی ٹھکانا ملے، کب جنازہ اٹھے — سونے آنگن میں الجھی ہوئی گھاس نے

شہر آباد تھے گاؤں آباد تھے — ایک قسمت کا مارا ہوا کارواں
کار گاہوں میں تھا شور محشر بپا — ہانپتا کانپتا آ گیا ہے یہاں

کون آیا تھا آ کے یہ کیا کر گیا — تنگ گلیوں کی پہنائی میں چھائی ہے
جنگلوں میں گزرے تو چیخے ہوا — ساتویں آسماں سے اتر آئی ہے

پھول بن میں نہ پیلی ہری کھیتیاں
چیلیں منڈلا رہی ہیں یہاں سے وہاں
موٹروں گاڑیوں پیدلوں میں کوئی
کس کے ایماء و ارشاد کے منتظر

کون سی نہر ہے کون سا باغ ہے
زندگانی کے دامن کے پھیلاؤ میں
چوک پر آ کے سیل زماں رک گیا
اک سپاہی چلیپا کی صورت کھڑا

راہ گیروں کے اٹھے قدم تھم گئے
جانے والے جہاں تھے وہیں جم گئے

موم کی شمعوں کی لوئیں لرزنے لگیں
آمد آمد ہے بلوان طوفان کی

بیکراں درد چہروں پہ مرقوم ہے
کوئی بتلائے کیا کس کو معلوم ہے؟

مہر سے چاند تارے الجھنے لگے
کیسے وحشت کے مارے الجھنے لگے

عالم رنگ و بو تھا یہیں دوستو
یہ بہت دن کی باتیں نہیں دوستو

آرتی کے لئے منتظر ہے جہاں
گوشت اور خون کے سر دو جامد بتو

لے گیا کون دھرتی کی تابندگی
زندگی زندگی زندگی

چوک پر آ کے سب راستے کھو گئے
سرخ پگڑی ہے سر پر جمائے ہوئے

کون سے پات ہیں کون سا پھول ہے
دشت کے خار میں دشت کی دھول میں

محفلوں کا اجالا گیا سو گیا
دیکھنا دیکھنا دیکھنا دیکھنا

طاقت و عزم رفتار باقی نہیں
مدتوں سے کھڑے ہیں وہیں کے وہیں

آندھیوں سے غبارے الجھنے لگے
ایک دشمن سے سارے الجھنے لگے

سحر نا وقت نے بے خبر آ لیا
آگے جانے کا جب راستہ نہ ملا

اپنی آنکھوں کی پھیلاؤ تو پتلیاں
کچھ تو بولو زبانوں سے کچھ تو کہو

☆☆☆

قاری کا مصنف سے دلی و جذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب و روز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "ایک دن حنا کے نام" جس میں ہر ماہ ایک مصنف اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی کہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

مہمان ___ سیمیں کرن

پیاری فوزیہ یہ کس مشکل میں ڈال دیا؟ یہ انوکھا خیال تمہیں بھلا سوجھا کیسے کہ مصنفین کے اک دن کی روداد کو جانو؟ مصنفین وہ قبیلہ پاکستانی قوم کا جن کو بالعموم عوام بھی نکھے اور کھسکے ہوئے اور بالخصوص ان کے اہل خانہ بھی ناکارہ اور "ویلے" گردانتے ہیں تو بھلا ہم مصنفین کیا کرتے ہیں، جمال کو رقم کر کے کون سا کمال کر رہے ہیں؟ اور پھر میرے جیسا نالائق مصنف جو نہ تو جمال پینٹ کرتا ہے نہ خواب بیچتا ہے بس شیشہ اٹھائے پھرتا ہے تو میں تمہیں اپنے دن کی کیا روداد بھیجوں؟ یعنی آئینہ اپنی سمت کر لوں؟ اچھا خوش رہو جیتی رہو اور لو سنو!

صبح کا آغاز نماز سے ہو کر پھر، ارے سارا گھر سو رہا ہے تو میں کیا کروں اب ابھی تو اتنی صبح Good moring msg بھی نہیں ملے آپا کسی کا، سوراوی چین ہی چین لکھتا ہے، دوبارہ

صبح کا آغاز دس گیارہ بجے ہوتا ہے، پھر نا شتے کا دور چلتا ہے میاں فیکٹری کے لئے بارہ ایک بجے تک روانہ ہوتے ہیں، پھر میں گھر اور میری کتابیں اور میری فائل و موبائل۔

جی اب میرے وقت کا آغاز ہو گیا کچھ گھریلو امور کو دیکھ کر اپنی میڈ کو ہدایات دے کر اور اپنے منے سے بیٹے سے فراغت پا کر ایک اپنی کتابوں اور فائل کے ساتھ ہوتی ہوں، موڈ لکھاری ہے تو کچھ لکھا لیا ورنہ پڑھتی رہتی ہوں کتاب ہی میرا عشق و اوڑھنا بچھونا ہے۔ کبھی تو کوئی کتاب پڑھ کر دم لیتی ہوں اور کبھی موڈ ہو تو چار پانچ کتابیں اکٹھی شروع کر دیتی ہوں جس کو دل چاہا جہاں سے دل چاہا شروع کر دیا، مختلف ادبی جرائد اور ڈائجسٹ بھی آئے رہتے ہیں، کوئی گھریلو مصروفیت نہ ہو اور کوئی فون نہ آ جائے تو

دوپہر تک یہی مصروفیت ہے، پھر لنچ ٹائم میں اور بچے، اگر کچھ نہیں پکا ہوا تو کھانے میں کچھ ہلکا پھلکا بنا لیتی ہوں اور میری میڈ روٹیاں بنا کر ٹیبل لگا دیتی ہے، نماز اور ان تمام مصروفیت سے فارغ ہو کر اب پھر میں ہوں میری کتابیں میرے رسالے اور میری تحریر، عصر پڑھ کر پھر میں شام کے کھانے کی تیاری شروع کر دیتی ہوں، عصر کی نماز کے ساتھ اس دکان کو سمیٹ دیتی ہوں ہاں کھانے کی تیاری کے دوران موبائل اور کتاب میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں، چھوٹا بیٹا اٹھ جائے تو اس کے چھوٹے چھوٹے کام، مغرب کے بعد میں قریبی پارک میں چلی جاتی ہوں، واک اور اپنی پسندیدہ غزلوں کے ساتھ، ساتھ ساتھ خود سے بہت سی باتیں، جی مجھے خود سے بہت سا بولنے کی عادت ہے۔

واپسی پہ بچوں کا ٹیوٹر سے جو گھر آیا بیٹھا ہوتا ہے کچھ رپورٹ اور ہدایات اور پھر ڈنر کی فائنل تیاری، آٹھ نو بجے کے درمیان میں اور بچے کھانا کھا لیتے ہیں میاں بھی عموماً اس وقت آ جاتے ہیں، ساتھ میں ڈرامہ دیکھتے ہیں اپنی پسند کے چینل پر، کھانا کھانے کے بعد چائے یا قہوہ میری عادت ہے موسم چاہے دسمبر ہو یا پھر جون کا۔

اب اگر کوئی کام ہے کوئی شاپنگ، بچوں کی فرمائش، ہمیں کسی کا مہمان ہونا ہے یا کسی کو ہمارا، تو یہ وقت ہے ہمارا، ورنہ اگر میں فارغ ہوں تو پھر میں ہوں کتاب سے میری فائل ہے۔

اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ کیا میرے اور کوئی مشاغل نہیں تو درست سوچ رہے ہیں، میں بہت گوشہ نشین اور الگ تھلگ اپنی دنیا میں رہنے والے لوگوں میں ہوں، سوشل ایکٹوٹیز میں سے صرف فیس بک پر ہوتی ہوں ہفتے میں اک دو دفعہ، ورنہ نہ بہت شاپنگ، بازاروں میں پھرنا، بہت دوستیاں پالنا خاندانی سیاست میں حصہ داری، ان تمام خواتینی مشاغل سے میں بہت دور ہوں۔

دیکھا کتنی نالائق ہوں، بس میری اک اپنی دنیا ہے خیالوں اور سوچوں کی جہاں میرے ساتھ کوئی نہیں رہتا، میں ہوں بس صرف اپنے لئے لکھنا پڑھنا ہی میری زندگی کا شغل جہاں میری اپنی ذات کا ابلاغ وائیات ہوتا ہے، رات بارہ ایک بجے تک میں اپنی انہی مصروفیات کے ساتھ ہوتی ہوں بیچ میں کسی کام کے لئے اٹھنا پڑ گیا، بچوں نے کسی کام کے لئے آواز دے لی، یا کچھ اور میرے پیارے دوست ہیں جو مجھے اپنے برقی پیغامات بھیجتے ہیں ان کا جواب دے دیا، اپنی اکلوتی اور بہت پیاری بہن کے ساتھ جو لاہور ہوتی ہے زیادہ تر رابطہ میسج پر ہی رہتا ہے، رات کو اپنے بیٹے کے فیڈر سے فارغ ہو کر میرا آخری کام عشاء کی نماز ہوتا ہے، عشاء کی نماز میں لیٹ اور آخری کام کے طور پر کرتی ہوں چاہے مصروفیت میں دو ہی کیوں نہ بج جائیں، جس پر میرے میاں مجھے کافی جلی کٹی سناتے ہیں مگر عشاء کی نماز مجھے سب سے آخر اور سکون سے ادا کرنا اچھا لگتا ہے اور اس کے بعد میں کچھ نہیں کرتی سو جاتی ہوں، کبھی ایسا وقت ہوتا ہے کہ رات کو تھک کر بھی لیٹو ایک دو بجے بھی تو نیند روٹھ جاتی ہے گھنٹہ دو گھنٹے منانے پر بھی نہ آئے تو میں چپکے سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھتی ہوں اور کیا کرتی ہوں بھلا؟ کوئی کتاب اٹھا لیتی ہوں، کچھ دیر بعد ہی روٹھی نیند مہربان ہو کر مان جاتی ہے لو جی یہ ہے ہماری ایک دن کی روداد، دیکھا نہ سچ ہی کہا تھا میں نے کہ ہم لوگ بھلا کرتے ہی کیا ہیں۔

☆☆☆

فوزیہ غزل

اکیتسویں قسط کا خلاصہ

اریبہ اپنی والدہ کی وفات سے ذہنی ٹوٹ پھوٹ اور رشتوں کے بدلنے کا دکھ لئے بھرپور انداز سے شوبز انٹری کے لئے تیاریاں شروع کر دیتی ہے۔

شہریار سعیہ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر موسم کی خوبصورتی اور تنہائی کے باوجود انا کا پردہ قائم ہے اور سعیہ ایک بار پھر اس کے التفات کو جھٹک دیتی ہے بلتستان سے واپسی پہ کھیوڑہ کان، کٹاس راج اور سیف الملوک کی طلسماتی دنیا کا مظاہرہ کرتی ماریا لاہور پہنچتی ہے تو سیرت نبویؐ اور قرآن سے متعلق اپنا ریسرچ ورک، مطالعہ، معلومات لینے کا انداز تیز کر دیتی ہے

صبا اپنے ساتھ ہونے والے سانحہ سے ابتر ذہنی کیفیت کا شکار ہے، اس کی فیملی کسی بھی طرح صبا کا اعتماد واپس لانے میں کوشاں اس کی شادی کا سوچتے ہیں تو مسئلہ کہ ایسی صورتحال میں کون صبا کا ساتھ دے گا۔

اب آپ آگے پڑھیے

بتیسویں قسط

سنو جاناں!
میں اپنی محبت
تمہارے پاس امانت رکھنے لگا ہوں
اور یہ بات دھیان میں رکھنا
کہ، اہل وفا کی دنیا میں
کبھی خیانت نہیں ہوتی
جہاں پہ ہو خیانت
وہاں محبت نہیں ہوتی

اور خیانت تو ہوگئی تھی ساتھ محبت بھی رخصت ہوگئی پھر یادوں کو سنبھالنے یا بجھی راکھ کریدنے کا فائدہ؟ اسے ایک کہاوت یاد آئی، جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس کیا گننا؟''

''اور آج محبت، سوچوں، خیالوں، خوابوں کے ساتھ یادیں بھی پرائی کردیں میں نے وہاج حسن کی یادیں وہ خوبصورت میسجز سے بھرے وش کارڈز، گفٹس، لو لیٹرز جن سے کتنے ارمان وابستہ تھے کتنے چاہت بھرے جملے بندھے، کتنے وعدے جڑے تھے کبھی، مگر آج اس وقت وہ کچھ نہ تھے، تو پھر سنبھالے رکھنے کا فائدہ؟ ان کی صحیح جگہ یہی تھی۔''

وہ آگ کے شعلوں پہ نگاہیں جمائے تڑ تڑ بلند ہوتے دھوئیں کو دیکھتے سوچ رہی تھی جب سب جل بجھا تو اس نے وہ ساری راکھ اٹھا کو واش بیسن میں بہادی اور شاید اس کا اپنا آپ بھی کہیں بہہ گیا تھا۔

جن کو دنیا کی نگاہوں سے چھپائے رکھا
جن کو اک عمر کلیجے سے لگائے رکھا
دین جن کو جنہیں ایمان بنائے رکھا
تو نے دنیا کی نگاہوں سے جو بچ کر لکھے
سالہا سال میرے نام برابر لکھے
کبھی دن کو تو کبھی رات کو اٹھ کر لکھے
تیرے خوشبو میں بسے خط میں جلاتا کیسے؟
پیار میں ڈوبے ہوئے خط میں جلاتا کیسے؟
تیرے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں

محبت کی یادیں، نشانیاں، ان میں بسی چاہ کی خوشبو ان میں محسوس ہونے والی اپنائیت یہ سب ماضی تھا تکلیف دہ ماضی جو کسی کے تلخ، شکی مزاج کی بدولت فضول قسم کی جذباتیت اور بیکار تعلقات میں ڈھل چکا تھا اور یادوں میں جینے کو وہ زندگی نہیں سمجھتی تھی، جب جیتے جاگتے وجود برباد ہو رہے تھے تو چند تصویروں کارڈز اور لو لیٹرز سے کیا لگاؤ، کیسی کشش؟ اسے دکھ، نارسائی، محرومی اور تذلیل کے داغ لگاتے وہاج حسن بھول گیا تھا کہ اریبہ اشفاق نامی لڑکی ایک جیتا جاگتا وجود رکھتی ہے، کوئی بے جان بت نہیں بے شک پے در پے صدمات نے اس کے نازک احساسات و جذبات کو مردہ کردیا تھا، اسے جو توجہ، پیار

ساتھ اور شاید کچھ ہمدردی جہاں سے چاہیے تھی وہ وہاں تو نہ ملی مگر جو کچھ اسے نہیں چاہیے تھا اس کے انبار اس کے اردگرد لگتے چلے گئے، گو اندر کی محرومی کے ساتھ وہ ایک جھلائی ہوئی، بدمزاج اور بدتمیز لڑکی کی شکل میں ڈھل چکی تھی، لیکن اپنے بے پناہ حسن و خوبصورتی کی بدولت ہر چیز پس پردہ کر چکی تھی، اپنے تکلیف دہ ماضی سے ناطہ توڑ کر شوبز کا حصہ بننے کو ترجیح دیتی وہ اپنی فرسٹ انٹری کے لئے جتنی سنجیدہ تھی یہ اس کا رویہ بتا رہا تھا، اپنے تمام شوٹس اور ایکٹنگز کی ریہرسل میں وہ کسی منجھی ہوئی پروفیشنل آرٹسٹ کی طرح زبردست نظر آتی اور اسے معلوم تھا کہ محض دو دن بعد اس کی قسمت بدلنے والی ہے، وہ اس ملک کے شوبز کا سب سے اونچا اور چمکتا ستارہ بننے والی ہے، وہ قوت اس سے صرف 48 گھنٹوں کے فاصلے پر تھا جب وہ ٹاپ کلاس میموریبل فوٹو گرافرز کے کیمرے کی آنکھ میں دنیا کا سب سے میموریبل اور فوٹو جینک چہرہ قرار پائی ہر چینل اسے فوکس کرتا، ہر ڈائریکٹر اسے اپنی ہسٹری آف ڈائریکشن میں حصہ دینا چاہتا، سو اس نے عام لڑکیوں کی طرح روایتی پکوانوں کے معاملات میں الجھنا چھوڑ دیا تھا اپنے لمبے سیاہ بالوں کو کٹوا کے جدید کٹنگ میں کروالیا تھا، رنگا رنگ اور سیولیس اسٹائلش ملبوسات، مغربی سج دھج کے ڈریسز قیمتی پرفیومز اس کی وارڈ روب کا حصہ بنتے گئے، اس نے ڈیفنس میں ایک عالیشان کوٹھی لے لی تھی کرائے پر، اسے معلوم تھا کہ اب ہر بڑی کمپنی اسے اپنا برانڈ ماڈل چنے گی، ہر فلمساز اسے بک کرنے کو دروازہ کھٹکھٹائے گا، ہر ٹی وی چینل اس کو اپنے شوز میں مدعو کرے گا انٹرویوز، اور بہت کچھ، اس سب کے لئے اسے اپنا ظاہر بدلنا تھا، اچھی پرسنالٹی کے ساتھ اچھا گھر بھی پلس پوائنٹ ثابت ہوتا، شوبز جوائن کرنے سے پہلے اس نے بہت سوچا تھا کہ پتا نہیں اس راستے کے دوسری طرف بھی روشنی ہے کہ نہیں مگر جب اٹل فیصلہ ہوا تو اس کی طبیعت سے شک کا مادہ خود بخود غائب ہوگیا، اب بھلے وہ روشنی پاتی یا گہری کھائی میں گرتی اس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا غلط فیصلوں کا نتیجہ اچھے فیصلوں کے برے اسباب سے کم از کم تھوڑا ٹھیک رہتا۔

''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ایک بات کہوں۔'' اس کے ساتھ آفس میں کام کرنے والی ایک لڑکی نے کہا۔

''میں مائنڈ اور نو مائنڈ کے چکر سے دور آچکی ہوں، تم کہو جو کہنا ہے۔'' اپنے خوبصورت تراشیدہ بالوں کو دائیں سے ذرا چہرے سے پیچھے کرتی وہ بولی تو بلا کی پرکشش لگی۔

''تم بہت اچھی نیچر کی خوبصورت سوچ خوبصورت دل کی مالک ہو، تمہارا فیصلہ مجھے بڑا عجیب اور برا لگا یہ فیلڈ تمہارے مطلب اور مزاج کی نہیں تمہیں اس گندگی میں قدم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''تو یہ زندگی میرے لئے شوبز کے گندگی سے بڑی گندگی بن چکی ہے اور جو گندگی میں کھڑا ہو اس کے لئے چھوٹے بڑے بے معنی ہو جاتے ہیں، میں نے اک جگہ واصف علی واصف کو پڑھا تھا وہ کہتے ہیں کہ رزق صرف یہی نہیں کہ جیب میں مال ہو بلکہ آنکھوں کی بینائی رزق ہے، دماغ میں سوچ رزق ہے، رگوں میں خون رزق ہے، یہ زندگی ایک رزق ہے سب سے بڑھ کر ایمان رزق ہے، مگر کیا تم مانو گی میں ان سب سے محروم ہوگئی اپنوں بیگانوں کو مہربانیوں کے سبب، میری سوچیں، صلاحیتیں ان کو اپنا بناتے صفر ہوگئیں اور وہ مجھ پر انحصار کرتے کرتے اپنے قوت و بازو پہ آ کھڑے ہوئے تو مجھے مفلوج کر گئے، میں نے زندگی کو جینے کے قابل بنانے کی کوشش کی وہ ہر کوشش کو شرمندگی و ذلت بنا گئے، وہ آنکھیں جو مجھے بہت چاہتی تھیں ان آنکھوں میں اپنے لئے کیسی نفرت، کتنا زہر دیکھا تھا کہ مجھے تردید تائید سب

بھول گئے، مجھے مایا نے برباد کیا دولت بہت سی دولت نے مجھے اس کے دل سے اتارا، میں دولت اس سے زیادہ دولت جمع کر کے بتاؤں گی اسے کہ مایا ہوتی کیا ہے؟''

''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ''سب کچھ'' گنوا کر تہی دامن ہو جاؤ، جانتی ہو کہ شوبز میں مایا پانے کی قیمت کیا ہے؟'' ثوبیہ نے متاسف ہو کر پوچھا۔

''میرے چاروں طرف کانچ ہے، میں جیسے جدھر سے گزروں لہو ہونا ہے تو اسی راہ سے سہی۔'' وہ ہنسی کھوکھلی ہنسی۔

''مایا جس کے لئے محبت، عزت، خونی رشتے، اعتبار، وفا سب داؤ پر لگے تو میں صبر بھول گئی، مجھ سے صبر نہیں ہوا اور میں تقدیر سے چھین کر مقدر بنانے لگی ہوں اور یہ میرا حق ہے۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو ثوبیہ متاسفانہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

نئی جگہ، بادلوں کی گھن گرج اور چمکتی آسمانی بجلی کے ساتھ کمرے میں یکدم چھا جانے والا گھپ اندھیرا، وہ تھوڑی دیر پہلے اسی موسم کی دلفریبی کو خود میں سمو رہی تھی، اس وقت ملگجے میں گم ہو جانے والی ڈری سہمی بچی کے مانند غنودہ ذہن لئے لرزتی کپکپاتی بیڈ کے پائنتی والی سائیڈ پر ٹانگوں میں سر دیئے بیٹھی تھی، شہریار نے بھی دیکھنے یا جاننے کی زحمت نہ کی تھی وہ سو گئی کہ جاگ رہی ہے، عجیب و غریب وہم، خوف اسے ستا رہے تھے کبھی ڈراؤنی فلموں کے سین یاد آتے کبھی جن بھوتوں کی کہانیاں، انہیں پرے جھٹکنے کی کوشش کرتی تو لگتا آسمانی بجلی بس اسی پل اسی کمرے پہ گرنے والی ہے، اس نے ایسا شدید خوف محسوسات میں محسوس کیا کہ دل چاہا بے اختیار شہریار کے چوڑے وجود سے لپٹ کر چھپ کر سو جائے مگر اتنی ہمت، حوصلہ اس میں ناپید تھا، کھڑکی کے دونوں پٹ ہوا کے زوردار جھونکے سے کھلے تو جیسے دھماکہ سا ہوا وہ اپنے ہوائی مخلوق کے واہمات میں گرفتار متوحش خوفزدہ سی منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ کو دبا نہ سکی۔

گہری نیند میں ڈوبا شہریار بے طرح، ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور ٹارچ تلاشنے کو اپنے ہاتھ ادھر ادھر مارے مگر ندارد، اس نے سرہانے رکھا موبائل ڈھونڈتے ہوئے اسی کا بٹن پش کیا، تو وہ اسے دیکھتی لپک کر اس کے ساتھ آ لگی۔

''مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' عجب خوف زدہ لہجہ جو آنسوؤں سے بوجھل تھا، شہریار نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے شانے پر رکھے اس کے سر کو دیکھا پھر اپنا حصار اس کے گرد باندھ دیا تھا اور وہ رونے لگی۔

بے بسی، لاچاری، خوف اور شکستگی کا اظہار کرتی برستی آنکھیں اور تمام تر انا کو توڑ کر اپنے خود ساختہ ضبط ہارتی یہ لڑکی جیسے شہریار کا ذہن بری طرح جھنجھوڑ گئی، سعیہ کی طرف دیکھتے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ اپنے دل کو اس کی طرف ایک بار پھر حد درجہ ملتفت پا رہا تھا، وہ لڑکی جس کے وجود چہرے ہنسی نے اسے اچھا زندگی کے بہت مہربان ہونے کی نوید سنائی تھی، جیسے دیکھ کر اس نے محبت کو چھونا سیکھا تھا، جس کا نازک کومل وجود اسے بے حد عزیز تھا، اپنی انا کے گنبد پر کھڑی ہر لحظہ خفا، ناراض، شدت پسند نظر آنے والی موڈ کے تابع رہنے والی شعلہ صفت لڑکی اس وقت اس سے نزدیک بے حد نزدیک دسترس میں

تھی وہ جو ہمیشہ چاہتی تھی اس کی کمزوری کسی پر عیاں نہ ہو اس وقت اپنے خوف، بے بسی کے ہاتھوں گھل رہی تھی اور ان کمزور لمحوں کو اپنی گرفت میں لینے کا خواہاں شہریار اس کی بھیگتی پلکوں کو دیکھتا اس کی اتھل پتھل سانسوں کے زیر و بم محسوس کرتا عجب سلگتی کیفیت سے گزر رہا تھا، خود سعیہ جو اپنے اس کے رشتے کو کبھی درست سمجھ نہ پائی اس کی کیفیات و تاثرات سے دانستہ گریز برتتی آئی تھی اس وقت شہریار کا وجود اس کے لئے کس قدر تحفظ اور ڈھارس کا باعث تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا، جسے کبھی اس رشتے کا مروت میں جھیلنا بھی دشوار لگتا تھا اس وقت کسی بھی قسم کی ہمت اور وضاحت سے ناپید شہریار کے سینے سے لگی بازوؤں میں سمٹی تھی، اور ایک اطمینان تھا جو اس کو حوصلہ بخشے تھا، وہ اکیلی نہیں تھی کوئی تھا اس سے محبت، کیئر اور نرمی و خلوص برتنے والا جس کے قرب نے سارا خوف بھگا دیا تھا، جس کی پناہ میں بارش سے بھیگے ٹھنڈے وجود کو گرمائش ملی جس کے ساتھ ہونے سے سارے وہمات و خدشات فریز ہو چکے تھے اور وہ اس کی خوشبو میں رچی بسی شکستہ رضا مندی لئے اس کو نیم بھیگی آنکھوں سے دیکھ کر پلکیں جھکا گئی۔

شہریار اپنے بازوؤں کے حصار میں سمٹی اس حسین خوفزدہ ہرنی کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر نائٹ بلب جلایا کیونکہ لائٹ آ چکی تھی تھوڑا سا کسمساتی وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

''اب تو ڈر نہیں لگ رہا۔'' شہریار نے آہستگی سے اس کا چہرا چھوا۔

''نہیں۔'' وہ خفیف سا بلش ہوتی بولی۔

''تو پھر سو جاؤ۔'' شہریار نے اپنے پاس ہی اس کے لئے جگہ بنائی۔

''میں اکیلی نہیں سوؤں گی، مجھے ڈر لگتا ہے، ابھی موسم اتنا خراب ہے۔'' اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں اور اسی پل بے احتیاطی میں سعیہ کا دوپٹہ شانے سے پھسلا تھا کیونکہ وہ بیڈ سے اترتے شہریار کو بے ساختگی میں بازو سے پکڑتی بولی تھی، شہریار کی نظریں اس کے گریبان سے الجھنے لگیں۔

''کھڑکی بند کر دوں ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی ہے۔'' وہ نرمی سے بازو چھڑاتا آگے بڑھا، دونوں کھلے پٹ بند کیے اور کمبل پرے کر کے تکیہ سیدھا کرتا ہوا بیٹھا، سعیہ کو دیکھا جو بے ارادہ ہی اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھے جا رہی تھی پلکیں تا حال بھیگی بھیگی تھیں، شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تکیہ اس کے پیچھے رکھا اور بولا۔

''سو جاؤ اب رات بہت ہو رہی ہے، پھر تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔''

''آپ مین لائٹ آن کر دیں پلیز مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ کچھ جھجکتی ہوئی بولی۔

''کیا میرے ہوتے ہوئے بھی تم ڈر رہی ہو؟'' شہریار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس لمحے اپنائیت سے کہے گئے اس فقرے میں جانے کیسا سحر تھا کہ سعیہ کو لگا اس کی ساری ہستی سمٹ کر اس ہاتھ لمحہ میں آ رکی تھی، پوری جان مشکور ہو گئی تھی اور دل جیسے اس ایک ہاتھ میں دھڑک رہا تھا جو شہریار کے مضبوط ہاتھ میں تھما تھا، اسے غور سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اپنے پاس کھینچا تھا بازو اس کے شانے پر دراز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک رہی تھیں، گلابی ہونٹ نیم وا کھلے لرز رہے تھے وہ ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی چھونے پر مگر چہرہ دہک رہا تھا۔

میاں بیوی ہونے کے باوجود ان میں ایسا ربط نہیں تھا نہ ایسا تعلق کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سکیں اپنے دکھ سکھ شیئر کر سکیں، اپنی فیلنگز ڈیولپ کر سکیں۔ ان کے درمیان ہر وقت منجمد رہنے والی سر

مہری نے جیسے جذبات بھی سلا دیئے تھے مگر ان تپتے لمحات میں جادو تھا کہ وہ لطیف احساسات اور نرم و گرم جذبات کو ہوا دے رہے تھے بہت کچھ کہنے سننے کی آرزو ان دونوں کے دلوں کو تپش دے رہی تھی، شہریار کی مردانہ انا اور سعیہ کی خود ساختہ اکڑ کہیں دور جا سوئی تھی، بس دلوں کے ساحلوں پر محبت لہریں مارتی عروس جاں مہکا رہی تھی، شہریار کے لب اس کی آنکھوں اور لبوں کو چھو رہے تھے اس کی دھڑکنیں سعیہ کی بے ترتیب سانسوں سے الجھ رہی تھیں، اپنے اس کے تعلق و رشتہ کو جبر، مجبوری، مصلحت کا نام دینے والی کو اس وقت کچھ یاد نہ تھا، وہ بس صندل کی طرح مہکتی مشام جاں کو معطر ہوتے دیکھ رہی تھی، یہ محبت، طلب خواہش و رضا اور قربتیں وہی تھیں جن کے شہریار نے خواب دیکھے تھے، ایک اٹوٹ بندھن جو من و تو کا فرق مٹا دیتا ہے، چہرے کی نرمی، آنکھوں کا بوجھل پن، خود سپردگی، شہریار جیسے اس کے ہر رنگ ہر احساس کو خود پہ حاوی پا رہا تھا اور سعیہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی مہربان چمک، محبت و لطف کی بے پایاں عنایتوں پہ خود کو سحر زدہ محسوس کر رہی تھی، دو دل ایک ہی تال پہ رقص کر رہے تھے محبت عنایت مہربانی مگر نہیں کچھ دیر پہلے سعیہ کا پہلو تہی کرنے والا انداز، انکار، ضدی اور ہٹیلا انداز یاد آیا تو شہریار کا دل لمحہ بھر میں بیزار ہوا، وہ اب بھی مجبور تھی، خوف ڈر موسم کی شدت نے اسے خود سپردگی پر مجبور کیا تھا اور یہ سپردگی کسی بے ساختہ بے اختیاری، محبت کے کسی دلنشین لمحہ کا حادثہ نہ تھی، بلکہ وہ اجنبیت، ڈر، تنہائی موسم کی خرابی و شدت کے خوف سے اس کے پاس آئی تھی، شہریار کے بازو پرے ہوئے محبت کی مہربان بساط سمٹی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا، سعیہ جو اپنی ناہموار سانسوں میں الجھی تحیر زدہ سی خود پہ ستارے برستے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں پہلے حیرت پھر بے یقینی اور بعد میں دکھ کے شدید ترین احساس میں ڈوبی اس کے سرد مہر تیکھے مغرور نقوش کو دیکھتی رہ گئیں جواب اضطراری انداز میں سگریٹ سلگاتا کھڑکی کے پٹ کھولے کھڑا تھا، وہ سعیہ کی طرف متوجہ نہ تھا، مگر سعیہ کسی لٹے، تھکے ہارے مسافر کی مانند ساکت اس یکدم رنگ بدلتے اکھڑ مزاج اور انا پسند شخص کو دیکھے گئی اور آنسو پلکوں سے جھڑتے رہے۔

☆☆☆

فاطمہ نے اس کا سوال سن کر کچھ دیر اس کی طرف دیکھا تھا پھر بولی۔

"میں نے تم سے ایک دن کہا تھا کہ لاہور جا کے میں تمہیں ایسے لوگوں سے ملواؤں گی جو تمہارے ہر ذہنی ابہام کو دور کر کے روحانی حوالہ سے مذہبی خلجان کے حوالہ سے تمہاری تسلی کر سکتے ہیں اور آج میں تمہیں وہیں لے کر آؤں گی تمہارے سوال کا تسلی بخش جواب وہیں ملے گا۔"

"فاطمہ تم کہتی ہو تو میں ضرور چلتی ہوں مجھے ہر اس چیز سے انسیت ہوتی ہے جو کسی بھی طرح حق و صداقت کی تلاش میں میرے لئے معاون ثابت ہوا اور تمہارا رویہ تو خصوصی بہت اپنائیت و مہمان نوازی کا سجاؤ لئے ہے۔"

"کیونکہ آدم و حوا کی اولاد ہونے کے ناطے ہم آپس میں بہنیں بھی ہیں اور ہر انسان سے بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و فرقہ مساوات و نرمی کا سلوک برتنا ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔"

فاطمہ اسے یہاں لے کے آئی یہ ایک مسجد کا اوپری حصہ تھا، نچلے حصہ میں مردوں کے لئے اور اوپری حصہ میں خواتین کے لئے لیکچر ہو رہا تھا، وہاں تقریباً ستر اسی کے قریب خواتین موجود تھیں جن میں زیادہ تعداد نوعمر اور جوان لڑکیوں کی تھی، یہاں موجود مسلم عورتیں رنگین لباس کے ساتھ اسکارف اور حجاب

لگائے تھیں، کچھ برقعہ میں ملبوس تھیں، تو اکثر نے بڑے بڑے دوپٹے سلیقے سے خوب پھیلا کر اوڑھ رکھے تھے، ان سب نے فاطمہ اور ماریا کے سلام کرنے پر غیر معمولی تپاک اور محبت سے استقبال کیا، وہ پہلی دفعہ عام مسلم خواتین کیمونٹی سے متعارف ہو رہی تھی جن میں گھریلو خواتین، سکول اور کالج گرلز کے ساتھ ورکنگ وومن بھی تھیں، وہ عورتیں جو اسلام اور دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہی تھیں جن سے ملتے یا بات کرتے کسی مظلومیت، محرومی، بے بسی یا مذہبی جنونیت کا تاثر تک نہ ملتا تھا اور یہ سب محسوس کر کے ماریا کو بہت سکون و مسرت کا احساس ہوا، جبکہ اس کے برعکس اتوار کو چرچ میں عیسائی خواتین کے مجمع میں وہ اپنے آپ کو اجنبی اور بیگانہ محسوس کرتی تھی۔

ماریا نے ایک طائرانہ نگاہ اس ہال نما کمرے پر ڈالی جس کے در و دیوار کسی بت، وہ تصویر، یا بت سے خالی تھی بلکہ بے حد خوبصورت عربی رسم الخط میں کچھ آیات معہ ترجمہ دیوار گیر الماری میں قرینے سے لگی کچھ اسلامی کتب و قرآنی صحائف، تقریباً پندرہ منٹ بعد بے حد سوبر اور گریس فل عورت بمعہ حجاب پروقار انداز میں چلتی اندر داخل ہوئی سب کو مشترکہ سلام کیا اور کارپٹ پر دھرے فلور کشن پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"مقام رضا جسے عرف عام میں صبر و شکر کا نام دیا جاتا ہے، اللہ کے قرب اور دوستی کی جانب اہم سنگ میل ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا ہے کیا راضی بہ رضا ہونے یا صبر و شکر سے مراد کیا ہے؟"

حضرت عیسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ۔

"اے اللہ پاک! مجھے وہ عمل بتا کہ اس کے کرنے سے تو مجھ سے راضی ہو جائے۔"

ارشاد ہوا "اے موسیٰ! تم اسے کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تب اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے عمران کے بیٹے! میری خوشی اسی میں ہے کہ تو میرے حکم پر خوش رہے، فرمایا اگر کوئی یہ چاہے کہ مجھے تسلیم و رضا کا مقام مل جائے تو وہ اللہ کی رضا کو خوشی سے قبول کر لے۔"

"مطلب؟ اللہ کے رنگ میں رنگ جانا، ذاتی پسند ناپسند کو ترک کر کے اللہ کی پسند، ناپسند میں ڈھل جانا، زندگی سے اپنی خواہش، اپنا وزن، اپنا ٹیسٹ، اپنی اپنائیت اپنا ارادہ، سب کچھ نکال دینا اور اللہ کی خواہش، اپنائیت اور ارادہ کو اپنا لینا، تقدیر اور قسمت سے کوئی گلہ شکوہ نہ رکھنا، اللہ کے فیصلوں کو بغیر ہچکچاہٹ کے دل سے قبول کرنا، خود کو اپنے تمام معاملات کو مکمل یقین اور ایمان کے ساتھ اس طرح اللہ کے حوالے کرنا کہ پھر بے فکر اور بے غم ہو جانا، رضا کے دو مقام ہیں، (۱) انسان رب پر راضی ہو جائے، (۲) انسان رب سے راضی ہو جائے، ایک مقام ریاضت، مجادہ اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے یہ مقام حال ہے، دوسرا مقام "عطا" ہے یعنی جو بھی رب کی طرف سے عطا ہوا ہے خوشی سے قبول کرنا۔"

فاطمہ ساتھ ساتھ ماریا کو لیپ ٹاپ پہ انگلش میں یہ لیکچر پڑھاتی جا رہی تھی اور ماریا کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ انوکھا، نیا اچھا سیکھنے اور کرنے جا رہی ہے اور اس کے سامنے بیٹھی معزز خاتون اب کہہ رہی تھی۔

"مقام رضا کو مزید سمجھنے کے لئے ہم انبیاء کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں۔"

"حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں رو رو کر نابینا ہو جاتے ہیں لیکن اپنا

دکھ، اپنا کرب صرف اللہ سے کہتے ہیں۔"

"پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ پر ایسی کڑی آزمائش آئی کہ مال و اسباب کھیت کھلیان سب تباہ ہو گئے، اولاد مر گئی، آپ کے جسم میں کیڑے پڑ گئے، لیکن آپ نے پھر بھی اللہ سے شکوہ یا گلہ نہیں کیا، یہ مقام رضا نہیں تو کیا ہے؟ اور حضرت ابراہیمؑ جب اپنے خواب کا تذکرہ کرتے فرماتے ہیں کہ بیٹا! میں خواب دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں، حضرت اسماعیلؑ فرماتے ہیں، اے ابا جان! آپ کو جس کام کا حکم ہوا ہے کر گزریئے انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے، کیا حضرت اسماعیلؑ کا اللہ کی مرضی اور فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دینا راضی بہ رضا ہونا نہیں ہے کیا؟" ماریا مبہوت سی ہو رہی تھی یہ بیان سنتے پڑھتے ہوئے "آقائے دو جہاں، وجہ تخلیق کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ ملاحظہ فرمائیے کہ بچپن میں ہی یتیم و یسیر ہو گئے، نبوت کا اعلان کیا تو کبھی شعب ابی طالب میں محصوری کی صورت تو کبھی طائف میں بدبخت شریروں کی پتھر زنی کی صورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دی گئی، یہاں تک کہ اپنا آبائی شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا، کفار نے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ضبط اور صبر کو کس کس طرح نہیں آزمایا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر بھی ان کے لئے کرم ہی کرم اور عطا ہی عطا رہے، کبھی بددعا نہ فرمائی، کبھی حالات کی سختیوں سے آزردہ ہو کر تسلیم و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبر و رضا کے اعلیٰ اور بلند ترین درجہ پر فائز تھے۔" تفصیلی بیان، دلائل مثالیں اور دلنشین انداز میں بولتی وہ خاتون جن کا نام فاطمہ نے اُم خدیجہ بتایا تھا سب کو مبہوت و سحر زدہ کیے تھی، فاطمہ نے ایک تراشے پر ماریا کا سوال لکھ کر ان کی طرف بڑھایا اور بھی کئی لوگ تھے جو سوالات پوچھ رہے تھے لیکچر کے اختتام پر سب کو جواب ملنے تھے لوگوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ پرخلوص سی مسکراہٹ لئے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کسی شخص نے ایک درویش سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے پتہ چل جائے کہ اللہ مجھ سے کتنا راضی ہے؟"

درویش نے کہا۔

"اپنا اندر ٹٹول لے جتنا تو اللہ سے راضی ہے، اتنا ہی اللہ تم سے راضی ہے۔"

"یاد رکھیے ماریا، حادثہ، رنج، محرومی کا مقصد ہماری زندگی کی سمت درست کرنا ہوتا ہے، خود غرضی سے نکل کر دنیا سے دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی کا درس، بیمار ہونے سے دوسروں کی تڑپ، لاچاری اور بے چینی کا بہتر اندازہ لگانا بلکہ صحت و سلامتی کی قدر و قیمت بھی جاننا، آپ کا دل ٹوٹتا ہے تو آپ دوسروں کا دل توڑنے سے اجتناب کرتے ہیں، آپ نے زندگی میں کبھی بھوک کاٹی ہو تو آپ کسی مفلس کی لاچاری اور فاقہ زدگی کو محسوس کر سکتے ہیں، اسی طرح جب آپ کو کوئی چھوڑ دے تو مسائل کے انبار ٹوٹے خوابوں کے ساتھ جینا سیکھتے ہیں، اس وقت کو جو مصائب بھرا ہے گزر جانا ہے رو کر گزاریں یا ہنس کر، صبر و شکر سے یا گلہ شکوہ کر کے۔" وہ شستہ انگریزی میں مدلل انداز میں بول رہی تھیں۔

"یاد کیجیے کہ گزشتہ زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آئے تھے جب آپ نے اللہ سے کچھ مانگا تھا لیکن آپ کو، آپ کی توقع کے برعکس ملا، تب آپ اللہ سے کچھ ناراض اور زندگی، رشتوں، تقدیر سے قدرے مایوس رہنے لگیں لیکن آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ آپ کی خواہش کا پورا نہ ہونا ہی بہتر تھا کیونکہ اللہ

نے آپ کو کسی بڑے نقصان سے بچایا ہے، اللہ نے آپ کو کچھ دوا اور دعا کے باوجود حالات کی سختی، تلخی بڑھا کے دی تو اللہ اس آزمائش کے ذریعہ آپ کا درجہ بلند کرنا چاہتا ہے اور ماضی کے وہ مواقع وہ مراحل جب مصیبت تلاش حق میں طعن و تشنیع، بیماری، پریشانی، ناکامی سہتے آپ نے اللہ کو پکارا اور جواب نہ پایا تو خود سے پوچھیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی کوشش کی سمت درست نہ تھی، اللہ پر یقین، اعتماد اور بھروسہ میں کمی ہو، آپ نے مانگا ہو مگر متزلزل یقین کے ساتھ کہ پتا نہیں اللہ قبول کرے گا بھی کہ نہیں ایسے حالات میں کوشش اور یقین کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کیجیے اور کڑے وقت رشتوں کے چھوٹنے کا غم شکوہ ہے تو یہ بھی یاد کیجیے کہ اللہ نے آپ کی تنہائی، بے بسی، دکھ بانٹنے کو آپ کا خیال، تسلی دینے کو کتنے لوگوں کو آپ کے قریب کیا اور اس انتظار و مصائب کا گلہ ہے جو سہے تو اللہ کچھ انتظار کے بعد آپ کو بہترین سے نوازنے والا ہے، ان مصائب، حادثات اور آزمائش کی صورت میں اللہ آپ کو کچھ سکھانا اور سمجھانا مقصود تھا اور انہی واقعات کے نتیجہ میں اللہ کا قرب ملنا تھا، اور بے شک وہ غم جو اللہ کے قریب کر دے اس خوشی سے بہتر ہے جو اللہ سے دور کر دے۔" ماریا پلکیں جھپکائے بغیر ساکت اپنے سامنے موجود معزز خاتون کا نورانی چہرہ دیکھ رہی تھی اور الفاظ سیدھے دل پر اثر کر رہے تھے۔

"اہل تسلیم و رضا ن تقدیر پر راضی رہتے ہیں وہ مصلحت شناس ہوتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 216 میں موجود اللہ کے اس حکم کو پا لیا کہ "ہو سکتا ہے جو تمہارے لئے ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو، ایک چیز تمہیں پسند ہو وہی تمہارے لئے بری ہو، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے" تم اب تک غیروں سے امید رکھتی رہیں سو صداقت کے راستے منقطع رہے اب تم اللہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ مضبوط عقیدے، یقین کی گہرائی کے ساتھ کامیابی پاؤ گی کیونکہ فرمان الٰہی ہے کہ۔"

"جو لوگ ہمارے راستے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، ہم ان کو اپنی راہوں کی راہنمائی کر دیا کرتے ہیں۔" (العنکبوت۔69)

ماریا کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے آنسو بہہ رہے تھے قرآن کی مذکورہ بالا آیات کے حسن و سچائی نے اسے ذہنی و قلبی طور پر ایک عجیب کیفیت سے دوچار کیا تھا وہ مسلسل رو رہی تھی اپنی روحانی کیفیات میں ڈوبی۔

☆☆☆

"امی مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔" شب بھر کی بیداری، بے طرح سوچنے اور کشمکش سے نکلنے کے بعد وہ اپنی ماں کے گھٹنے تھامتا ہوا بولا تو انہوں نے بغور بیٹے کو دیکھا۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں صبا سے، آپ کو میرا رشتہ لے کر وہاں جانا ہے۔" راشدہ بیٹے کو حیران اور کچھ ناراض نگاہوں سے دیکھ کر بولیں۔

"صبا ایک اپاہج لڑکی ہے، بیمار رہے گی عرصہ تک، تم ماشاء اللہ اچھے تندرست خوبصورت پڑھے لکھے اور اچھی پوسٹ پر ہو کون سی کمی ہے تمہیں لڑکیوں کی۔"

"امی جو کچھ آپ نے کہا بجا مگر صبا کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کا ذمہ دار میں ہوں، وہ اگر اپاہج ہوئی ہے تو میری وجہ سے، اس کی خوشیوں کا قاتل آپ کا بیٹا ہے، مجھے اس غلطی کا مداوا کر لینے دیں۔" وہاج نے ساری بات بتاتے ہوئے کہا تو ماں کے ساتھ بہنیں بھی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"میں تب بھی تمہارے لئے مناسب نہیں سمجھتی، تم جذبات میں آکر سوچ رہے ہو اور جلدی بازی میں فیصلہ کر رہے ہو جس کا بعد میں تمہیں ملال ہوگا، صبا کے ساتھ جو ہوا تمہاری غلطی نہیں وہ ایک حادثہ تھا، محض ایک ایکسیڈنٹ، جو کسی کے بھی ہاتھوں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی تقدیر میں تھا۔" اب وہ بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔

"تو سمجھ لیں اس سے شادی بھی تقدیر کا فیصلہ ہے جس میں کوئی جذباتی پہلو نہیں، آپ جانتی ہیں میں جذبات کے ہاتھوں فیصلے نہیں کرتا ورنہ صبا کی بجائے اریبہ کی بات کرتا۔" وہ مضبوط انداز میں بولا تو جان چھڑانے کو راشدہ نے کہا۔

"تم پھر سوچ لو بیٹا، ایسے فیصلے لمحوں میں نہیں ہوتے نہ یہ گڑے گڑیا کا کھیل ہے، پوری زندگی کا معاملہ ہے اور فرض کرو وہ ٹھیک نہ ہوئی تو......"

"ڈاکٹرز کے مطابق وہ ٹھیک ہو جائے گی اور نہ بھی ہوئی تو میرے لئے وہ ویسی ہے جیسی پہلے تھی اور آپ کو ہر صورت یہ پرپوزل لے کر جانا ہے مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔" وہاج کا لہجہ ٹھوس اور انداز بہت اٹل تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا انہیں صرف آگاہ کر رہا تھا، یہ بات اتنی آسانی سے ہضم ہونے والی نہیں تھی، غصہ، افسوس اور حیرت سے راشدہ بیگم کا دل جل رہا تھا موڈ خراب ہو چکا تھا، یہ ٹھیک تھا کہ حیدر صاحب کی بدولت ہی ان کا بیٹا قدم جما پایا تھا، ان کی کمپنی میں بڑا عہدہ بھاری تنخواہ ترقی دن بہ دن بدلتی حیثیت جس نے ان کی نظریں آسمان پر ٹکا دی تھیں، یہ ٹھیک تھا کہ صبا ان کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی تھی، شکل و صورت میں یکتا اگر وہ اسے بیاہ لاتیں تو لاکھوں کا جہیز ملتا مگر ساتھ معذوری بھی جو عمر بھر کی بھی ہو سکتی تھی۔

"امی اگر بھائی چاہتے ہیں صبا کا ساتھ تو برائی کیا ہے؟" ہما بولی۔

"چپ رہو تم میں نے مشورہ نہیں مانگا بہو خدمت کروانے کے لئے لائی جاتی ہے اور تمہارا بھائی خدمت کرنے کے لئے لا رہا ہے۔" وہ بھڑک کر بولیں۔

"امی حیدر صاحب جدی پشتی رئیس ہیں ایک ہی بیٹی ہے اتنا جہیز دیں گے کہ گھر بھر جائے گا اور یقیناً سلامی میں عالیشان بنگلہ، کار ہم سب کو گولڈ بھی مل سکتا ہے پھر بیٹی کے لئے وہ ملازمین بھی دے سکتے ہیں، اگر معذور یا بیمار ہے تو ہمارا فائدہ ہے، ہم جیسے چاہیں اس کی چیزیں برتیں استعمال کریں کون سا اٹھ کر منع کر سکے گی، مفت میں عیش ہونگے پھر وہاج بھائی اکلوتے بیٹے ہیں، اس گھر کے اچھا ہے بیوی کے کنٹرول میں نہیں، ہمارے بس میں رہیں گے الٹا حیدر صاحب کی فیملی اور خود صبا ہمارے احسان مند بھی سر اٹھا کر بات نہیں کر سکیں گے آپ کے سامنے، میرا تو خیال ہے صبا کی خیریت پوچھنے کے بہانے آج چلتے ہیں تو آپ رشتہ بھی ڈال دیجئے گا۔"

ان کی چھوٹی بیٹی جو مفاد پرستی، لالچ میں انہی پر گئی تھی بولی تو وہ اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھیں، واقعی یہ سب تو انہوں نے سوچا نہ تھا، دولت بے تحاشا دولت کی چمک قیمتی فرنیچر امپورٹڈ جہیز اور زیادہ حیثیت مرتبہ ہو سکتا ہے، وہاج کو وہ باقاعدہ کاروبار میں بطور داماد حصہ دار بنا لیں، یہ سب سوچ کر وہ ایکدم سے کھل اٹھیں اور باقاعدہ صبا کے گھر جانے کے منصوبے بنانے لگیں اور وہاج ان سے بات کر کے سیدھا عفنان علی خان کے آفس گیا، شہریار کے آنے واپسی کا پتا کرنے کیونکہ اس سے رابطہ نہ ہو پا رہا تھا

اور وہ اپنا یہ فیصلہ سب سے پہلے اس سے شیئر کر کے سعیہ کے ذریعے صبا کے گھر میں اس پرپوزل کی راہ ہموار کرنے کے ساتھ ان کے ویوز بھی جاننا چاہتا تھا، مگر شہریار سے رابطہ نہ ہونے کے باعث وہ یہ بات واپسی پہ ڈال کے حیدر صاحب کے گھر پہنچا اتفاق سے وہاں اسی موضوع پہ گفتگو ہو رہی تھی اور بے ساختہ ہی اظہار مدعا براہ راست کر دیا اس نے۔

اس کی بات پر کچھ دیر کے لئے لاؤنج میں موجود تمام نفوس ساکت، تحیر زدہ اور سن سے رہ گئے اور بے یقینی سے بالکل خاموش تھے، وہ موجودہ صورتحال سے ہرٹ تھے، انہیں معلوم تھا کہ سال دو سال کچھ عرصہ لگتا تھوڑا لمبا اور تکلیف دہ پراسس سہنا پڑتا صبا کو مگر بالآخر وہ ٹھیک، تندرست ہو کر پھر سے زندگی کو بھرپور انداز میں جینے کے قابل ہو جاتی، پھر یقیناً اس کے لئے بہترین رشتوں کی کمی نہ ہوتی، مگر اس کیفیت میں وہاج حسن جیسا ہینڈسم، کوالیفائیڈ اچھے عہدے پر فائز شخص خود صبا کے ساتھ کا خواہاں اور اس سے شادی کا متمنی ہو، یہ بات واقعی عجیب تھی۔

"وہاج تم بیٹا آؤ کیسے ہو؟" نزہت نے خود کو حیرت سے نکالتے ہوئے اسے آگے آنے کا کہا تو باقی سب بھی اپنے رکے سانس بحال کرنے لگے، عدیل اور راحیل کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ گئے ماریا بھی ان کے ہمراہ جا چکی تھی، نزہت بیگم اب کلی توجہ کے ساتھ وہاج حسن کی طرف متوجہ ہوئیں تو وہاج نے بڑے مہذب انداز اور شائستہ الفاظ میں کہا تھا۔

"آنٹی میں صبا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم، اتنا کچھ ہو جانے کے بعد، صبا سے شادی کرو گے، جانتے ہوئے کہ ابھی وہ کافی عرصہ اس صورتحال میں رہے گی نہ تو بیمار نہ تندرست، ذہنی طور پر ڈپریس اور جسمانی طور پر معذور۔" بات کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی وہ کچھ دیر تک بول نہ سکیں تو وہاج نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

"آنٹی آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ابھی تم جذباتی ہو کر کہہ رہے ہو مگر زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزرتی نہ ہمدردی تمام عمر کوئی نبھا سکتا ہے کل کو تمہیں اپنی یہ خواہش احمقانہ لگے گی اور تم، تمہارے گھر والے صبا کو وہ مقام نہیں دے سکیں گے جو ایک بہو کا حق ہوتا ہے اور میری بیٹی جو تم لوگوں کے سامنے سر اٹھائے کھڑی ہوئی تھی سر جھکائے رویا کرے گی۔" ان کے لہجے میں اضطراب اور بے چینی در آئی تھی۔

"آنٹی پلیز میرے خلوص کو ہمدردی کا نام دے کر شرمندہ نہ کریں اور میں نے جذباتی ہو کر نہیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اور یقین کریں میرا یہ فیصلہ کبھی آپ کو پریشان یا صبا کو شرمندہ نہ ہونے دے گا، یہ میرا وعدہ ہے وہاج احسن کا وعدہ، وہاج حسن کا وعدہ اور مرد جان سے پھر سکتا ہے وعدے سے نہیں (افسوس کہ اس مرد نے یہ وعدہ کسی وقت اریبہ سے بھی کیا تھا اور اس سے پھر بھی چکا تھا) رہی میری فیملی کی بات تو آپ وہ ٹینشن کبھی نہ لیں میں امی سے، بہنوں سے بات کر چکا ہوں سب کا جواب Positive ہے اور ہو سکتا ہے وہ ایک دو دن تک آپ کے پاس آئیں بات کرنے۔"

"نہیں بیٹا یہ فیصلے یوں لمحوں میں نہیں ہوتے، یہ شادی ہے عمر بھر کا معاملہ، یوں اچانک بلا سوچے سمجھے میں صبا کی شادی نہیں کرنا چاہتی اور تب تک تو بالکل بھی نہیں جب تک وہ اس فیز سے باہر نہیں آ جاتی اور یہ عرصہ کتنا ہو سکتا ہے ڈاکٹر ہونے کے باوجود میں کچھ بھی قبل از وقت یقین سے نہیں کہہ سکتی،

میں اپنی بیٹی کے لئے پریشان سہی تمہارے لئے بھی مخلص ہوں اور ہرگز نہیں چاہوں گی کل کو تم کسی زیاں یا پچھتاوے کے احساس میں گھرو تو تمہارا یہ فیصلہ میری بیٹی کے لئے عمر بھر کا روگ بن جائے، تم اپنے گھر والوں کو منع کر دو۔" نزہت نفی میں سر ہلاتی سنجیدگی سے بولیں تو وہاج چپ سا ہو گیا۔

☆☆☆

اپنے وجود کا ملتا نہیں کوئی سراغ
یوں غم اٹھائے پھرتی ہوں سارے جہان کے
قسطوں میں مر رہی ہوں نیا تجربہ نہیں
میں سود ہی چکائے گئی جسم و جان کے

اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی ہو چکا تھا اور سب سے پہلی بے ارادہ اٹھنے والی نظر سامنے صوفہ پر بیٹھے شہریار پر گئی بہت اچھی ڈریسنگ میں، سلیقے سے بال سنوارے، قیمتی پرفیوم لگائے، ہشاش بشاش اور مطمئن کسی سے موبائل پر مصروف گفتگو تھا، اس کی سماعتوں میں صبا کی آواز گونجی۔

"سعیہ شہری بھائی بہت اچھے ہیں بس ذرا دل کو سمجھا لو تو سب اچھا، خوبصورت لگے، زندگی آسان ہو جائے گی محبت کے سہارے جیتے اور یوں جیتے ہوئے تمہیں ان کے بنا ایک لمحہ گزارنا بھی دشوار لگے گا۔"

اور خود پہ تہہ در تہہ لاپروائی، بے حسی و بے نیازی کے خول چڑھاتے اتنے خوبصورت بندے کے ہمراہ رہتے اب تک تو اس نے روایتی میاں بیوی کے امیج کو قائم رکھنے کی بس کچھ کوشش کی تھی وہ بھی مارے باندھے، مگر تنہائی میں طمانیت کے سارے نقاب اتر جاتے پھر شہریار کی قربت چاہے چند گھڑیوں کے لئے تھی اس کے وجود کی بے چینی تو حد سے سوا کر دی تھی وہ پوری رات خود کو عجب تپش میں جھلستا محسوس کرتی رہی، وقتی کشش کے ہاتھ سہی مگر شہریار کی وہ محبت و شوق سے بھری جسارتیں اور استحقاق کا بھرپور انداز جو لمحوں میں سعیہ کو اسیر اور زیر کر گیا تھا، وہ بھول گئی تھی کہ اس شخص سے گریز، انا یا بے اعتنائی برتنا ہے، بس جذبوں کے ان دیکھے سمندر میں بہلنے لگی تھی۔

اور اس سب کے بعد وہ خود لاتعلق ہو سکتی تھی کیا اپنے درمیان رشتے کے شرعی و فطری تقاضوں سے؟ یا شہریار کی اجنبیت برداشت کر سکتی تھی؟ نہیں ہرگز نہیں سعیہ کا دل پوری شدت سے چلایا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں شہریار کہ مجھے ارزاں کر کے تم کتنے دن خوشی سے جی سکتے ہو اور اب یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا، اگر تم اپنا استحقاق اپنی مرضی سے جتا کر مجھ پہ ملکیت کا احساس جما سکتے ہو تو تمہیں مجھ سے وابستہ رشتے کے حوالہ سے مجھے عزت، مقام اور محبت دینا ہوگی۔" وہ اٹل انداز میں سوچتی اٹھی۔

اور ناشتے سے فراغت کے بعد جو خبر شہریار نے اسے سنائی تھی، سعیہ کو یکدم ساکت کر گئی، کتنی دیر تک وہ کچھ بول نہ سکی تو شہریار نے اس کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا تھا۔

"تم یقین رکھو سعیہ، اب صبا بالکل ٹھیک ہے آئی سی یو سے نہ صرف باہر آ چکی ہے بلکہ گھر شفٹ ہو گئی ہے اور پہلے سے بہت بہتر ہے۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتانے کی زحمت نہیں کی، میری بہن جیسی دوست موت کے دروازے سے واپس پلٹی اور میں بے خبر رہی۔" اس کی آنکھوں سے تیز رفتاری سے آنسو بہنے لگے تھے

مارے دکھ کی شدت سے وہ بول نہ پا رہی تھی۔

"ہم سے کسی کا بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا ڈیئر تم خود کو سنبھالو ہم ابھی شوٹنگ پیک اپ کر کے چلتے ہیں، اس کڑے وقت میں صبا اور اس کی فیملی کو ہماری ضرورت ہے۔" شہریار نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے نرمی سے کہا تو وہ بے اختیار ہی اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رو دی، شہریار نے ایک طویل آہ کھینچتے ہوئے، اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا اور دلاسہ دینے لگا، کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ پاکستان روانگی کے سفر میں تھے اور صبا کی حالت، کیفیت کے بارے میں سوچتی سعیہ کے دل کی بے چینی، اضطراب حد سے سوا ہو رہا تھا، وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنی ہمدرد، خیر خواہ اور عزیز از جان دوست کے لئے زندگی، تندرستی اور خوشی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور شہریار اسے بار بار دیکھتا رہا جو یقیناً اس وقت بہت دلگرفتہ تھی، سوگوار تھی اور اس کے سوگوار ہونے سے شہریار کو زندگی بوجھل محسوس ہو رہی تھی، اسی بوجھل پن میں وہ سعیہ کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتا اسے دلاسہ دینے کو سعیہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی اور بھیگے رخسار صاف کرنے لگتی، یہ ٹھیک تھا کہ ان کے رشتے میں کوئی لگاوٹ، جذباتی پن شروع سے نہ تھا کچھ دونوں کی انا اور ضد تناؤ کی کیفیت پیدا کرتی رہی اور سعیہ کو کچھ دنوں پہلے تک خود سے وابستہ اس تعلق کو لے کر کبھی لگا ہی نہیں تھا کہ اس شخص سے کوئی واسطہ بھی ہے مگر اب وہ بے خبری اور انجانے پن سے نکل آئی تھی، اب خدشات ختم ہو چکے تھے لیکن سدباب باقی تھا۔

"اور اگر یہ شخص مجھے چھو کر پتھر سے پانی نہ کرتا، تو شاید میں ساری عمر بہت شرعی و فطری تقاضوں سے نگاہیں چرائے بے خبر انا میں قید رہتی۔" سعیہ نے ایک نگاہ قصداً اس شخص پہ ڈالی تھی جو اس کے ساتھ قدم بڑھاتا اب صبا کے گھر کا گیٹ پار کر رہا تھا اور وہ آنکھیں رگڑتی اندر داخل ہونے لگی۔

صبا سے سامنا ایک ہنستی کھیلتی، جیتی جاگتی، پرخلوص اور ہمدرد لڑکی کو لاچار اور بے بس بستر پر پڑے دیکھنا کتنا مشکل تھا اس کے لئے مگر کرنا تھا اور صبا کو دیکھتے ہی ٹپ ٹپ کتنے آنسو آنکھوں سے باہر تھے، چہرہ بھیگتا چلا گیا صبا نے اسے دیکھا تھا اور چہرے کا رخ پھیر لیا تھا، سعیہ کے لئے اس کا یہ خائف انداز جھیلنا دشوار تھا بہت متضاد کیفیات تھیں صبا کے چہرے پر، سعیہ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو اپنی طرف کیا تو جانے کس احساس کے تحت صبا اس کے ہاتھوں میں چہرہ دیے روتی چلی گئی۔

"اونہوں صبا بری بات کمزور پڑنا اچھی بات نہیں جبکہ تم دوسروں کو بہادری کا درس دیتی ہو پھر جانتی ہو کر روتے بسورتے چہرے تمہارے بھائی کو اچھے نہیں لگتے۔" شہریار نے قصداً سعیہ کو دیکھتے ہوئے آخری الفاظ کہے تو صبا کو یکدم ہنسی آئی۔

"ہوں گڈ گرل، اب ہوئی نا بات اور اٹھو بھئی، تم کیا بیمار بنی بیٹھی ہو بجائے اس کے کہ بھائی اتنے دنوں بعد آیا ہے اس کی خاطر مدارات کرو، تم بہانے بنا کر بیڈ کو پیاری ہو رہی ہو۔" بوجھل بوجھل سے ماحول میں شہریار کا دوستانہ اور فرینکلی انداز فضا کو درست کرنے کے ساتھ صبا کو بھی قدرے ہلکا پھلکا کر گیا اور وہ مسکرا دی۔

"لڑکیوں کو گھرداری میں طاق ہونا چاہیے بھئی یہی خانگی و ذہنی چنگی اور ترقی کی بنیاد ہے۔" وہ ایک بار پھر دانستہ سعیہ کو سنا رہا تھا اور صبا اس کی شرارت سمجھ رہی تھی سو مسکراتی رہی۔

"آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہماری آپی ہر معاملے میں طاق ہیں۔" راحیل نے سعیہ کا دفاع

کیا پھر بولا۔
"ویسے بھی بیوی، بیوی ہوتی ہے کوئی دھوبن، باورچن، مالن یا نرس نہیں۔"
"بالکل ٹھیک مگر اچھی بیوی وہی ہوتی ہے جو گھریلو امور میں طاق ہو۔" شہریار بدستور اپنی بات پر مصر رہا، جبکہ سعدیہ خاموش بیٹھی سب کو ہنستے بولتے دیکھ رہی تھی۔
"اور میرا خیال ہے آپ یہ ڈسکشن بعد میں کر سکتے ہیں پہلے کھانا کھا لیں۔" نزہت نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔
"آنٹی ایسا کریں آپ کھانا ڈائننگ ٹیبل پر نہ لگائیں، آج صبا کے کمرے میں دستر خوان لگائیں ہم سب یہیں بیٹھ کر کھائیں گے اور صبا ہمارا ساتھ دے گی۔" سعدیہ نے کہا تو سب نے تائید میں سر ہلائے۔
"مگر میں تو اب ڈائننگ ٹیبل لگوا چکی ہوں۔" نزہت بولیں۔
"نو ٹینشن آپ بیٹھیں میں خود ملازمہ کے ساتھ مل کر دستر خوان لگوا دیتی ہوں۔" سعدیہ اٹھنے لگی۔
"نہیں بیٹا تم بیٹھو اتنے لمبے سفر سے تھکی آئی ہو، میں خود کر لیتی ہوں۔" نزہت شفیق انداز میں کہتی اسے روک کر باہر نکلیں اور عین اس وقت جب سب کھانا کھانے کے وقت بیٹھے عفنان علی خان اور شائستہ بیگم آ پہنچے انہیں نزہت بیگم نے مدعو کر رکھا تھا، خوشگوار سے ماحول میں ہلکی پھلکی نوک جھونک کے ساتھ سب نے اچھا وقت گزارا اور صبا کو بھی کتنے دنوں بعد اس گھر کے در و دیوار نے ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔
"درست کہا تھا ماریا نے کہ بعض اوقات اردگرد کا ماحول بدلنے سے بھی اندر کا منظر بدل جاتا ہے اور شہریار کی ذرا سی کوشش سے صبا کچھ دیر کے لئے سہی، مگر اپنی بیماری بھلا چکی تھی، ہر وقت ذہن و دل میں پنپنے والا احساس بیچارگی اور بے بسی جیسے پس پشت جا چکی تھی، تو کیا واقعی اسے تبدیلی کی ضرورت ہے اور کیا یہ تبدیلی صرف گفتگو تک ہونی چاہیے یا شادی کی صورت میں، کیا صبا کو یہ تبدیلی شادی بھی دے سکتی ہے؟" نزہت کا ذہن اب ایک نکتے پہ اٹک چکا تھا، وہ مسلسل مسکراتی صبا کو دیکھتے ہوئے وہاج حسن کی رشتے کی آفر پر غور کر رہی تھیں۔

☆☆☆

ہاتھوں پر
کتابوں پر
درختوں پہ
کسی کا نام لکھنے سے
کوئی اپنا نہیں ہوتا
نام سے نام جوڑنا
اتنا آسان نہیں ہوتا
آسمان کا فیصلہ ہے یہ
زمین پر نہیں ہوتا

کچھ سال قبل کی ہی تو بات تھی زندگی کے کتنے مزے تھے کالج لائف، آزادی کا احساس، محبت کچھ اہم کچھ خاص بنا دینے والا جذبہ، خونی رشتے، تعلقات، کچھ کیا میسر تھا اور وہ خواب جو محبت سے وابستہ

تھا، جب مستقبل کے اندیشوں سے بے خبر، اردگرد سے بے نیاز، بے خبر، شوخیوں، شرارتوں میں مگن وہ دونوں املتاس کے پیڑ تلے روپہلی چاندنی یا سنہری پتوں پر پڑتی سورج کی روشنی میں ایک دوسرے کو جذب دل کی کہانیاں سنایا کرتے تھے، معطر پھولوں کی خوشبو جیسے نرم رومینٹک اشعار سنائے تو اندر باہر زندگی سے بھرپور روشنیاں جگمگانے لگتیں، وہ زمانہ وہ باتیں وہ یادیں جب لگتا تھا کہ ہمیشہ خوشی ہمسفر ہو گی، کامیابی ہر موڑ پر ہتھیلی کو چھوتی ہوئی ملتی، کبھی گمان بھی نہ کیا تھا کہ آنسو بھی ایک دن پلکوں کا مستقبل ورثہ ہو جائیں گے، اس نے اپنی پلکوں پہ اٹکے آنسو کا قطرہ انگشت شہادت پہ لیا۔

وہ یوں ملا ہے کہ جیسے کبھی ملا ہی نہ تھا
ہماری ذات پہ جس کی عنایتیں تھیں بہت
ہمیں خود اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

"مجھے ایک دفعہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ زندگی کبھی اس موڑ پر لے آئے گی جب آنکھوں کے پار چاند اور آنکھوں میں صرف دھند رہ جائے گی اتنی دھند کہ سب راستے گمشدہ نظر آئیں گے۔"
"آپ پھر اسی ڈپریشن کا شکار ہیں، بھول جائیں وہ سب، وہ ہماری زندگی سے نکل چکا ہمارے روز و شب کا حصہ نہیں رہا کیوں اسے دل و دماغ پر طاری کر کے خود کو تکلیف دیتی ہیں۔" جویریہ اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتی ہوئی بولی۔
"بھولنا، بھلانا اتنا آسان تو نہیں۔" اریبہ نے اک تکلیف دہ آہ بھری اور کپ اٹھا لیا۔
"مگر بھلانا پڑتا ہے ورنہ زندگی آسان نہیں ہوتی، وہ خواب جو سراب بن جائیں جن سے کچھ حاصل نہ ہو کیا فائدہ انہیں رو رو کر زندگی عذاب کرنے سے۔" جویریہ نے ناصحانہ انداز میں کہا، وہ اس بار کچھ بولی نہیں تھی۔
"آپی کیا آپ کی کمپنی جو فنکشن ارینج کر رہی ہے ہم بھی شریک ہو سکتی ہیں، اس میں۔" ربیعہ اپنی چائے لئے ان کی طرف آتی ہوئی بولی۔
"ہاں مضائقہ تو کوئی نہیں مگر تمہارا نہ جانا ہی بہتر ہے، میں شوبز اور گھر دونوں کو یکسر الگ تھلگ رکھنا چاہتی ہوں، کیونکہ تم نہیں جانتیں اس فیلڈ کے لوگ اور ایسے فنکشنز میں آنے والے کس قماش کے ہیں، کس کیٹگری میں ان کا شمار ہوتا ہے، جو بزنس کو ڈاؤن نہ کرنے کے لئے بہنوں، بیویوں، بیٹیوں کو شو آف کر دیتے ہیں، عورت اس شعبے میں صرف "دیکھنے دکھانے" کی چیز ہے، محض لطف و تماشہ جیسے انسانیت کے کسی کھاتے میں یہ لوگ فٹ نہیں کرتے۔" وہ تلخی سے بولی۔
"مگر کیوں؟ اتنے بڑے عہدوں پر فائز اتنے ایجوکیٹڈ، ویل آف یہ لوگ ایسے گھناؤنے کیسے ہو جاتے ہیں؟" ربیعہ بے حد حیرت سے بولی۔
"دولت، بے تحاشا دولت اسٹینڈرڈ اور اختیار کا نشہ نہیں انسانوں کو جھکانے، گرانے اور ذلیل و خوار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ انسانیت کے جامے سے نکلتے نکلتے شیطانیت کے سب سے اونچے درجے پر پہنچ جاتے ہیں۔" اریبہ کا لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ تھا۔

''اور میں نے تم دونوں کے رشتے طے کر دیے ہیں، یہ منگنی نہ ڈیٹ فکس ہیں ڈائریکٹ شادی اور رخصتی اگلے ماہ ایک ساتھ کر دوں گی تم دونوں کی، تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دونوں کے رشتے اچھے، دولت منداور معزز فیملیز میں طے کیے ہیں، جنہیں میرے شوبز جوائن کرنے کا خوف ہے نہ کسی اور قسم کا دھڑکا، ہر چیز اچھی بہترین جو جی چاہے اپنے لئے خرید و ڈرائیور، گاڑی پیسے سب ہیں۔'' وہ انہیں دیکھتی ہوئی بولی، اریبہ نے دھما کا کیا وہ دونوں شدید حیرت سے ساکت سی ہو گئیں۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم پہ میرے حوالے سے کوئی آنچ پریشانی آئے یا غم کا سایہ پڑے، ہر کام کا وقت ہوتا ہے اور اس کام کا مناسب وقت شاید یہی ہے۔'' اریبہ نے اب رسان سے کہا تو وہ حیرت کے جھٹکے سے نکلتی بولیں۔

''مگر اتنی ایمرجنسی میں شادی، ہمیں پوچھے بتائے بنا رشتے طے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ میں اس گھر کا تمہارا برا چاہوں گی۔''

''نہیں، اس گھر کا اچھا سوچتے تو خود کو دلدل میں پھنسا لیا آپ نے۔''

''تو بس Belive it سب بہتر ہو گا کہ اللہ کا کیا ہے ہمارا نہیں اور خود کو بس Rrlex رکھو کہ اللہ بہتر ہی کرتا ہے۔'' وہ انہیں کہتے ہوئے اٹھی جبکہ ربیعہ اور جویریہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''میں اب سوؤں گی کیونکہ رات کا فنکشن ہے اگر سوئی نہ، تو پوری رات جاگ نہیں سکوں گی، تم لوگ ٹھیک شام سات بجے مجھے جگا دینا۔''

''فنکشن تو شاید دس بجے سٹارٹ ہو گا۔''

''ہاں مگر وہاں جا کر تیار ہونا کچھ دیکھنا کرنا ملنا ملانا ذرا پہلے نکلنا ہو گا اور تم دونوں ٹی وی پہ دیکھنا بلکہ ریکارڈنگ محفوظ کرنا لائیو شو ہو گا، میں ریکارڈنگ گھر آ کر دیکھوں گی۔'' اس کا لہجہ قدرے جوشیلا اور ایکسائٹمنٹ لئے ہوئے تھا۔

''ہم گھر اکیلی رہیں گی رات بھر۔'' ربیعہ جھجک کر بولی۔

''نہیں فوج بھیج دوں گی خود میں اعتماد لاؤ جو اکیلے ہیں انہیں اکیلا ہی رہنا ہے اور میں اب ریسٹ کرنے لگی ہوں تم چاہو تو سٹنگ روم کے شوکیس کے لاکڈ دراز میں تصاویر، ڈیٹیل سب موجود ہے دیکھ سکتی ہو اپنے ہونے والے شوہروں کی۔''

وہ انہیں مزید حیرت زدہ کرتی باہر نکلی کمرے سے تو ربیعہ، جویریہ کچھ دیر تحیر زدہ رہنے کے بعد ایک ہی جست میں سٹنگ روم کے اندر تھیں اور کچھ دیر بعد ان دونوں کے ہاتھ میں کتابی سائز البم تھی، بمعہ فیملی تصاویر نام ڈیٹیل دونوں لڑکے اچھے خاصے خوبصورت قد و کاٹھ کے، اچھا ناک، نقشہ رکھنے والے، مختصر مگر امیر فیملیز سے بلونگ تھے اور ساتھ ان کے پرسنل سیل نمبرز بھی تھے تصاویر کے اریبہ کی جلد بازی سے خائف ہونے کے باوجود یہ سب انوکھا، اچھا، خوبصورت لگا تھا وہ اپنی بہن کی مجبوریوں، دکھوں سے واقف تھیں، جس نے ان کے لئے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، وہ ان کے لئے ایک باعزت زندگی کی تلاش میں اپنا آپ گروی رکھ چکی تھی دنیا کے بازار میں اور ان کا برا کیسے سوچ سکتی تھی، وہ اریبہ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر چکی تھیں۔

مگر ایک سوچ کے ہاتھوں پریشان ضرور تھیں کہ اریبہ کو وہ اکیلی کیسے چھوڑ سکتی تھیں؟ اور اریبہ نے

وہ مسلمانوں سے یہ بھی جان رہی تھی کہ اللہ نے قوموں کی ہدایت و موعظمت کے لئے بہت سے پیغمبر معبوث فرمائے کسی نے نہیں کہا کہ وہ خدا ہیں بلکہ کہا تو صرف یہ کہ وہ بس پیغمبر ہیں، مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں۔

اسے یاد آیا کہ دنیا کے خاتمہ کے حوالہ سے مسلمانوں کے بھی کچھ نظریات ہیں سو اس نے اسلام کا چینی ترجمہ پڑھا اور اس کو پڑھنے سے پہلے وہ کچھ اچھی رائے نہ رکھتی تھی اور اسے توقع تھی کہ اس میں خوفناک غلطیاں، اہانت آمیز کلمات، توہمات اور تضادات نظر آئیں گے ایسی لئے وہ موزانہ کے لئے ساتھ ساتھ بائبل، زبور، توریت اور انجیل کے صحائف بھی دیکھتی جاتی تھی، وہ جان رہی تھی کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی رہنمائی کرتا ہے، نہانے دھونے سے لے کر خاندانی تعلقات اور معاشرتی روابطہ کے حوالہ سے ایک ایک معاملہ میں یہ دین ٹھوس اور فطری رہبری کرتا ہے، وہ جان چکی تھی کہ کوئی بھی متعصب اور منصف پسند انسان قرآن کے برحق ہونے میں شبہ نہیں کر سکتا اس کا پر شکوہ مگر سادہ اسلوب انسانی نفسیات کے عین مطابق مسائل کا ادراک اور مادی و روحانی معاملات میں انسان کی مکمل رہنمائی قابل عمل تعلیمات اسے ایک ابدی رہنما کتاب ماننے پر مجبور کرتی ہیں، قرآن اسے کئی حوالوں سے بائبل سے منفرد اور افضل لگا، کیونکہ عیسائیت کے کسی عقیدے میں عقل و شعور کی کارفرمائی نظر نہ آتی تھی، جبکہ اسلام کی تعلیمات اور نظریات آپس میں بالکل منظم اور مضبوط تھے، اس نے یہی پڑھا اور سنا تھا کہ اسلام ظلم و بربریت پر مبنی جنگ و جدل کا دین ہے وہ اب جان رہی تھی کہ جہاد کا وہ نظریہ جس کے تحت مسلمان بدنام اور دنیا بھر میں دہشت گرد گردانے جاتے ہیں وہ قرآن حکیم میں مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے کہیں معاشرے کے پسے لوگوں کو نجات دلانے کے لئے کہیں معاشرتی ناانصافی اور محرومی کے خاتمے کے لئے کبھی تزکیہ نفس کے لئے اور کہیں دشمنوں کی جارجیت روکنے کے لئے، اسلام کا نظریہ جہاد عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور راہبوں کی حفاظت کرتا ہے، یہاں ہسپتالوں، سکولوں، عبادت گاہوں اور رہائشی مکانوں پر بمباری کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام صرف انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دینے کے لئے لڑتا ہے یا پھر اس وقت تلوار اٹھاتا ہے جب تبلیغ دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں یا دشمن جارجیت پر اتر آئے، اسلام میں بے گناہ انسانوں کے قتل و خون کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس کی نگاہیں اللہ سبحان تعالیٰ کے اس فرمان پر اشکبار تھیں۔

''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کریں اور یاد رکھو، حدود سے تجاوز مت کرنا، اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (سورہ البقرہ، آیت 190)

''جس نے دوسرے انسان کو بغیر کسی وجہ کے قتل کیا تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا اور جس کسی نے کسی دوسرے کی جان بچائی تو گویا اس نے ساری انسانیت کو بچا لیا۔'' (سورہ المائدہ آیت 32)

''حرمت انسانیت کا یہ درس اللہ اور اس کے رسول کا دیا ہے اور اسلام میں کسی بے انصافی یا استحصال کی کوئی گنجائش نہیں نہ تو آبادیاتی نظام سامراجیت، طبقاتی کشمکش یا غیر منصفانہ اور جارحانہ جنگوں کی اجازت ہے اسلام کے قانون صلح و جنگ عین فطری اور انسانی مفاد میں ہیں، اسلام، روح، جسم اور پوری کائنات کے لئے سلامتی اور رشد و ہدایت کا پیامبر ہے سورہ نور پڑھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ

اپنے لئے کیا سوچا تھا؟

وہ بھن جو ہزار صدمات سہنے، مشکلات کے باوجود زندہ رہی، اپنے وجود کو زخم زخم دیکھ کر بھی ان کے لئے جینے کی سعی کرتی رہی، کیا وہ اس کے لئے کچھ کر سکتی تھیں، اریبہ کی آنکھ کھلی تو نہا کر فریش ہوئی جوس پیا تازہ پھر گاڑی کی چابی اٹھائی اور اس کی گاڑی ان راستوں پر سبک رفتاری سے بڑھنے لگی جو لاہور کے سب سے خوبصورت مہنگے ایونیو تک جاتے تھے، چار گھنٹے صرف چار گھنٹے کے فاصلے پر تھی کامیابی، شو شروع ہونے میں ٹائم تھا، پاکستان سلور سکرین اور منی اسکرین کی تمام بیوٹی اور کریم آداری کے خوبصورت روشنیوں بھرے رومینٹک ماحول میں خوشبوئیں بکھیرتی جمع ہو رہی تھی، اریبہ نے محض اک نظر اس طرف دیکھا تھا پھر اپنے لئے مخصوص کردہ ڈریسنگ روم میں جانے لگی۔

☆☆☆

''اللہ کو ہماری وفاؤں اور عبادتوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، انسان ایک ذمہ دار ہستی ہے اور اس کی تخلیق ایک خاص مقصد کے لئے عمل میں آئی ہے وہ مقصد کیا ہے؟ کتاب الٰہی نے تخلیق انسان کو وہ خاص مقصد عنایت و بندگی بتایا ہے، ارشاد ربانی ہے کہ۔''

''ہم نے جنوں، انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے'' حضرت علیؓ نے اس کی تشریح یوں فرمائی کہ......''

ماریا ایک بار پھر درس قران وحدیث کی کلاس اٹینڈ کر رہی تھی اور ایک بار پھر اس کی آنکھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں کیونکہ موضوع و انداز بیان کے ساتھ دلکش قرأت میں قرآنی آیات کا حوالہ زبردست تھا اگرچہ وہ عربی زبان سے نابلد تھی مگر قرآن کی قرأت میں ایک معجزانہ تاثیر ہے جو قلب میں عجب کیفیات پیدا کر دیتی ہے، قرآن کا صوتی آہنگ انسانی فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے، قرآن کی معجزانہ تاثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزول قرآن کے وقت تھی اور سننے والا غیر مسلم آج بھی اس اعجاز کو محسوس کر سکتا ہے کہ یہ آیات آفاقی ہیں، وہ قرآن انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنتی اور پڑھتی ساتھ عربی زبان و بیان سے واقفیت کی کوشش بھی کرتی، وہ ہمیشہ سے سنتی آئی تھی کہ قرآن بنیادی طور پر بس انجیل کی بگڑی ہوئی شکل ہے مگر عمرانیات، انسانیہ، اجتماعیات، اقتصادیت، سیاسیات اور ساجیات کے ضمن میں قرآن نے جو عدل اجتماعی دیا ہے، انجیل میں تو ان علوم کا دور، دور تک نہیں، وہ حیران رہ گئی کہ آج سے پندرہ سو سال پہلے ایسی باتیں کوئی کیسے لکھ سکتا تھا، ایک دفعہ یہ خیال بھی آیا کہ عرب سائنس دان، ریاضی دان، ہیت دان اور جغرافیہ کے نقش ساز اس زمانے میں خاصا آگے رہے ہوں گے، سر جوڑ کر بیٹھے ہوں گے، توریت اور انجیل کو سامنے رکھ کر ایک کتاب تیار کر دی ہو گی، مگر مزید مطالعے اور تحقیق کے بعد پتا چلا کہ عرب سائنسی انقلاب ظہور اسلام کے بعد کی بات ہے، پھر اسے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو یہ قرآن حکیم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی صورت تواتر سے جبرائیل فرشتے کے ذریعے عطا ہوا اور یہی کتاب دراصل کلام الٰہی کی ایک مسلسل کڑی ہے اور مسلمانوں کا ایمان ہے کہ توریت اور انجیل کے بعض اجزاء جن میں عیسیٰ کا ذکر ہے اس خدا کا الہام ہیں، جسے عرب میں ''اللہ'' کہتے ہیں، ایک مسلمان ہی نہیں عرب کے عیسائی اور یہودی بھی خدا کو ''اللہ'' ہی کہتے ہیں، پھر مسلمان نوح، ابراہیم، سلیمان اور موسیٰ، عیسیٰ بلکہ بھی تورانی اور انجیلی پیغمبروں کا پورا احترام کرتے ہیں۔

اسلام میں عورت کو کس قدر تحفظ اور حقوق، عزت حاصل ہیں ورنہ اسلام دور جاہلیہ میں عرب بیٹیوں کو زندہ ہوتے ہی دفن کر دیا کرتے تھے، عورتوں کی منڈیاں لگتی تھیں جہاں وہ ایک جنس کی طرح فروخت ہوتی تھیں، یونانی قوانین میں عورت کی بے حرمتی عام تھی اور ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھتا تھا یہ دین اسلام ہی تھا جس نے معاشرے میں عورت کو عزت کا مقام دیا اور جنت جیسے ارفع مقام کو ''ماں'' کے قدموں تلے مخصوص کر دیا، بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کو وارثت کے حقوق دیے اسے فاطمہ کے الفاظ یاد آئے تھے۔''

''حجاب ونقاب زدہ عورت اور داڑھی والا مرد دیکھ کر ایک غیر مسلم کو اسلام ایک جیل خانہ کی طرح نظر آتا ہے جس میں کسی طرح کی آزادی نہیں ہے لیکن اسام میں رہ کر ہمیں سکون، آزادی اور ایسی مسرت کا احساس ہوتا ہے جس کو کسی اور شکل سے سمجھا نہیں جا سکتا، قرآن مجید ان لوگوں کو اندھا کہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے منکر ہیں۔''

''اور اب وہ بذات خود قرآن کی یہ صراحت دیکھ رہی تھی کہ ''اللہ گمراہی کے خواہش مندوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا اور دلوں کو پتھر کی طرح سخت بنا دیتا ہے۔''

''تو کیا واقعی اس کے دل پر مہر تھی کہ وہ قرآن کے پیغام کی سچائی نہ دیکھ سکی نہ محسوس کر سکی وہ جیسے ایک خوف کافری کے اندیشہ سے ٹھہر کے رہ گئی اگر وہ ساری زندگی اسی گمراہی میں گزار دیتی تو......'' اور کیا وہ اس قابل ہے کہ قبر کا عذاب یا جہنم کی آگ سہہ سکے اور کیا یہ مالک کی ہی مرضی تھی کہ اس کے وہم و گمان کو مذہب کی ضرورت کی کشش محسوس ہوئی اور اسی کی مرضی سے اس کی بصارت اور بصیرت کام کرنے لگی، وہ سچ اور جھوٹ کی تمیز، ڈھونگ اور حقیقت کو پرکھنے کا پرچار کرتی اسلام تک آ پہنچی، وہ اسلام جس کی مقدس کتاب قرآن المجید کا رستم الخط عربی جیسی خوبصورت زبان میں تھا جس کے الفاظ بیان کس قدر حسین، مہر و محبت سے معمور، حقوق نسواں کے حامی اور سائنسی معلومات سے بھرپور تھے۔

وہ قرآن جس میں خودکشی حرام ہے، اسلام میں خودکشی مایوسی کا اظہار ہے، انسان جب دنیا سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتا ہے اور مایوسی گناہ ہے۔

اس نے یہ گناہ کتنی بار کیا تھا اپنے پیدا کرنے والے خالق کی وہ کتنی بار منکر ہوئی تھی، اس کا دل لرزنے لگا تھا اللہ کے احکام اور ہیبت کو محسوس کرتے، اس کے ہم مذہب و ہم وطن جو اسلام میں عورت کو مظلوم گردانتے تھے، کیا وہ مسلمان عورت کے حجاب میں ملبوس جسم کا اعتماد سکون وقار اور اطمینان جج کر سکتے تھے، ایسی آزادی جس میں زبردستی یا مظلومیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

اور مغرب میں عورت آزاد نہیں تھی، آزادی نسواں کے نام پر اس پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں جبکہ وہ قائل تھی کہ اسلام نے عورتوں کو حقیقی آزادی عطا کی ہے، اسلام میں کسی بے انصافی یا استحصال کی گنجائش نہیں۔

عیسائیت میں حضرت عیسیٰ کو واسطہ بنا کر خدا سے دنیاوی نعمتیں طلب کی جاتی ہیں، جبکہ نماز میں براہ راست خدا سے تعلق قائم ہوتا ہے، بندہ اپنے رب کی حمد و ثناء کرتا ہے اور اس سے دینی و دنیاوی بھلائیاں طلب کرتا ہے اس نے سورہ مریم کا تفصیلی مطالعہ کیا جس سے اسے علم ہوا کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں اور حضرت مریم ان کی کنواری ماں جبکہ نہ تو عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں نہ مریم کسی کی بیوی اور ماں، اسلام کے بنیادی اصول وحدانیت، حقانیت اور اخوت و مساوات بے حد معقول، موثر، مفید اور

فطری ہیں جو رنگ نسل اور قبیلے کے امتیازات سے بلند ہو کر سب کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں، اسلام میں مساوات کا بین الاقوامی اور عالمگیر جذبہ جس کے تحت سب برابر ہیں۔ جس نے عملی طور پر انسانوں کے درمیان حائل خلیجوں کو پاٹ دیا ہے اور صحیح معنوں میں بنی نوع انسان کو خدا کا کنبہ بنا دیا ہے۔ جس کے متعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اللہ کی ساری مخلوقات اس کا کنبہ ہے اور اللہ کو وہی سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہے۔" ماریا کو خوشی تھی وہ جتنا پڑھ رہی تھی اتنا زیادہ سیکھ رہی تھی اور سیکھتے سمجھتے ہوئے اس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ سالہا سال سے اسی گوہر مقصود کی متلاشی تھی، اس کا علم عقل جو نتائج اخذ کر چکے تھے اس پر صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔

☆☆☆

"وہاج کا پرپوزل صبا کے لئے۔"

سعیہ شہریار کے ساتھ حیدر صاحب بھی تحیر زدہ سے رہ گئے تھے، بات ہی ایسی تھی ایک تو صبا کی فزیکلی ابنارمل اور ریش کنڈیشن پھر وہاج جیسے جینئس اور کوالیفائیڈ بندے کا پرپوزل امیزنگ۔

"تم کیا کہتی ہو اس سلسلے میں۔" حیدر صاحب نے اپنی نصف بہتر کو دیکھا۔

"اگر تمام حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو صبا کی موجودہ حالت اور رشتہ ٹوٹنے کے بعد ہمارے پاس اور کوئی راہ نہیں اور اسے ٹھکرانے کی غلطی کرنا حماقت ہے، مگر صبا نہیں مانے گی وہ بہت ڈس ہارٹ ہے۔"

"ہمیں تمام حقائق کو دیکھ کر ہی فیصلہ کرنا ہے اور میرا خیال ہے صبا کی زندگی میں خوشیوں کو واپس لانے کے لئے وہاج سے اچھا جیون ساتھی اور کوئی نہیں مل سکتا، پھر صبا کی موجودہ صورتحال اور رشتہ ٹوٹنے کے بعد ہمارے پاس اور کوئی راہ نہیں۔" عدیل نے بھی رائے دی۔

"اگر وہ اس حالت میں بھی صبا کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہے تو اس کا مطلب ہے وہ اسے بیچ راہ میں کبھی نہیں چھوڑے گا۔" راحیل بولا تو حیدر صاحب نے باری باری سب کو دیکھا پھر نگاہیں نزہت پر ٹک گئیں۔

"آنٹی صبا کو اچھا بہترین رشتے ملنا کم نہیں ہو سکتے مگر بات ہے تو صرف اس کے اعتماد کو بحال کرنے اور اسے جلد سے جلد زندگی کے ہمقدم کرنے کی رہا وہاج حسن سے شادی تو ہر وسوسے کو ذہن سے جھٹک دیں وہ بہت اچھا اور ہینڈسم لڑکا ہے اگرچہ شروع سے دولت میں نہیں کھیلا مگر اپنی زندگی کے لئے اس نے بہت جدوجہد کی ہے، صبا کی طرف ہاتھ وہ خود بڑھا رہا ہے تو یقیناً یہ صرف ہمدردی نہیں وہ کچھ نرم فیلنگز رکھتا ہوگا صبا کے لئے۔" شہریار بالکل ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے رسان سے بولا تو نزہت بیگم نے پوری توجہ سے دیکھا تھا اسے۔

"یہ سب ٹھیک ہے بیٹا مگر اس حالت میں ہمدردی یا محبت کسی بھی جذبہ کے تحت وہ یہ سب کرنے پر آمادہ ہو کل کو یہ جذبہ ماند پڑ جائے تو حالات کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں، تمہیں نہیں پتا شہری میں ایک بیٹی کی ماں ہوں اور میرا ذہن بہت دور تک سوچ رہا ہے۔" وہ الجھی کیفیت میں بولیں۔

"آنٹی آپ قبل از وقت واہموں اور خدشات کو لے کر پریشان مت ہوں، وہاج کو میں سٹوڈنٹ لائف سے جانتا ہوں، وہ بہت سچا اور کھرا بندہ ہے اگر Comitment کرتا ہے تو جی جان سے نبھاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے سب کی رائے ٹھیک ہے کیونکہ صبا کی ذہنی و جسمانی حالت اور بعد کا لمبا کرائسس ایسے میں ہم وہاج حسن کا پرپوزل ریجیکٹ کر دیں تو کیا گارنٹی ہے کہ اس کے بعد ایسا بہترین اور جینئس لڑکا ملے گا اور اگر ہم باقاعدہ اسے کاروبار میں شیئرز دیں تو جو اسٹیٹس کی کمی بیشی ہے وہ کور ہو جائے گی۔" حیدر صاحب سنجیدگی سے بولے۔

"صبا نہیں مانے گی۔" نزہت نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آنٹی ہمیں صبا کو ہر صورت میں اس پرپوزل کے لئے تیار کرنا ہے اور یوں سمجھیں کہ اس کی فزیکلی و مینٹلی امپرومنٹ کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔"

"انکار کرنا یا اس پرپوزل کو رد کرنا میں بھی نہیں چاہتی مگر صبا کو قائل کون کرے گا؟" نزہت نے آہ بھری۔

"سعیہ آپی، آپ کو بات کرنا ہوگی صبا سے آپ اس کی بہترین دوست ہیں، آپ اس سے وابستہ ہر بات سے باخبر ہیں، آپ ہی ہیں جو اسے قائل کر سکتی ہیں۔" عدیل نے براہ راست اسے کہا تو وہ جیسے چونکی تھی۔

"یہ کیسے قائل کرے گی یہ تو وہاج حسن کے عشق میں مریضہ بنی ہوئی ہے۔" شہریار کا اندر پھر سے جلنے لگا شک اور رقابت کی آگ میں۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں بات کر کے اسے سمجھا کے۔" سعیہ اثبات میں سر ہلاتی صبا کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"نہیں سعیہ، میں ابھی اس پوزیشن میں، اس چیز کے لئے بالکل بھی تیار نہیں، میں ابھی ٹھیک سے خود کو اس حالت میں قبول نہیں کر پا رہی تو پھر وہاج حسن جیسا بندہ اتنی آسانی سے مجھے کیسے قبول کر سکتا ہے No never۔"

"صبا ایسا مت کہو، تم خوامخواہ ایموشنل ہو رہی ہو۔"

"تم مجھے سمجھ سکتی ہو سعیہ میں بہت ڈسٹرب ہوں، اپنی جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے، پھر کسی لڑکی کی شادی ٹوٹ جانا معمولی بات نہیں ہوتی، میں اس کیفیت میں یہ پرپوزل اوکے نہیں کروں گی کہ میں دوں تو کبھی سر اٹھا کر اعتماد سے نہ اس شخص کو فیس کر سکوں گی نہ دنیا کو اور یہ بھی کنفرم نہیں کہ میری جسمانی

"دعائے مغفرت"

ہماری پیاری مصنفہ قرۃ العین رائے کے والد محترم 27 ستمبر کو روڈ ایکسیڈنٹ میں قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

دکھ کی اس گھڑی میں ادارہ حنا قرۃ العین رائے کے غم میں برابر کے شریک ہے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔
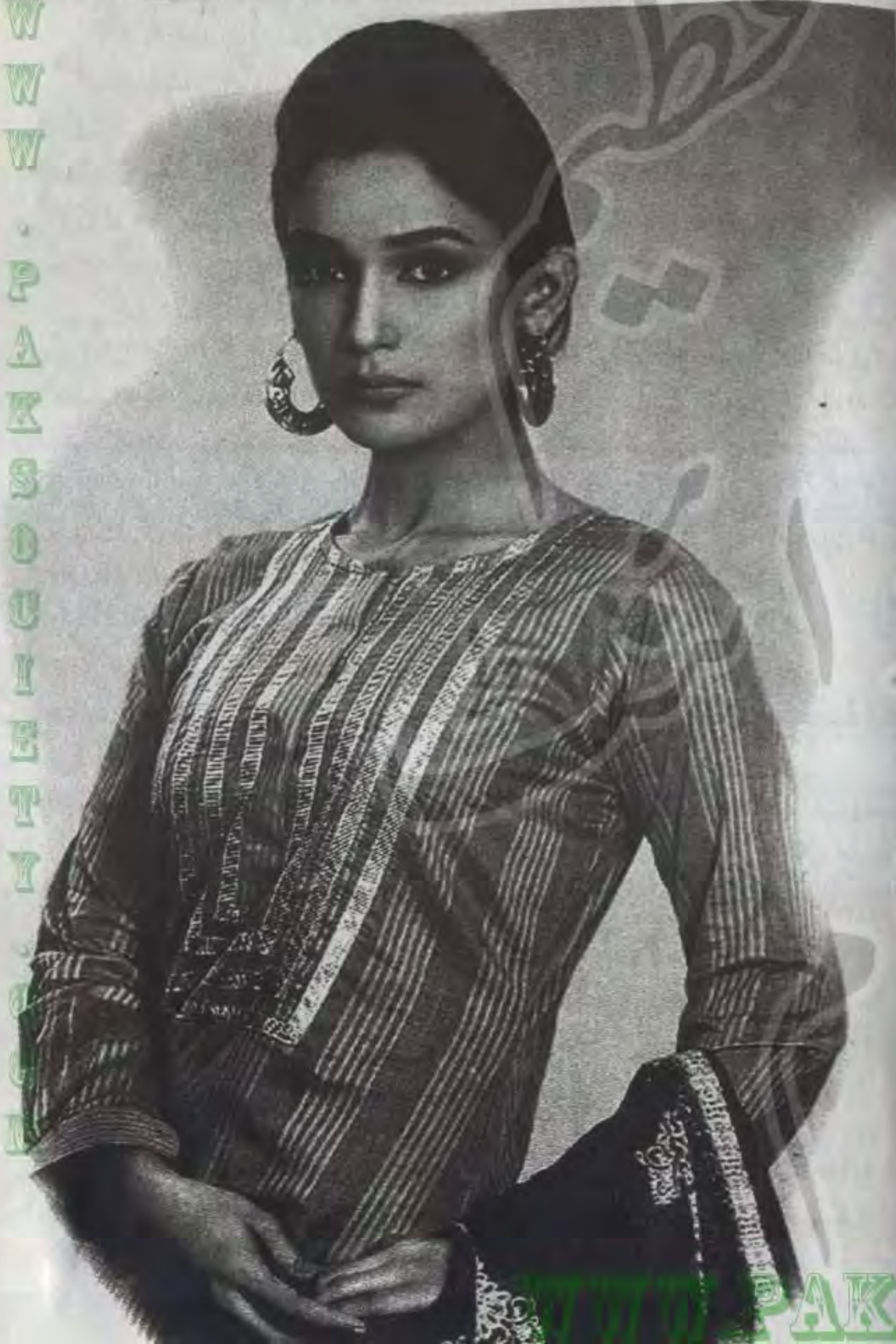
حالت بہتر ہوگی کہ مزید مخدوش، مجھے کسی کی ہمدردی چاہیے نہ ترس۔"

"صبا میں تمہاری خیر خواہ اور مخلص ہوں، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم یوں چپ سادھے لیٹی رہو، جو ہوا وہ ایک حادثہ تھا اسے خود پہ طاری کر لینا اور خوشیوں کے دروازے نہ کھلنے دینا، اپنے پیاروں کو سزا دینا تم یہ سب نہیں کرو گی کیونکہ ایسا صرف کمزور لوگ کرتے ہیں اور تم تو بہت بہادر ہو جو غموں دکھوں سے دوستی کرنے سے چڑتی ہے، صبا مجھے اپنی وہی دوست اچھی لگتی ہے جو واہمات اور خدشات کو جھٹک کر جینے کے درس دوسروں کو دیا کرتی تھی، جس کی باتوں سے مجھے حوصلہ ملتا تھا، جو جینا چاہتی تھی، تمہاری یہ خاموشی، ذہنی انتشار مجھے بہت دکھ دے رہا ہے۔" صبا کی آنکھیں بند تھیں آنسو بہہ رہے تھے۔

"اور وہاج حسن کوئی ترس نہیں کھا رہا تم پہ، نہ تمہارے ہمراہ ہونے والے حادثے میں ہمدردی دکھا رہا ہے، وہ یقیناً تم سے محبت کرتا ہے، تمہاری زندگی اگر ہے تو اس کی ایک وجہ یہ شخص بھی ہے جو تمہیں ایکسیڈنٹ سے لے کر ہسپتال پہنچانے تک پھر گھر آنے تک کیئرنگ رہا تمہارے حوالہ سے تم زندہ سلامت ہو اور یہ مانو کو وہاج حسن کی وجہ سے خدا کے بعد وہ تمہارا مددگار رہا، اس کا دل بہت بڑا ہے صبا کہ وہ دکھاوے کی ہمدردی کرنے یا دنیاوی مروت دکھانے کی بجائے بہت چاہ سے تمہیں باعزت طریقہ سے اپنا کے اعتماد فراہم کر رہا ہے۔" صبا نے اسے دیکھا تو آنسو کچھ اور تیز رفتاری سے بہنے لگے انہی آنسوؤں کے ساتھ وہ بھرائے لہجہ میں بولی تھی۔

"میرے ددھیال والے سگی پھپھو رشتہ توڑ گئیں، ایک پل صرف ایک پل میں انہوں نے مجھے پرایا کر دیا اپنے رشتے تعلق سے کیونکہ میرا وجود بے وقعت، غیر اہم، ناپسندیدہ بوجھ کے مانند لگا تھا انہیں اور وہاج حسن اس ناکارہ ٹانگ کے ساتھ کتنی دیر رفاقت نبھا سکتا ہے مجھ سے سال، چھ ماہ دو سال پھر...... پھر میں اسی گھر میں اسی بیڈ کے کونے میں ناکارہ وجود کی مانند آ لگوں گی تو سعیہ اس کے لئے اتنا پراسس کیوں؟ جو یہاں، جیسے ہے ویسے رہے تو کیا حرج؟ مجھے رلا تڑپا کے مارنا ضروری ہے کیا۔" مضمحل انداز میں تاسف سے بولتے کتنے آنسو بہے تھے سعیہ نے چند ثانیوں تک دیکھا اسے پھر اپنے ساتھ لگا لیا کھینچ کر اس کی اپنی آنکھیں بھی بہہ رہی تھیں۔

"صبا اس سب ہونے میں تمہارا قصور نہیں، نہ تم گلٹی فیل کرو کیونکہ یہ حادثہ کسی کے یا میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور یہ مشیت ایزدی ہے بس، وہاج حسن بیشک دنیا میں آخری شخص نہیں مگر سب گھر والوں کو منشاء رائے اور خود میری Jujment میں وہ تمہارے لئے ایک بہترین انتخاب ضرور ہے جس پر سب خوش اور متفق ہیں کیا تم کسی کی خوشی کا خیال نہیں کرو گی۔" سعیہ نے اس کے بال سنوارتے اور چہرہ صاف کرتے ہوئے ملتجی انداز میں پوچھا۔

"سب کے لئے تم بے حد اہم ہو گھر میں کسی کو تمہارے چہرے کی اداسی اور خاموشی اچھی نہیں لگتی تمہیں سب ہنستی ہوئی دیکھنے کے خواہاں ہیں۔" نمی سعیہ کے لہجہ میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی تھی۔

"کیا تم ذرا سی گنجائش بھی نہیں نکالو گی اس شخص کے لئے جو بیتے سانحے کو نظر انداز کیے پورے دل، چاہ اور مان سے تمہارا ساتھ مانگتا ہے۔" اور صبا دھواں دھار روتی ہار مانتی اس کے سامنے اثبات میں سر ہلا گئی۔

(جاری ہے)

یہ کیا کہ غیر کے کہنے پہ ہر نظر دیکھیں
ملے جو وقت تو خود بھی ادھر ادھر دیکھیں
لگا رہے ہیں جو الزام اہل دل پہ بہت
کبھی وہ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں

جگنو جو حیدر بھائی کے کندھے پر سوار مستقل اس بات پر مصر تھی کہ وہ ہر صورت علی کو ڈانٹیں اور کسی طرح اس کا علی سے بدلہ پورا ہو جائے، علی نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھتے شعر پڑھا تھا، جس پر "چورنی کی چٹیا میں جھاڑو" کے مصداق وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔

"میں کیوں لگاؤں گی تم پہ الزام، تم کہاں کے پرنس ہو؟ اور میرے خلاف سازشیں تم کرتے ہو، میں نہیں۔"

"بھیا دیکھ لیں اسے، میں نے تو بس محسن چچا کو یاد کیا تھا، ان محترمہ کو پتہ نہیں کیوں ہر بات خود پہ کیوں لگتی ہے، وہ کہتے ہیں ناں، جو کہتا ہے وہ خود ہوتا ہے۔" وہ قہقہے لگاتے صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا، جگنو کو جلانے کا مقصد تو پورا ہو گیا تھا۔

"او ہو تم لوگ اپنا جھگڑا مت سٹارٹ کرو یہ سوچو میجر صاحب سے لاہور جانے کی اجازت کیسے لی جائے؟" عاصمہ نے اصل مسئلہ یاد دلایا۔

"تو تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے باقی پارلیمنٹ کو راضی کر لو حیدر صاحب کو وہ خود منا لیں گے۔" اسامہ نے مشورہ دیا۔

"ٹرائی کر چکا ہوں، وزیر خزانہ نے تو میری سنی ہی نہیں، پڑھائی پہ توجہ کا مشورہ دے کر بھگا دیا۔" علی نے منہ بسورا، پڑھائی اس کا ویک پوائنٹ تھا جس پہ سب اکثر اس کی دم سمجھ کر پاؤں رکھتے تھے۔

"جگنو تم کیوں ٹرائی نہیں کرتی، تم تو چہیتی ہو دادا جان کی۔" عاصمہ نے راہ کھلائی باقی سب بھی سر ہلانے لگے۔

"نہیں میں ان سے ناراض ہوں۔" نازک مزاج تو وہ ہمیشہ سے تھی۔

"ہونہہ، موٹی کے نخرے۔" علی نے ناک چڑھائی۔

"اگر ہم بھوک ہڑتال کر لیں تو؟" حنا نے زبان کھولی وہ کم بولتی تھی مگر اچھا بولتی تھی (یہ صرف اسامہ کا خیال تھا)۔

"واہ خالہ بقراط کیا زبردست آئیڈیا ہے تمہارا۔" علی دو فٹ اچھلا تھا، اچھلنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ پاس بیٹھے شانی کے سر پہ زوردار کہنی لگی تھی، وہ زور زور سے رونے ہی والا تھا کہ حیدر نے جلدی سے اسے گود میں بیٹھا لیا، وہ ایسی صورتحال اچھے طرح سے کنٹرول کر لیتا تھا۔

"آئیڈیا تو اچھا ہے مگر کیا ہم بھوک برداشت کر سکیں گے؟" جگنو نازک مزاج ہونے کے ساتھ بھوک کی بھی کچی تھی۔

"موٹی کو تو کھانے کی پڑی ہے۔" علی کو موقع ملا۔

"او ہو تم تو چپ کرو۔" اسامہ نے اسے گھورا۔

"یار ہم بیچ میں تھوڑی ایسا کریں گے، چھپ کر کچھ کھا لیں گے مگر گھر میں کھانے کا بائیکاٹ، سمجھے؟" وہ رحمان ملک سے کافی ملتا جلتا تھا۔

"یعنی دوستو ایسا سمجھو کہ"

آؤ شہرت کے لئے چھوڑ دیں کھانا پینا
بھوک ہڑتال تو اخبار کی حد تک ہو گی

علی نے دیدے گھمائے تھے۔

"او کے ڈن، آج اور ابھی سے کھانا پینا بند، ملاؤ ہاتھ۔" حیدر بھائی جو اس گروپ میں سب سے سینئر تھے، نے فیصلہ سنایا، باری باری سب

نے ہی اتفاق کر لیا، یہ ان کی خوبی تھی کہ وہ جو بھی کرتے سب مل کر کرتے۔

کمرے سے نکل کر انہوں نے دوپہر کے کھانے سے بھوک ہڑتال کا باضابطہ اعلان بھی کر دیا جس پر والداؤں نے کچھ مضطرب ہو کر، والد حضرات نے گھور کر دیکھا جبکہ دادا جان نے کان ہی نہیں دھرے۔

شام میں وہ سب اکٹھے ہو کر اسامہ کے کمرے میں پیزا اور کوک اڑانے میں مشغول تھے ساتھ ہی ہنسی مذاق بھی جاری تھا، یہاں کسی کے آنے کا امکان کم تھا کیوں کہ تیسری منزل پر واقع اس کمرے میں کوئی بڑا نہیں آتا تھا، تبھی ان کی شامت اعمال دادا جان کی شکل میں آ پہنچی تھی۔

اک جوس کے گلاس پہ ہڑتال توڑ دی؟
چڑیوں کے ساتھ ہاتھ کے طوطے بھی اڑ گئے

وہ پلٹ کر چلے گئے، یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"جینا ہو گا، مرنا ہو گا، دھرنا ہو گا، دھرنا ہو گا۔" احتجاجی جلوس کی آواز اور جوش اس قدر بلند تھے کہ وہ سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، پہلے پہل تو لگا شاید قیامت آ گئی، اس نے ہاتھ سینے پر رکھ کر جھرجھری لی۔

نہیں شاید کوئی احتجاجی جلوس ہے، دماغ نے سمت متعین کی۔

"جلوس کس چیز کا؟" اس نے جوابی سوال دماغ میں ٹھونسا۔

"شاید لوڈشیڈنگ؟" جواب آیا، اس نے قہقہہ لگایا۔

"بجلی اور گیس آتی ہی کب ہیں جو لوڈشیڈنگ پر احتجاج ہو گا؟" دماغ نے بھی متفقہ سر ہلایا۔

"کہیں کوئی لانگ مارچ تو نہیں نکلنے والا؟" فلسفی ذہن ایک اور کوڑی لایا تھا۔

"مگر یہ لانگ مارچ والے ہمارے محلے میں کیوں؟" آگے تو سٹریٹ ہے اس نے دماغ کو گھورا۔

"اور صبح ہی تو نیوز سنی تھیں، ایسا تو کوئی معاملہ نہیں تھا۔" دماغ کی بات رد کر دی۔

دماغ ناراضگی کا مظاہرہ کرتے روٹھنے لگا تو اس نے بے اعتنائی سے نظریں پھیرتے باہر کے شور کی طرف توجہ دی جو شاید ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔

دماغ کی نالائقی پر لعنت بھیجتے اس نے حوصلہ اکٹھا کرتے کمر باندھتے بلکہ سارے حوصلے کو باندھتے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کا منہ بھی کھلنے میں پیچھے نہیں رہا۔

اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گرتی یا اپنا کھلا منہ بند کرنے کی زحمت کرتی، جلوس کے شرکاء میں ایک نے اس پر جھپٹتے ہوئے اس کے ماتھے پر بھی سیاہ پٹی باندھ دی اور ہاتھ میں پلے کارڈ پکڑا دیا، چند ہی لمحوں بعد وہ بھی انہی کا حصہ بن چکی تھی۔

اس نے ساتھ کھڑے شخص کے ہاتھ میں پکڑے پلے کارڈ پر غور کیا کہ اس پہ درج نعرے سے احتجاج کی وجوہات یا مطالبات جان سکے تو صدمے سے اس کی چیخ نکل گئی۔

"ہائے میرے چارٹ، اوئی اللہ، ہائے میں مر جاواں۔" اس کا واویلا پیچھے کھڑی خاتون کے بھاری ہاتھ سے رکا تھا جو مضبوطی سے اس کے منہ پر آ جما تھا۔

یہ خاتون نما لڑکی، او ہو لڑکی نما خاتون چھوٹی

بھابھی تھی، جو شاید اپنے شوہر کو چھوڑ کر سب کی بھابھی تھی، اس چھوٹی بھابھی نے چیخنی جگنو کو چپ کرا کے گویا سب کی گلو خلاصی کرائی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے موٹی، کیوں چیخی جا رہی ہو؟" علی نے اسے گھورا اسے ویسے ہی یہ "موٹی" ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی، موٹی نے پلٹ کر اسے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں موجود شیٹ اور اس پر سفید چینٹ کا استعمال دیکھ کر تو غصے سے برا حال ہو گیا، قریب تھا کہ وہ علی پر جھپٹ پڑتی، حیدر بھائی نے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب بلا لیا، انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر دخل اندازی نہ کی گئی تو معاملہ بہت سنگین اور رنگین ہو سکتا تھا۔ (رنگین علی کے لہو سے ہونا تھا)۔

"بیٹا کیا ہوا ہے؟" انہوں نے لہجے میں ڈھیروں چینی ملائی۔

"بھائی دیکھیں میری شیٹس کا انہوں نے کیا حال کیا ہے؟" وہ رونے والی تھی، تھوڑی دیر کے لیے سب کے احتجاجی نعرے بند ہو گئے تھے اور سب دائرہ بنا کر لاؤنج میں ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ جوں جوں سب کے پلے کارڈ دیکھ رہی تھی، اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا، وائٹ سی فوم پر پوسٹر کلرز کے بے دریغ استعمال سے نعرے درج تھے تو سادے کلرز کے چارٹس پر مار کر کلرز بھی اختتام کی نوید سنا رہے تھے اور تو اور اسامہ اور عاطف نے اس کے کلر پر بے بھی خوب دلجمعی سے استعمال کیے ہوئے تھے، شانی نے چھوٹے ہونے کی وجہ سے بس گلیس شیٹ کو ہی فوم پر چنوں چنر کے ساتھ چپکا کر اپنا مطالبہ درج کر رکھا تھا، اس نے بے چارگی سے نظر دوڑائی، دیواروں پر بھی کچھ ایسے ہی مناظر آ رہے تھے، حیدر نے تسلی آمیز انداز میں اس کا سر تھپکا۔

"بیٹا اجتماعی مفاد کے لئے ایسی چھوٹی موٹی قربانی دینی پڑتی ہے، یہ بھی تو دیکھو، اگر ہمارے پر زور احتجاج کے بعد ہٹلر میجر نے ٹرپ لے جانے کی اجازت دے دی تو فائدہ تو تمہارا بھی ہوا ناں۔" انہوں نے سیاستدانوں والا انداز اختیار کیا تھا اور وہ نہ ہاں کرنے کی پوزیشن میں تھی نہ ناں کرنے کی جرأت رکھتی تھی۔

وہ سب کافی دن سے دادا سے لاہور جانے کی ضد کر رہے تھے مگر کوئی سننے والا نہ تھا، آخر کار انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا اور دادا کے کمرے کے عین سامنے لاؤنج میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے، آخر طاہر القادری کی بھی تو سنی گئی تھی ناں، سو وہ بھی حکومت وقت یعنی میجر ہٹلر کے منتظر تھے آخر وہ کب تک قلعہ بند رہ سکیں گے، تھک ہار کر انہیں مذاکرات کرنا ہی پڑیں گے، احتجاجیوں کے حوصلے بلند تھے، آخر کار میجر اللہ بخش کمرے سے برآمد ہوئے جن کا خفیہ نام میجر ہٹلر رکھا گیا تھا، ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں اس گھر میں اکٹھے رہتے تھے اور کل ملا کر سب بچے بیس، پچیس بن جاتے تھے سو پیسے دے کر احتجاجی افراد خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، یہ خود کفیلی ان کو بہت عزیز تھی، کیا ہوا جو ان میں سے تین لوگ چار بار بی اے کر چکے تھے، یا دادا کی نظر میں اناج کے دشمن تھے صرف ایک جگنو ان کی لاڈلی تھی۔

☆☆☆

"یہ تھا میجر اللہ بخش کی عدالت اعلیٰ کا منظر۔"

عدالت لگ چکی تھی اور سب لوگ جج صاحب کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے، اگرچہ وکیل نے پرزور دلائل کے ذریعے جج کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ احتجاجیوں کے مطالبات کچھ زیادہ ناجائز بھی نہیں ہیں بلکہ ان کو مان کر

مفاہمت کی صورت نکالی جا سکتی ہے جس کا سراسر فائدہ لیڈر آف دی ہاؤس کو ہوگا، کچھ نہ کچھ سفارشات پارلیمنٹ ممبران کی جانب سے بھی پیش کی گئی تھیں، چند ایک کا خیال تھا بغاوت کی تحریک کو سختی سے کچل دینا چاہیے جبکہ چند کے نزدیک یہ ایک معصومانہ کوشش تھی، جس کا مان لیا جانا اتنا نامناسب بھی نہیں تھا۔

"ہاں بھئی حیدر میاں! تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟" میجر صاحب نے گفتگو کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔

"کام کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟" علی نے پاس بیٹھی جگنو کو چپکے سے کہنی رسید کی تو اس نے گھور کر دیکھا، اس کی یہ فضول راگنی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور زیادہ قصور اس کا بھی نہیں تھا، اس کی سمجھ، عمر میں اس سے بھی چھوٹی تھی۔

"کیا مطلب؟" اس کی ننھی سمجھ نے نہیں سمجھایا تھا تو علی سے پوچھا۔

"دادا جو کہہ رہے ہیں کام چل بھی سکتا ہے تو ٹانگیں تو ہوں گی ناں؟" یہ ساری گفتگو سرگوشیاں میں جاری تھی، اس بھیں بھیں کے راگ پر اسامہ نے پلٹ کر گھورا تو دونوں سیدھے ہو گئے۔

"جی دادا جان کام بہت اچھا چل رہا ہے بلکہ سیزن کے بعد اب میں تو فارغ ہوں، کام احمد اور طاہر نے سنبھال رکھا ہے۔" انہوں نے ملازمین کے نام لئے اور کام میں حرج ہونے کا جواز پیدا ہونے سے بھی پہلے مٹا ڈالا۔

"دادا جان پلیز جانے دیں ناں، اللہ تعالیٰ آپ کو خوب ایصال ثواب دے گا۔" جگنو کی سمجھ ننھی ہونے کے ساتھ اردو کے ساتھ تعلق بھی کافی نازک تھا مگر اسے بھاری بھر کم الفاظ یاد کرنے اور موقع کے عین خلاف استعمال کرنے کا بھی جنون تھا۔

"ایصال ثواب" کے لفظ پر دادا جان ہی نہیں، محفل میں موجود سب لوگ اسے گھورنے لگے تھے، وہ سٹپٹا گئی۔

پھر براہ راست مذاکرات کا ارادہ کرتے ہوئے وہ اٹھ کر ان کے تخت شاہی کی جانب بڑھی، اس چھ قدم کے فاصلے پر وہ صرف علی سے ٹکرائی، شانی کے پاؤں پہ پاؤں رکھا اور حذیفہ کا ہاتھ پاؤں تلے کچلا اور دادا جان تک پہنچ گئی، غصہ تو سب کی نظروں سے عیاں تھا مگر اجتماعی مفاد کی خاطر سب نے اس کو میٹھا شربت سمجھ کر غٹا غٹ چڑھا لیا، وہ جانتے تھے کہ جگنو معرکہ سر کرا کر ہی لوٹے گی، وہ دادا کے کان میں گھسی ہوئی تھی۔

"دادو ہمیں پلیز جانے دیں ورنہ آپ کو پتہ ہے جو آپ کے پلنگ کے نیچے بکس رکھا ہوا ہے اس میں کریم بسکٹ ٹافیاں اور چاکلیٹس پہ چھاپہ بھی پڑ سکتا ہے اور وہ جو آپ چھپ چھپ کے بھابھی سے میٹھی چائے بنوا کر پیتے ہیں، وہ پھپھو اور ابو لوگوں کو پتہ لگے گا تو ان کو کتنا دکھ ہوگا کہ ان کے ابا کتنے بگڑ گئے ہیں۔" دادا کی لاڈلی پوتی جتنے معصوم انداز و اطوار رکھتی تھی، اتنی ہی اندر سے امریکیوں والی خصلتیں پائی تھیں، ایک لمحے میں دادا کا چہرہ کئی رنگ تبدیل کر گیا، پھر ضبط کا دامن زور سے پکڑتے انہوں نے بلیک میلر کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا، وہ خود بھی ان کے ساتھ مل کر سب چیزیں اڑاتی تھی مگر اب مکار لومڑی کی طرح آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی تھیں، ان کی واحد کمزوری شوگر تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا میٹھے کا شوق چھپ چھپ کر پورا کرتے تھے جس کی بناء پہ یہ دن انہیں دیکھنا پڑا تھا، انہوں نے حاضرین پہ نظر ڈالی، سب ہمہ تن خرگوش تھے (خرگوش اس لئے تا کہ لمبے کانوں سے وہ جلد از جلد خوشی کی خبر سن سکیں)۔

"چلو ٹھیک ہے مگر تم لوگ اکیلے نہیں جاؤ گے......" ابھی ان کی بات ادھوری تھی کہ اسامہ نے اپنی مداخلت ضروری سمجھی۔

"نانا جی! ہم اکیلے نہیں سارے مل کے جائیں گے۔" جواب میں بس ایک سخت گھوری تھی، اس نے نہ منہ پر پورا ہاتھ رکھ لیا۔

"ایک ہفتہ کے لئے چلے جاؤ، فیضان اور عظمیٰ تم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔" انہوں نے چھوٹے بیٹے اور بہو کا نام لیا۔

"یاہو، دادا جان زندہ باد۔" سب نے مشترکہ نعرہ لگایا تھا۔

☆☆☆

"دادا آپ نے قائداعظم کو دیکھا کبھی؟" شانی جیسے دانشور بچے کی پسندیدہ شخصیت قائداعظم تھی لہٰذا وہ ہر وقت دادا جان سے ایسی معلومات اکٹھی کرنے میں لگا رہتا تھا جو کسی بھی طرح اس کے لئے نئی ہو۔

"جی بیٹا تب میں چھوٹا سا تھا تو لاہور کے جلسے میں ابا اپنے ساتھ وہاں لے کر گئے تھے، مجھے اتنا تو نہیں پتہ تھا کہ سیاست کیا ہوتی ہے اور پاکستان کیا ہوگا مگر میرے لئے یہ ہی فخر کی بات تھی کہ ابا نے مجھے کندھے پر بٹھا کر اپنا پسندیدہ لیڈر دکھایا تھا اور میں بہت دن سب کو فخر سے یہ ہی بتاتا رہا تھا۔" وہ دلکش ماضی میں کھو گئے۔

"دادا میرا دل کرتا ہے کاش میں بھی آپ جتنا ہوتا پھر میں بھی قائداعظم کو دیکھتا۔" شانی کے لہجے میں حسرت تھی۔

"دادا جب ہم لاہور گئے تھے ناں تو میں نے مینار پاکستان پہ جا کر قائداعظم کو سلام بھی کیا تھا، وہ وہیں پر بیٹھے تھے ناں۔" شانی نے تصدیق چاہی تھی۔

"جی میرے شیر۔" انہوں نے اسے گود میں بٹھا لیا تبھی زوردار دھماکے سے دروازہ کھلا تھا اور جگنو بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو دادا جان سمجھ گئے کہ کوئی شرارت کر کے آئی ہے۔

"دادا جان مجھے بچالیں، وہ علی مجھے مارے گا۔" اس نے ان کے وجود کا سہارا لیا، انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے بٹھا لیا۔

"تم نے کیا الٹا کام کیا ہے؟ پہلے مجھے وہ بتاؤ۔" انہوں نے گھورا۔

"میں نے تو کچھ نہیں کیا دادو۔" وہ منمنائی پھر حوصلہ کیا۔

"وہ مجھے ریموٹ نہیں دے رہا تھا تو میں نے بھی پھر ٹھنڈا پانی ڈال دیا اس پہ، یہ سزا ہے اس کی۔" اس کی اپنی عدالت تھی جس میں وہ خود وکیل، خود جج اور خود تفتیش کنندہ تھی۔

"دادا اس موٹی نے پتہ ہے کیا، کیا ہے میرے ساتھ۔" اندر آتے علی نے شکایت لگانا چاہی مگر اس کی باہر لٹکتی زبان دیکھ کر اور تپ گیا، دادا نے اسے بھی پاس بٹھا لیا۔

"چلو جگنو سوری کرو بھائی سے؟" اور بھائی اچھل کر رہ گیا تھا، اچھلنے کی وجہ "بھائی" کا خطاب یا کوئی کھلبلی نہیں بلکہ اس چڑیل کے لمبے ناخن تھے جو دادا کے پیچھے سے بہت آرام سے اس کی کمر کو دلاسہ دے چکے تھے، وہ شکایت لگانے ہی والا تھا کہ وہ "سوری بھائی" کہہ کر منہ چڑاتی باہر بھاگ گئی، علی کو اس کے بھاگنے کی وجہ سمجھ آئی تو وہ خود بھی پیچھے بھاگا، آخر ریموٹ پر قبضہ بھی تو کرنا تھا اور موٹی کی شکایت لگانے کے لئے وہ ریموٹ جلدی میں ٹیبل پر ہی رکھ آیا تھا۔

ابھی کامن روم میں جنگ کے آثار مکمل طور پر نمودار نہیں ہوئے تھے کہ دادا نمودار ہو گئے لہٰذا وہ دونوں انسانیت کے کپڑے مکمل طور پر پہنتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، ساتھ ہی ہاتھ بڑھا

کر ریموٹ ٹیبل پر رکھ دیا گیا تھا، اب ریموٹ کا اختیار دادا جان کے پاس تھا، نہ تو علی سپورٹس چینل لگا سکتا تھا اور نہ ہی جگنو "منال اور خلیل" دیکھ سکتی تھی۔

اتنا بڑا گھر ہونے کے باوجود ان کے ہاں ٹی وی الگ کمروں میں نہیں رکھا گیا تھا بلکہ بڑے ہال نما کمرے میں سب بیٹھ کر ساتھ دیکھتے تھے، یہ بھی دادا جان کے اصولوں میں سے ایک تھا، اب دادا کو نیوز چینل لگاتے دیکھ کر وہ کھسکنے لگے۔

ناظرین ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ دہشت گردوں کے راکٹ حملے سے قائد ریذیڈینسی زیارت میں آگ لگی جس کے باعث ان کے استعمال میں رہنے والی تمام اشیاء جل کر راکھ ہو گئی ہیں، حملے کی ذمہ داری بی ایل اے نے قبول کر لی ہے، حکومت نے ریذیڈینسی کی دوبارہ تعمیر کرانے کا اعلان کیا ہے؟ خبر تھی یا کوئی بم پھٹا تھا، وہ جہاں تھے وہیں ساکت رہ گئے، دادا کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھٹی تھیں تو جگنو اور علی کو ہر لڑائی بھول گئی تھی، اس سکتے کو شانی نے توڑا۔

"دادا اگر قائداعظم وہاں ہوتے تو وہ بھی جل جاتے......؟ شکر ہے قائداعظم وہاں نہیں تھے، پہلے ہی اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔" شانی کا یہ سوال، یہ خیال ایک آٹھ سالہ بچے کی رائے نہیں، اس ملک کے باسیوں کے منہ پر تھپڑ تھا، جو لوگ اپنے بانی کی یادیں نہیں سنبھال سکتے وہ ایک قوم بن کر ان کے دیئے پاکستان کا خیال کیسے کریں گے۔

"نہ میرے چاند، ایسا نہیں کہو، اللہ سزا دے گا ان کو جنہوں نے یہ سب کیا ہے۔" دادا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

اغیار کی سازش سے دل و جاں کے علاوہ
خود میرے مورخ کا قلم ہانپ رہا ہے
ظالم کے مظالم کا کوئی فیصلہ یا رب
مظلوم کی چیخوں سے فلک کانپ رہا ہے

"یہ قوم ہے ہی احسان فراموش، اپنے ہر محسن کو یہ خود مار ڈالتی ہے، قائداعظم بھی انگلینڈ جا کے بس جاتے، عیش کرتے، کیا ملا انہیں؟ ایسا پاکستان چاہا تھا انہوں نے؟ اگر وہ آج ہمیں دیکھ لیں تو پچھتائیں، کن کے لئے زندگی قربان کر دی انہوں نے، جو یادیں بھی نہیں سنبھال سکتے۔" علی کی آواز میں تلخی، دکھ، تاسف، شرمندگی اور نہ جانے کیا کچھ تھا، جگنو دادا کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئی اور سر ان کے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"دادا ہم قیامت کے دن قائداعظم کو کیا منہ دکھائیں گے؟ کتنے برے لوگ ہیں نا ہم، کتنا بڑا احسان کیا تھا انہوں نے اور ہم؟ بلوچی، پنجابی کو مار رہا ہے اور سندھی پختون کو گالیاں دے رہا ہے، ہم تو ریوڑ بن گئے ہیں دادا، ہم قوم کہاں ہیں؟ ہم پاکستانی کہاں ہیں؟ پاکستان توڑ دیا ہم نے۔" آنسو بے دریغ چلے آ رہے تھے۔

"میرے بچو، تم لوگ ہو ناں، ہمارا کل، پاکستان کا مستقبل، ماں جب کمزور اور بوڑھی ہو جائے تو کیا اسے چھوڑ دیتے ہیں؟ ہماری ساری امیدیں اب تم سے ہیں۔" سب ان کے گرد آ کر بیٹھ گئے تھے، ابھی پاکستان زندہ تھا، امید زندہ تھی۔

ہے شوق دل و جاں میں سلامت تو سمجھنا
سازش کی کوئی شاخ نہ پھولی نہ پھلی ہے
بارود کی آندھی میں سنبھالے ہوئے رکھنا
اس دیس کی ہر شمع جو مشکل سے جلی ہے

☆☆☆

شگفتہ شاہ

"مرد کبھی بھی باوفا نہیں ہو سکتے، بظاہر سیدھے سادھے نظر آنے والے مرد حضرات بھی صرف ایک عورت تک محدود نہیں رہتے ہیں، فقط موقع چاہیے پھر وہ اس موقعے ملنے پر اور کچھ نہیں تو دوستی یا وقت گزاری ہی کر لیتے ہیں۔"

کالج کے اسٹاف روم میں لیکچررز کے ایک گروپ میں "مردوں کی نفسیات" پر گرما گرم بحث کے دوران ادم نے اپنی رائے دی تو ثوبیہ نے فقط کچھ لمحوں کے لئے کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تھا اور پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو کر اپنے لیکچر کی تیاری میں مگن ہو گئی تھی، حیرت انگیز بات تھی کہ وہ خود نفسیات کے مضمون کی لیکچرر تھی مگر اس نے اس بحث میں بالکل بھی دلچسپی نہیں لی، ادم کے خیالات سن کر بحث کرنے

ناولٹ

والے گروپ میں شامل ایک سینئر لیکچرر مسز انور نے غصے سے کہا۔

"تم نئی نسل کی لڑکیاں چار لفظ پڑھ کر خود کو بہت عالم فاضل سمجھنے لگتی ہو اور ہر بات میں صرف اپنے آپ کو ہی صحیح سمجھتی ہو، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے اور تم تو شادی شدہ مردوں پر بہت زیادہ الزام لگا رہی ہو تو میں بتاؤں کہ مردوں کی اکثریت اپنی بیویوں سے وفادار ہوتی ہے البتہ کچھ مخصوص شعبوں سے وابستہ لوگ رنگین مزاج ہوتے ہیں مثلاً ادیب اور شاعر حضرات یا میڈیا سے وابستہ لوگ کسی حد تک عاشق مزاج بھی ہوتے ہیں جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے اردگرد حسین لڑکیوں کا جھمگھٹا رہتا ہے، میں یہ بھی مانتی ہوں کہ شاید سے پہلے لڑکے عشق وغیرہ یا وقت گزاری کے چکروں میں پڑتے ہیں مگر شادی کے بعد جب گھریلو ذمے داریوں میں پڑ جاتے ہیں تو وہ بھی ذمے دار بن جاتے ہیں اور اچھی شادی شدہ زندگی گزارتے ہیں اور اپنی

بیویوں سے کے وفادار رہتے ہیں۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ گھر کی ذمے داریاں نہیں نبھاتے اور بیویوں سے باوفا نہیں ہوتے مگر موقع ملے تو کسی لڑکی سے دوستی ضرور کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے ارم زور زور سے ہنسنے لگی تو مسز انور اور بھی تپ گئیں کیونکہ ان کی ہر بات انور صاحب سے ہی شروع ہوتی اور انور صاحب پر ہی ختم ہوتی تھی کہ محترمہ خاصی شوہر پرست خاتون تھیں اور حسب معمول انور صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مجھے تو اپنے شوہر پر پورا بھروسا ہے، انہیں ایک تو کیا دس حسین لڑکیاں بھی ملیں تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے، وہ تو بینک میں ہیں اور آج کل تو بینک میں ایک سے ایک نوجوان اور اسمارٹ لڑکیاں نوکری کرتی ہیں اور بڑے عہدے پر ہونے کی وجہ سے وہ ان کے آگے پیچھے بھی پھرتی ہیں مگر مجال ہے جو وہ کسی سے فری ہوں۔"

"دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کسی نے لفٹ نہیں کرائی ہو گی۔" ارم نے کہا تو دوسری لیکچررز ہنسنے لگیں، بس پھر کیا تھا مسز انور اور ارم کے بیچ شرط لگ گئی کہ ارم کے بقول کہ وہ ایک مہینے کے اندر انور صاحب سے دوستی کر کے انہیں ان کا اصلی روپ دکھا دے گی تو مسز انور نے انتہائی طنزیہ مسکراہٹ سے ارم کو دیکھتے ہوئے انور صاحب کا موبائل نمبر ارم کے دے دیا، تھوڑی دیر میں بحث ختم ہوئی تو ارم ثوبیہ کے قریب آئی تو ثوبیہ نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے پھر کیا کھیل شروع کر دیا؟ ارم آخر تم یہ بچپنے والی حرکتیں کب چھوڑو گی، اب تم ایک کالج لیکچرر ہو اب تو میچور ہو جاؤ۔"

"ارے ہم تو زندگی انجوائے کرتے ہیں، تمہاری طرح تھوڑی ہوں کہ فقط سارا وقت پڑھنے اور پڑھانے میں گزار دوں۔" اتنے میں نئے پیریڈ کی بیل ہوئی تو ارم اپنے نوٹس کا فائل اٹھا کر کلاس لینے کے لئے اٹھی اور حسب معمول اپنا موبائل فون ثوبیہ کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

"آج ابھی تک عرفان کی کال نہیں آئی ہے مگر وہ کسی بھی وقت کال کر سکتا ہے، اگر اس دوران وہ کال کرے تو اس سے کہہ دینا کہ پیریڈ ختم ہونے کے بعد کال کرے۔"

ثوبیہ اور ارم بہت اچھی سہیلیاں تھیں، کچھ عرصہ پہلے دونوں ایک ساتھ ہی اس کالج میں اپائنمنٹ ہوا تھا، دونوں کے مزاج اور عادتوں میں بہت فرق ہوتے ہوئے بھی ان کی بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی، ثوبیہ خوش شکل اور خوش لباس تھی اور مزاج میں سنجیدگی تھی جبکہ ارم بھی خوبصورت اور ماڈرن تھی، شولڈر تک اسٹائلش ہیر کٹ اور نت نئے لباس اور فیشن اسے اور بھی خوبصورتی بخشتے اور وہ ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والی بے حد زندہ دل لڑکی تھی، ثوبیہ سے زیادہ کوئی بھی نہیں جانتا ہو گا کہ بظاہر لاپرواہ اور ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والی لڑکی ارم بے حد پر خلوص اور ٹوٹ کر چاہنے والے لوگوں میں سے تھی اور اپنی زندگی میں شامل رشتوں سے بے انتہا پیار کرنے والی اور کمیٹڈ لڑکی تھی پھر چاہے اس کے ماں باپ، بہن بھائی ہوں یا پھر عرفان اور ثوبیہ، وہ ان سب کے لئے جان دینے کے لئے بھی تیار رہتی تھی، عرفان اس کا چچا زاد کزن تھا جو اسکالر شپ ملتے ہی لندن چلا گیا تھا، وہ اور ارم ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے مگر کچھ خاندانی رنجشوں کی وجہ سے عرفان کے ماں باپ

ارم کو بہو بنانے پر راضی نہ تھے گو کہ اختلافات بڑوں کے تھے، عرفان نے لندن جاتے وقت ارم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ واپس آ کر اپنے والدین کو منا لے گا، تب تک ارم اس کا انتظار کرے اور ارم نے مرتے دم تک اس کا انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب موبائل فون عام نہیں تھے، اس لئے عرفان نے لندن سے ارم کے گھر کے لینڈ لائن فون پر کالز کیں تھیں مگر آس پاس دوسروں کی موجودگی یا دوسروں کے کال اٹینڈ کرنے کی وجہ سے ان دونوں کی صحیح طرح بات نہیں ہو پاتی تھی تب عرفان نے ارم کو سیل فون لینے کا مشورہ دیا تھا تا کہ وہ کالج ٹائم میں ایک دوسرے سے بات کر سکیں، تب ارم نے ایسا ہی کیا مگر وہ کالج ٹائم میں ہی کھل کر بات کر سکتے تھے گھر پر نہیں کیونکہ گھر والوں کو اسے موبائل فون کا علم نہیں تھا، ارم کے گھر والے تنگ نظر نہیں تھے مگر جب تک عرفان واپس آ کر اپنے والدین کو منا کر ارم کے رشتے کے لئے انہیں ارم کے گھر نہیں بھیجتا تب تک وہ گھر والوں کو کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔

موبائل فون کی رنگ ٹون بجنے لگی تو ثوبیہ چونک گئی اور اس نے کال اٹینڈ کی، ظاہر ہے کہ عرفان کے علاوہ کس کی کال ہو سکتی تھی، ثوبیہ نے اسے بتایا کہ اس وقت ارم کلاس لے رہی تھی اس لئے وہ آدھے گھنٹے بعد فون کرے، کال ڈس کنیکٹ ہوئی تو اس کے دل میں بے اختیار دعا نکلی کہ اللہ پاک ان کے والدین کے دلوں اور ذہنوں سے رنجشیں دور کرے اور ان کے مسائل جلد حل ہوں تا کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے، کاش ماں باپ اپنی انا پرستیوں کی وجہ سے ایسا ماحول نہ بنائیں کہ ان کی اولاد ان دونوں کی طرح چور دروازے استعمال کریں بلکہ عزت و آبرو کے ساتھ مذہبی اور قانونی تقاضوں کے مطابق ایک دوسرے کے مذہبی اور قانونی تقاضوں کے مطابق ایک دوسرے کے زندگی بھر کے رفیق بن جائیں۔

☆☆☆

دوسرے دن ثوبیہ کو ارم نے بتایا کہ مسز انور سے شرط جیتنے کے لئے اس کو ایک اور موبائل سیٹ اور نئی سم لینی پڑی، کیونکہ وہ اپنے نمبر سے ان سے بات نہیں کر سکتی تھی کہ کہیں یہ مذاق آگے چل کر اسے مہنگا نہ پڑ جائے، ثوبیہ نے ملامت بھرے انداز سے اسے کہا۔

"ارم! تم فقط کچھ دنوں کی تفریح کی خاطر اتنے پیسے خرچ کر رہی ہو، پھر نیا موبائل اور پھر کتنے ہی کارڈ خرید کرو گی۔"

"ارے یار......!" ارم نے سدا کے لاپرواہ اسٹائل میں کہا۔

"تم جانتی ہو میری فیملی کو، میرے گھر والوں کو، میری تنخواہ کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ضرورت سے بھی کچھ زیادہ دے دیا ہے نہ ہی میں تمہاری طرح شادی شدہ اور بال بچوں والی ہوں اگرچہ میاں صاحب آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لیتے پھر بھی تم اپنے گھر اور بچوں پر اپنی خوشی سے خرچا کرتی ہو، پھر عیش کیوں نہ کیے جائیں، اور ہاں بالکل نیا اور اچھی کمپنی کا موبائل سیٹ ہے، شرط جیتنے کے بعد یہ موبائل سیٹ میں تمہیں گفٹ کر دوں گی، تم سے تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں مگر تم سیل فون خریدتی ہی نہیں، ارے اتنے مزے مزے کے ٹیکسٹ اور پکچر میسیجز ہوتے ہیں اور بھئی چیٹ کرنے کا مزا اور ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ مجھے ان چیزوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے ورنہ، کاشان نے مجھے کتنی ہی مرتبہ سیل فون لے کر دینے کے لئے کہا مگر میں

نے خود منع کر دیا۔" ثوبیہ نے کہا۔
"تم پتا نہیں کیوں اتنی دقیانوسی ہو، ارے سیل فون صرف فیشن اور مزے کے لئے نہیں لیا جاتا مگر آج کل کے دور میں یہ ایک بہت بڑی ضرورت بھی ہے، خاص طور پر ان لڑکیوں اور خواتین کے لئے جو پڑھنے اور جاب کے سلسلے میں اکثر اوقات گھر سے باہر وقت گزارتی ہیں، موبائل کی وجہ سے وہ ہر وقت اپنے گھر والوں سے رابطے میں رہتی ہیں، چیزیں اچھی یا بری نہیں ہوتیں مگر ہمارا چیزوں کو اچھے یا برے مقصد کے لئے استعمال کرنا انہیں اچھا یا برا بناتا ہے، دیکھو ثوبیہ، مجھے احساس ہے کہ میں گھر والوں کو بتائے بغیر عرفان سے موبائل پر رابطہ رکھے ہوئے ہوں، اگر وہ ضد نہ کرتے اور ہماری منگنی کر دیتے تو اس وقت مجھے چھپ کر یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا کیونکہ اس وقت وہ پردیس میں ہے اور اسے میرے پیار اور حوصلے کی ضرورت ہے اور ہم آگے چل کر ان شاء اللہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے، ہم فلرٹ یا کوئی غلط کام نہیں کرتے ورنہ وہ میرا کزن ہے، خاندان کے اکثر فنکشنز میں ہم ملتے رہتے ہیں اور اگر کوئی غلط قدم اٹھانا ہوتا تو کب کا اٹھا چکے ہوتے اور پتا ہے SMS صرف مزے کے لئے نہیں کیے جاتے، مختصر Text میسج میں کم پیسوں میں بہت اہم معلومات اور ہم سے دور رہنے والوں کی خیر خیریت معلوم ہو جاتی ہے، اب یہی دیکھ لو کہ میرے اور عرفان کے فقط ایک مختصر پیغام سے ہمارے درمیان سمندر کی دوری بھی سمٹ کر رہ جاتی ہے۔"
"توبہ ہے ارم بھئی تم نے تو اچھا خاصا لیکچر دے دیا، چلو میں بھی قائل ہو گئی اب تو....." ثوبیہ نے کہا۔
یوں ارم نے ثوبیہ کو سیل فون استعمال کرنے کا طریقہ سکھایا اور ٹیکسٹ میسج کرنا بھی، اب اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ جب ارم کلاس میں ہوتی تھی اور اس دوران عرفان کا فون آتا تھا تو اس کے پیسے کی بچت کی خاطر ثوبیہ کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی مگر ارم کا دیا ہوا پیغام ٹیکسٹ کر دیتی تھی۔

☆☆☆

کافی دن گزر گئے جب ایک دن ارم نے ثوبیہ کو بڑے مزے لے لے کر بتایا کہ شروع میں نخرے کرنے کے بعد اب جب بھی ارم مسٹر انور کو کال کرتی ہے تو اب وہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے اور کافی دیر اس سے بات کرتا ہے، ارم نے یہ بھی بتایا کہ جب اس نے مسز انور کو یہ سب کچھ بتایا تو وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔
"یار! ثوبیہ اب تو وہ بڑی بے تابی سے میری کالز کا انتظار کرتا ہے اور کئی بار ملنے کا کہہ چکا ہے۔" اس کی یہ بات سن کر ہنسنے کی بجائے ثوبیہ بے حد سنجیدہ ہو گئی اور کہا۔
"ارم! بری بات ہے، کسی کے گھر کے ماحول کو اس طرح خراب کرنا بے حد اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے اور اس طرح اس پر مزہ لینا تو اور بھی برا ہے۔"
"دیکھو ثوبیہ مجھے الزام مت دو، مسز انور نے خود یہ شرط رکھی تھی اور خود ہی اس کا سیل نمبر دیا تھا، اسے تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں اسے اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لا رہی ہوں ان کو اپنے میاں صاحب پر جو اندھا اعتماد ہے تو میں تو انہیں ان کی اصل صورت دکھا رہی ہوں۔"
ثوبیہ کو بہرحال ارم کی اس حرکت سے دکھ ہو رہا تھا، شاید اس لئے بھی کہ آج کل اس کی اپنی ازدواجی زندگی کی کشتی حالات کے طوفان میں گھر کے بیچ دریا، زندگی میں ڈول رہی تھی اور وہ اسے

سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

☆☆☆

ثوبیہ کو کاشان کے کراچی سے آنے کا بڑی بے تابی سے انتظار تھا کیونکہ آج ویک اینڈ تھا، جب سے کاشان کا تبادلہ حیدر آباد سے کراچی کی برانچ میں ہوا تھا، پہلے پہل تو کئی ہفتوں تک وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آتا تھا لیکن اب چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا کہ اب یا تو وہ پندرہ دن بعد اور کبھی تین ہفتوں بعد حیدر آباد آتا تھا، پھر وہ سوچنے لگی تو اس سارے معاملے میں اصل قصور وار کون تھا؟ خود وہ یا کاشان؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتی مگر وہ سمجھ نہ پاتی تھی، اب تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر گزرنے والا نیا دن اس کے اور کاشان کے بیچ میں فاصلے بڑھا رہا تھا، دونوں کے بیچ اجنبیت کی ان دیکھی دیوار پتا نہیں کب سے بن بھی چکی تھی، آج کالج سے آنے کے بعد اس نے دو تین بار کاشان کے آفس فون کیا مگر وہ آفس میں نہیں تھا، اس کا سیل فون بھی بند تھا، شام تک وہ بار بار کوشش کرتی رہی مگر بے سود تھا، آخر کار رات ہونے کو آئی تو اس امید پر کہ آج وہ آ جائے گا، اس نے کاشان کی پسندیدہ ڈشز تیار کیں، آج تو اسے اس کا بے انتہا انتظار تھا یا شاید کوئی بے کلی کا احساس تھا، بچے بھی ٹیوشن سے آنے کے بعد اب فارغ تھے اس لئے ٹی وی پر کارٹون فلم دیکھ رہے تھے، ثوبیہ نے پھر کاشان کے موبائل پر کال کی جو اس مرتبہ ریسیو ہوئی تو وہ بے تابی سے بولی۔
"کاشان تم آ رہے ہو نا؟"
"نہیں۔" اس کا لہجہ بے رخی سے بھرپور تھا۔
"آج شام آفس میں دیر تک بہت ضروری کام تھا جو اپ ڈیٹ کرنا تھا اور اب اس قدر تھک چکا ہوں کہ رات کے وقت لانگ ڈرائیو کی ہمت ہی نہیں مجھ میں۔" اس کا لہجہ تھکن سے چور تھا، گمبھیر اور خوبصورت بھی۔
"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ثوبیہ نے پریشان ہو کر کہا۔
"وہ تو کافی دنوں سے ایسی ہے اور تمہیں پتا بھی ہے۔" وہی روٹھا روٹھا لہجہ اور کچھ بیزار سا، وہ کچھ کہہ نہ پائی حالانکہ دل میں تو بہت کچھ تھا کہنے کو، کاشان نے پھر بچوں کی اور امی ابو (ثوبیہ کی ساس اور سسر) کی خیریت معلوم کی اور فون بند کر دیا۔
ثوبیہ تو پچھلے پانچ چھ مہینے سے یہی صورتحال برداشت کر رہی تھی مگر آج کل پتہ نہیں کیوں صورتحال کی سنجیدہ نوعیت کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی شاید اس لئے کہ آج کل ارم جب انور صاحب سے کی ہوئی گفتگو کا ایک ایک جملہ اسے سناتی تو اس کے اندر کہیں بازگشت سنائی دیتی تھی ہر وقت کہ "مرد ہمیشہ بے وفا ہوتا ہے۔"
اس رات بچوں کو دادا دادی کے کمرے میں سلا کر وہ اپنے بیڈ روم میں آئی اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی تو اسے لگا کہ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، پہلو بدلتے بدلتے رات گہری ہوتی گئی تو ماضی کی خوبصورت یادوں کے دریچے اپنے آپ وا ہوتے گئے اور اس کی آنکھوں میں وہی منظر آتے گئے، حسین اور بیش قیمت۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران کسی فنکشن میں اس کی اور کاشان کی ملاقات ہوئی تھی، ملاقات رسمی تھی اور گو کہ دونوں کے ڈپارٹمنٹ الگ الگ تھے پھر بھی قسمت نے ان کو زندگی بھر کے لئے ہمسفر بنانا تھا تو ان کی اور بھی ملاقاتیں ہوئی جو پسندیدگی اور پھر انڈر اسٹینڈنگ اور پھر

محبت میں بدل گئیں، یوں تعلیم کے وہ ماہ و سال جیسے پل بھر میں گزر گئے، کاشان کو جیسے ہی ایک اچھی جاب ملی اس نے اپنے والدین کو ثوبیہ کے گھر رشتے کے لئے بھیجا۔

عرفان کے والدین اپنے اکلوتے بیٹے کی ضد کے آگے ہار گئے اور جب ثوبیہ کو دیکھا اور اس کی فیملی سے ملے تو انہیں اپنے بیٹے کی چوائس پسند آئی ارم کی فیملی کے برعکس ثوبیہ اور عرفان کی محبت میں کوئی دیوار حائل نہیں ہوئی اور وہ دلہن بن کر عرفان کے گھر آگئی، کتنی خوش نصیب تھی کہ جسے چاہا وہ ہی اسے ملا اور وہ بھی تو اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا، پھر امی اور ابو کی محبتوں نے تو اس کی زندگی اور بھی خوبصورت بنادی اور وہ تو اپنے رب کے آگے سربسجود ہوئی کہ کیا کچھ اسے نہ دیا تھا اس نے، امی ابو تو ویسے بھی بیٹی کے لئے تڑپ رہے تھے مگر خدا کو انہیں بہو کی صورت میں بیٹی دینی تھی، پھر وہ دو پیارے بچوں کی ماں بنی، پہلے بیٹا، پھر بیٹی تو اس کی فیملی مکمل بن چکی تھی اور ان کا گھر جنت سے کم نہ تھا، یہ سب کچھ تو اپنی جگہ پر تھا مگر جس طرح شادی سے پہلے اکثر لڑکے لڑکیاں جب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو اپنی ملاقاتوں میں مستقبل کے خوبصورت خوابوں کو لفظوں میں بنتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بیقراری، پیار اور خلوص کے جذبے نچھاور کرتے ہیں مگر شادی کے بعد جو سب سے بڑی حقیقت سامنے آتی ہے وہ ایک دوسرے کے مزاجوں اور طور طریقوں سے آگاہی کی ہوتی ہے، کاشان ٹھنڈے مزاج کا شخص تھا جبکہ ثوبیہ بہت جذباتی اور غیر پختہ مزاج کی تھی، کاشان کبھی بھی جھگڑا کرتا ہی نہ تھا، اگر کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا تو خاموش رہ کر بردباری کا مظاہرہ کرتا جبکہ ثوبیہ غصے پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی اور اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑ پڑتی تھی اور بغیر سوچے سمجھے کچھ کچھ کہہ دیتی تھی اور ایسے موقعوں پر جوابی کاروائی کرنے کے بجائے کاشان کمرے سے نکل جاتا تھا، جب ثوبیہ کا غصہ اترتا تو اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد کر کے شرمندہ ہو جاتی تھی اور دل ہی دل میں کاشان کی برداشت کو داد دیتی تھی۔

دونوں کے مزاجوں میں ایک دوسرا واضح فرق بھی شادی کے بعد سامنے آیا تھا، کاشان بے حد نفیس انسان تھا، کھانے پینے سے لے کر ڈریسنگ، چیزوں کی ترتیب اور گھر کی سجاوٹ کا دلدادہ تھا، جبکہ ثوبیہ مزاجاً لاپرواہ تھی، خود اپنی چیزیں اور الماری اس قدر بے ترتیب رکھتی تھی کہ کاشان اکثر اس کی اس بات سے اسے ٹوک دیتا تھا، کاشان کو گھر میں اچھا کھانا کھانا پسند تھا، نہ اسے بوا کے ہاتھ کا کھانا اچھا لگتا نہ وہ زیادہ باہر کھانا پسند کرتا تھا جبکہ ثوبیہ کو کھانا پکانے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، کاشان کی خواہش ہوتی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے لئے کھانے بنائے اور جب وہ تھکا ہارا گھر آئے تو وہ والہانہ طریقے سے اس کا استقبال کرے اور اس کے لئے سجے سنورے، ایک مرتبہ جب اس نے ایسا اظہار کیا تو ثوبیہ نے جو قالین پر بے ترتیب بڑے کشنوں کے بیچ برگر کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی، ہنستے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"لگتا ہے کہ آپ خواتین کے رسالے اور افسانے پڑھنے لگے ہیں جو ان میں دکھائی گئی لڑکیوں کی طرح مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

کاشان نے پھر کبھی ایسی فرمائش نہ کی، اب ان کے بیچ چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہونے لگے تھے، جن کا ایک سبب تھا کاشان کا اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ ٹائم دینا، اکثر شام کو وہ دوستوں کے ساتھ باہر رہتا تھا، جبکہ ثوبیہ چاہتی تھی کہ وہ اسے ٹائم دے اور آؤٹنگ پر لے جائے، جب وہ ایسا شکوہ کرتی تو وہ بھی اس کے بولے ہوئے الفاظ لوٹا دیتا۔

"یہ سب کچھ بھی تو محض افسانوں اور ڈراموں میں ہی ہوتا ہے نا، نہ تو میں افسانوی ہیرو ہوں نہ ہی تم افسانوں اور ڈراموں کی ہیروئن۔"

تب وہ اس کی طرح خاموش نہ رہتی اور جھگڑا کرنا شروع کرتی۔

"تو کیا میں کوئی بیجا خواہش کر رہی ہوں؟ اب تو تمہیں میری برتھ ڈے بھی یاد نہیں رہتی، کیا میری یہ خواہش غلط ہے کہ شادی سے پہلے کی طرح تم اب بھی مجھے اسی طرح وش کرو، مجھ سے پہلے کی طرح محبت کا اظہار کرو؟"

"دیکھو ثوبیہ!" کاشان نے دھیرج سے کہا۔

"شادی سے پہلے ہمارے پاس بہت وقت تھا، ہم اسٹوڈنٹ تھے پھر عمر بھی ایسی تھی، تب ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے تھے تو اک تڑپ اور بے چینی ہوتی تھی، تب ایسی باتیں ہی یاد رہتی تھیں، اب وقت، حالات اور ہماری عمر وہ نہیں رہی، اب ہم ساتھ ہیں، ہمارے بچے ہیں، میری نوکری کی کئی اہم ذمے داریاں ہیں، پھر زندگی کے اس مشینی روٹین میں اب مجھے اہم دن یاد نہیں رہتے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میری محبت میں کچھ کمی آئی ہے، کیا میں نے تمہیں وہ سب کچھ نہیں دیا جو کسی بھی عورت کی چاہ ہوتی ہے، اچھا گھر، اچھا کھانا اور اوڑھنا، اچھا ماحول اور آزادی اور سب سے بڑھ کر محبت، یہ سب کچھ تمہارے لئے ہی تو ہے۔"

تب وہ سدا کی طرح لاجواب ہو جاتی تھی، البتہ دوستوں کو وقت دینے میں کاشان نے بھی کمپرومائز نہ کیا، حقیقت یہ تھی کہ گھر میں کام کرنے والے نوکر چاکر تھے، بچوں کی پرورش اور ذمہ داری دادا دادی نے اٹھائی ہوئی تھی، اسے تو گھر سجانے سنوارنے یا کچن میں سر کھپانے کا کوئی شوق ہی نہ تھا اور اب جبکہ بچے بھی اسکول جانے لگے تھے تو اسے ایسا لگتا کہ اس کا وجود فالتو سا بن کر رہ گیا تھا، پھر اچانک سے اس کے ذہن میں نوکری کرنے کا خیال بری طرح سمایا تو وہ اخباروں میں جاب کے اشتہار وغیرہ دیکھنے لگی اور ایک مرتبہ لیکچررشپ کے لئے اپلائی کر دیا اور اسے وہ جاب مل بھی گئی تو اس نے یہ خوشخبری کاشان کو سنائی تو بجائے خوش ہونے کے اس نے کہا۔

"ثوبیہ! میں روایتی مرد نہیں ہوں جو بیویوں پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں لیکن میری یہ خواہش ہے کہ جاب کرنے کے بجائے تم گھر اور بچوں پر توجہ دو تمہارا معاشی مسئلہ تو ہے نہیں کہ نوکری کرو، سب کچھ ہے تمہارے پاس، آگے تم مرضی کی مالک ہو۔"

"گھر اور بچوں کو کیا ہوا ہے بھئی؟ بچے اب اسکول جانے لگے ہیں اور گھر پر امی ابو ہوتے ہیں اور کام کاج کے لئے نوکر ہیں پھر دن بھر میں بور ہوتی رہتی ہوں، رہی تمہاری خواہش کی بات تو کیا تم نے میری خواہش کے تحت اپنے دوستوں کو وقت دینا چھوڑا آج تک؟ بس میں اپنے ٹیلنٹ اور تعلیم کو کام میں لانا چاہتی ہوں۔"

اس پر کاشان حسب روایت خاموش ہو گیا اور ثوبیہ نے جاب جوائن کر لی، وہ ذہین بھی تھی اور پوزیشن ہولڈر بھی اور وہ مزاجاً گھریلو لڑکی نہیں مگر ورکنگ وومن تھی اس لئے اپنے پروفیشن میں بڑی کامیاب جا رہی تھی اور جلد ہی کالج میں اپنا اہم مقام بنا لیا، ایکٹو بھی بہت تھی اس لئے کالج

کی طرف سے مختلف ورکشاپس اور کانفرنس بھی اٹینڈ کرنے لگی اور پھر خود بھی لیکچرز دینے اور پیپرز پڑھنے لگی، کالج کا کوئی اہم پروگرام ہوا اور اس کی ورکنگ کمیٹی میں ثوبیہ کا نام نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں تھا، ایک طرف تو یہ کامیابیاں تھیں مگر دوسری طرف غیر محسوس طریقے سے اس کے اور کاشان کے درمیان، فاصلے بڑھ رہے تھے مگر اب ثوبیہ اس قدر مصروف ہو چکی تھی کہ وہ یہ سب کچھ محسوس ہی نہ کر سکی، اب تو وہ کاشان کے دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے پہ اس سے جھگڑا بھی نہیں کرتی تھی کیونکہ اب وہ خود بہت مصروف ہو گئی تھی، یوں اس کی زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی، کاشان اور ثوبیہ مشینی زندگی کے مصروف پرزے بن کے رہ گئے تھے، ثوبیہ نفسیات میں ماسٹرز کرنے کے باوجود اس شخص کی نفسیات نہ سمجھ سکی جو اس کا جیون ساتھی تھا اور جس سے وہ بے حد محبت کرتی تھی، ثوبیہ نے اپنا کلینک کھولنے کا فیصلہ کیا، اس مرتبہ کاشان نے اسے منع نہیں کیا یا شاید اب اس نے اس کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا تھا، ثوبیہ ریسرچ سائیڈ پر بھی آ گئی اور نفسیات کے شعبے میں نام پیدا کر لیا۔

زندگی نے پھر اک نیا موڑ اختیار کیا، جب کاشان کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا تب کاشان نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بولی۔

''میں کراچی کیسے چل سکتی ہوں، میری جاب یہاں ہے اور میں یہاں ایک ریسرچ پروجیکٹ پر بھی کام کر رہی ہوں، پھر میری کلینک......''

''اور تمہارے ان وعدوں کا کیا ہو گا جو تم نے میرے ہر دکھ سکھ میں ساتھ دینے کے لئے کیے تھے، تمہیں پتا ہے کہ میں تم سب لوگوں سے الگ نہیں رہ سکتا وہاں۔''

نہ جانے اس وقت ثوبیہ خود غرض بن گئی تھی بے حس کہ اس نے کاشان کی باتوں کا کوئی ا نہیں لیا اور کہا۔

''میں نے پاپا سے بات کی ہے، وہ کہ ہیں کہ تم وہاں جوائن کرو اور کچھ عرصہ جیسے تیـ نکال لو تب تک وہ تمہارا تبادلہ واپس یہاں کر دیں گے، تم ہر ویک اینڈ کو آ جانا، دیکھو نا یہا سب سیٹلڈ ہیں، بچے، امی ابو اور میں۔''

ثوبیہ کے اس جواب پر کاشان کے چہر پر دکھ اور حیرت کا سایہ آ گیا مگر وہ ثوبیہ اور بچو کی وجہ سے وہ امی ابو کو بھی ساتھ نہیں لے جا سک تھا کہ بچوں کو وہی سنبھالتے تھے، کاشان جا کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا اور پھر ایک دو با اسے وہاں اسے ملے ہوئے گھر Possession لینے اور سیٹنگ کے لئے جانا پ اور ثوبیہ تو اپنی مصروفیتوں میں اس قدر مگن تھی ک وہ اس کا کرب اور مایوسی بھی محسوس نہ کر سکی انہوں دنوں میں کاشان کی طبیعت کچھ گری گر سی رہنے لگی، وہ ڈاکٹر کے پاس گیا جس نے ک کہ کام کی زیادتی اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہ تھا باقی تمام رپورٹس نارمل تھیں، ادھر ثوبیہ صاحب آج کل نفسیاتی بیماریوں کے حوالے سے ایک ورکشاپ میں مصروف ہونے کی وجہ سے تقر سارا دن گھر سے باہر رہنے لگی تھی، گھر تو گرو کے حوالے تھا اور بچے امی ابو کے، انہی دنو جب وہ ایک ٹی وی چینل کے ایک پروگرام می شرکت کے لئے تیاری کر رہی تھی، اس د کاشان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور دوائیں لے کر لیٹا رہا تھا مگر بجائے اس کے ک ثوبیہ اس کا خیال رکھتی، اس نے اسے چڑا ہوئے کہا۔

''ارے؟ تم اس قدر کم ہمت کب سے ہ

گئے بھئی؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا ہے تمہیں اور تم ہو کہ یوں ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھے ہو۔''

جبکہ ان کی ننھی پیاری گڑیا سی بیٹی ذونش بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں اس کے لئے پانی کا گلاس لاتی تو کبھی اس کے سر کو دباتی اور فکر مندی سے اس کے سینے پر سر رکھتی تو کاشان کی آنکھوں میں پانی سا بھر آتا اور وہ اسے بھینچ کر سینے سے لگاتا اور پیار کرتا اور کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو چومتا تھا۔

شام تک وہ بہتر ہو گیا اور دوسرے دن سے اسے کراچی آفس جوائن کرنا تھا اس لئے وہ جانے کی تیاریوں میں لگ گیا تب ثوبیہ نے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چل کر کچھ دن وہاں رہوں گی اور گھر کو سیٹ کروں گی اور کک کو ہدایت دوں گی پھر آ جاؤں گی۔''

''بڑی مہربانی، آپ یہ زحمت نہ کریں تو بہتر ہے ویسے بھی گھر کی سیٹنگ میں، میں آپ سے زیادہ ماہر ہوں اور تم سے بہتر گھر کے معاملات کو سنبھال سکتا ہوں، آپ اپنے ریسرچ ورک پر ہی دھیان دیں تو بہتر۔'' کاشان کے لہجے میں بہت طنز اور اجنبیت سی تھی کہ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

دوسرے دن وہ کراچی روانہ ہو گیا، پہلے پہل تو وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آتا تھا تب ثوبیہ بھی اسے توجہ دینے لگی کیونکہ اس کے جانے کے بعد اسے اس کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا، اب اسے اکثر یاد آتا کہ دوستوں کو وقت دینے پر وہ اس سے کس قدر جھگڑا کرتی تھی، مگر لوٹ کر روز وہ اس کے پاس ہی آتا تھا، وہ اپنے پاپا سے ضد کرتی کہ جلد از جلد اس کا تبادلہ کروا دے اپنے تعلقات استعمال کر کے مگر ابھی تک ایسا ہو نہیں پا رہا تھا، ایسے ہی چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا، اب کاشان ہر ویک پر آنے کے بجائے کبھی دو اور کبھی تین ہفتوں بعد آتا تھا اور آتا بھی تو زیادہ تر اکھڑا اکھڑا رہتا، زیادہ وقت امی ابو اور بچوں کے ساتھ گزارتا یا پھر دوستوں کے ساتھ ہوتا، ثوبیہ کی بھی اپنی مصروفیات تھیں، ایک بار اس نے شرارتاً کاشان سے کہا۔

''اب تو تم گھر دیر سے آنے لگے ہو، کہیں کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں پڑ گئے وہاں؟''

''مجھے کسی کے چکر میں آنے کی کیا ضرورت ہے میں تو اتنا ہینڈسم ہوں کہ خود لڑکیاں مجھ سے بات کرنے اور دوستی کرنے کے چکر میں رہتی ہیں۔'' کاشان نے بھی چوٹ کی۔

''آفس میں لڑکیاں ہیں؟''

''ہاں دو تین ہیں مگر خوبصورت صرف ایک ہی ہے اور میرے آگے پیچھے پھرتی ہے، مجھ پر مرتی ہے۔''

''دیکھو کاشان ایسی لڑکیوں سے دور ہی رہا کرو، یہ سیدھا سادھا آدمی دیکھ کر پھانس لیتی ہیں، ویسے نام کیا ہے ان محترمہ کا؟''

''نام میں کیا رکھا ہے، میں وہاں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے بھی تو کمپنی چاہیے نا۔'' ثوبیہ سچ مچ پریشان ہو گئی پھر اس نے کہا۔

''پاپا کوشش کر رہے ہیں بہت جلد تمہارا تبادلہ واپس حیدر آباد ہو جائے گا، ویسے میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں، تم مجھ سے بے وفائی کر ہی نہیں سکتے۔''

''بس اتنا ہی جان پائیں نا؟ اس سے زیادہ تم نے میرے بارے میں جاننا ہی نہ چاہا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔'' کاشان نے دکھ سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس بات کو بھی کتنا ہی عرصہ بیت گیا، کاشان کا تبادلہ نہ ہو سکا، وہ صبح سے شام تک خود کو

آفس کی مصروفیتوں میں گم کر دیتا تھا، ایک دن جب وہ رات دیر تک گھر میں بھی آفس کی فائلوں میں سر کھپا رہا تھا کہ اسے سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں اور اسے لگا کہ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے، گھر پر صرف باورچی اور ایک نوکر تھا، وہ کس سے اپنا حال بیان کرتا؟ اس نے وہ رات تو جیسے تیسے گزار ہی لی اور دوسرے دن مکمل چیک اپ کرایا تو حسب معمول پھر سب رپورٹس نارمل آئیں اور ڈاکٹر نے وہی پرانی بات دہرائی کہ کام کی زیادتی اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس کے حالت ایسی ہوئی ہے، ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کی سختی سے تاکید کی، دواؤں کے زیر اثر وہ صبح دیر تک سوتا رہا اور آفس بھی نہ جا سکا، اس دن وہ بڑا بے چین رہا، شام کو کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد اس نے خود کو کافی بہتر پایا اور اچانک دل میں گھر کی یاد جو سمائی تو اپنے آفس انچارج سے فون پر بات کر کے طبیعت کی خرابی کا بتا کر کچھ دنوں کی چھٹی مانگی اور رات کو ہی حیدر آباد کے لئے کار میں روانہ ہوا، وہ خود کار ڈرائیو کر کے آتا جاتا تھا، ابھی وہ بمشکل آدھا سفر طے کر پایا تھا کہ پھر سے سینے میں شدید ٹیس اٹھنے لگیں اور پسینے آنے لگے اور ہاتھ پاؤں میں کپکپی طاری ہو گئی، پھر اسے لگا کہ وہ کوئی معجزہ ہی تھا کہ باقی راستہ اس نے اسی حالت میں ڈرائیو کرتے ہوئے طے کیا اور کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، اسے یقین تھا کہ اسے کوئی ہارٹ پروبلم تھا مگر ڈاکٹر سمجھ نہیں پا رہے تھے، حیدر آباد آ کر وہ سیدھا گھر آنے کے بجائے وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس چلا گیا جو اسے اس حالت میں دیکھ کر بے حد پریشان ہوا اور اسے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا، جس نے اس کی طبیعت کا پورا حال احوال معلوم کیا اور کراچی میں کرائی گئی رپورٹس دیکھنے کے بعد بولا کہ وہ شدید ڈپریشن اور Anxiety میں مبتلا ہو چکا تھا جس کا واحد حل باقاعدہ دوائیں، ورزش اور مکمل آرام تھا، ڈاکٹر سے فارغ ہونے کے بعد وہ رات دیر سے گھر پہنچا تو اتنی رات گئے اس اچانک دیکھ کر گھر والے حیران بھی ہوئے اور اس کی حالت دیکھ کر پریشان بھی کہ وہ چہرے سے برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اس نے آفس سے دو ہفتے کی چھٹی لی اور دوائیں لیتا رہا اور آرام بھی کرتا رہا، مگر اب جیسے وہ پہلے والا کاشان نہیں رہا تھا، اس کی زندہ دلی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی، تب ثوبیہ کہتی۔

”کاشان! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ دوستوں کے ساتھ وقت گزارو، گھومو پھرو، یاد ہے پہلے میں تمہارے دوستوں کو اتنا وقت دینے پر کتنا چڑتی تھی، مگر اب تمہیں ہر وقت گھر پر اس طرح دیکھ کر پریشان ہوتی ہوں، اب میں خود چاہتی ہوں کہ تم باہر نکلو، امی اور ابو بھی بہت پریشان ہیں تمہاری وجہ سے۔“

”کسی کو بھی میری وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ کاشان نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

کچھ دنوں میں وہ بہتر ہو گیا، چھٹی ختم ہوئی تو وہ کراچی روانہ ہو گیا، مگر اب کی مرتبہ جانے کے بعد ثوبیہ کو اس کی شخصیت میں بے حد تبدیلی محسوس ہوئی، اب تو وہ فون پر بھی بہت کم رابطہ رکھتا تھا اور بڑے دنوں کے بعد گھر آتا، ثوبیہ اسے فون کرتی تو یا تو اس کا سیل فون بند ہوتا یا پھر وہ کال اٹینڈ ہی نہیں کرتا تھا اور جب وہ کال اٹینڈ کرتا اور ثوبیہ اس سے شکوہ کرتی تو وہ ہمیشہ ایسے ہی جواب دیتا۔

”دوستوں کے ساتھ تھا اس لئے کال اٹینڈ نہیں کی۔“

”کام میں مصروف تھا بہت۔“

”موبائل میں کریڈٹ نہیں تھا۔“

”سیل فون گھر بھول آیا تھا۔“ وغیرہ وغیرہ۔

ثوبیہ کا ذہن حالات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا اور وہ اب سوچ رہی تھی کہ آج بھی وہی ہوا، نہ تو کاشان کال ریسیو کر رہا تھا اور نہ ہی خود بتاتا تھا کہ وہ کب آئے گا، رات بہت گہری ہو گئی تھی اور اس کی سوچ بھی آج اس کے دل میں وہ وسوسے آنے لگے جو پہلے کبھی نہیں آئے اس نے کبھی سنجیدگی سے اپنے مسائل اور کاشان کے مسائل پر سوچا ہی نہیں تھا اور اب ارم کی آواز کی بازگشت بار بار اس کے دل اور ذہن کا سکون برباد کر رہی تھی۔

”مرد کبھی بھی ایک عورت تک محدود نہیں رہتے، ایک عورت کے ساتھ وہ رہتے ہیں اور دوسری کی تمنا کرتے ہیں۔“

”مرد بے وفا ہوتے ہیں۔“ وغیرہ وغیرہ۔

اچانک رات کے سناٹے میں بجنے والی تیز موبائل ٹون نے اسے چونکا دیا، آج ارم نے اپنا موبائل اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے گھر والوں سمیت خاندان کی ایک شادی کے فنکشنز اٹینڈ کرنے کے لئے شہر سے باہر جا رہی ہے اس لئے اس دوران وہ دوسروں کے سامنے موبائل پر بات نہیں کر پائے گی اور اس دوران عرفان کی کالز آئیں تو وہ اسے بھی بتا دے، ثوبیہ موبائل کو بند کرنا بھول گئی تھی اور اب موبائل ٹون سن کر پرس سے موبائل نکال کر کال اٹینڈ کی تو رانگ نمبر نکلا، ثوبیہ نے چاہا کہ اب سونے سے پہلے موبائل بند کر دے تاکہ وقت بے وقت کی کالز اسے ڈسٹرب نہ کریں جو کہ بالکل اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ کاشان کو اس انجان نمبر سے ٹیکسٹ میسج کر کے چیک کرے اور اسے تھوڑا تنگ کرے اور اس کا رد عمل دیکھے، وہ کافی دیر تک سوچتی رہی کہ وہ کیا لکھے، آج تو وہ اپنے ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھو سی گئی تھی خاص طور پر یونیورسٹی کے دور کی یادوں میں اور پھر، بے اختیار اس کی انگلیاں ٹیکسٹ میسج لکھنے لگیں۔

“I always loved you, still love you & will love you forever.”

(مجھے تم سے ہمیشہ پیار تھا، اب بھی ہے اور سدا رہے گا)۔

”اب دیکھوں گی صاحب کا رد عمل۔“ اسے یقین تھا کہ وہ ایسے میسجز کا جواب دینے والوں میں سے نہیں تھا۔

وہ سنجیدہ اور بردبار تھا اس لئے وہ Unknown نمبر سے آنے والے اس پیغام کو اہمیت نہیں دے گا، ابھی وہ ان سوچوں میں ہی گم تھی کہ موبائل ٹون بجنے لگی وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی، اسکرین پر اسے کاشان کا موبائل نمبر نظر آیا تو اسے جیسے کرنٹ لگا، کچھ دیر تک تو اس کا دماغ ہی ماؤف ہو گیا کیونکہ اس نے سوچا کہ اس سے بات کرنے کے لئے تو اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ بیلنس اور رات دیر سے ایک نامعلوم نمبر سے آنے والے میسج کے بعد اس نے فوراً کال کرنا شروع کر دی، اس نے کال اٹینڈ نہیں کی اور رنگ ٹون بجتی بجتی آخر کار بند ہو گئی، کبھی اس کا دل چاہا کہ وہ انجانے میں کاشان کی اسی کے لئے اس بیتابی پر قہقہے لگائے یا پھر زور زور سے روئے کہ جس کاشان پر اسے اندھا اعتماد

تھا وہ ایسا بھی کر سکتا ہے؟ پھر اس کے گالوں پر گرم گرم آنسو بہنے لگے، یوں دس منٹ گزر گئے، رنگ ٹون پھر بجنے لگی، اب وہ کراچی والے گھر کے پی ٹی سی ایل نمبر سے کال کر رہا تھا، تب روتے ہوئے بھی ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی کہ کاشان کو کیا پتا کہ وہ اس نمبر سے بھی واقف تھی، وہ نمبر بدل بدل کر کال کر رہا تھا، آخر کار ثوبیہ نے کال اٹینڈ کی مگر کچھ بولی نہیں، دوسری طرف سے اس نے کاشان کی آواز سنی۔

''پلیز بات کریں، آپ کون ہیں پلیز۔''

ثوبیہ نے تڑپ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی، بے اختیار رونے لگی، یہاں تک کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کے تین بج گئے تھے، رنگ ٹون پھر بجنے لگی تو اس نے پھر کال ریسیو کی، کاشان کی وہی گردان تھی۔

''بات کریں پلیز، کون ہیں آپ؟'' ثوبیہ نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں ہوں۔''

''کون؟''

''اب آواز بھی نہیں پہچانتے کیا؟'' دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی، اسے پتا تھا کہ کاشان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ثوبیہ ہوگی، ثوبیہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے بات کرنا تو دور کی بات اب تم میری کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے، مجھ سے تو وہ نامعلوم شخص بہتر رہا جسے تم نے چار بار کال کی۔''

''ثوبیہ! تم غلط سوچ رہی ہو، مجھے یقین تھا کہ میرا کوئی بے تکلف دوست مجھے تنگ کر رہا ہے، میری طبیعت ویسے ہی صحیح نہیں ہے اور نیند نہیں آ رہی تھی اور پھر بے چینی ہوگئی کہ ایسا میسج رات کو اتنی دیر سے مجھے بھیجنے والا کون ہے، کوئی بھی لڑکی کسی انجان شخص کو ڈائریکٹ ایسا میسج نہیں بھیج سکتی۔''

''کیوں؟ تمہاری آفس میں ایک خوبصورت لڑکی ہے جو تم سے دوستی کرنا چاہتی ہے، وہ تو انجان نہیں ہے نا۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ مذاق میں کہی گئی میری اس بات کو تم نے اس قدر سنجیدگی سے لیا ہے، میں بہرحال اپنی صفائی پیش کرنے کا پابند نہیں ہوں اگر تم مجھے ایسا ہی سمجھتی ہو، ویسے یہ نمبر تمہارے پاس کہاں سے آیا؟'' کاشان بولا۔

''میری فرینڈ کا ہے، اتفاقاً آج میرے پاس ہے۔''

''اوکے اب تم بھی آرام کرو۔'' یہ کہتے ہوئے کاشان نے فون بند کر دیا اور ثوبیہ سوچنے لگی۔

''اب آرام کہاں؟''

☆☆☆

یوں ہی کروٹیں بدلتے ہوئے جانے رات کے کس پہر ثوبیہ کو نیند آئی، دوسرے دن اتوار تھا اس لئے وہ صبح دیر تک سوتی رہی اور جب اٹھی تو ذہن فریش ہونے کے بجائے عجیب تھکاوٹ اور بے کلی کا احساس تھا اور سارا دن اسی بے چینی میں گزرا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کی سوچ غلط تھی یا پھر کاشان؟

اگلے ہی ہفتے ارم نے اسے بتایا کہ۔

''ثوبیہ یار! کل تو مزہ ہی آ گیا، مجھے خیال آیا کہ آج انور صاحب والی کہانی کا بھی ڈراپ سین کر ہی دوں، پھر میں نے انہیں فون کر کے ہوٹل میں ملاقات کے لئے کہا، وہ تو یہی چاہتے تھے سو وہ تو جھٹ تیار ہوگئے۔''

''تم انور صاحب سے ہوٹل میں ملیں؟'' ثوبیہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہوٹل تو ضرور پہنچی مگر اپنی بہن کے ساتھ اور جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں قریب والی ٹیبل پر ہم بھی بیٹھ گئے، مگر میں ان سے کیوں ملتی؟ ان سے ملنے ان کی مسز جو آ دھمکیں۔''

''وہ وہاں کیسے آ گئیں؟''

''میں نے انہیں فون کر کے وہاں بلایا کہ اپنے میاں صاحب کے کارنامے آ کر دیکھیں اپنی آنکھوں سے، پھر جب وہ آئیں اور انور صاحب کی نظر ان پر پڑی اور پھر جو کچھ ہوا میں اور میری بہن تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئیں، گھر جا کر مسز انور نے ان کا کیا حشر کیا ہوگا وہ تو خدا جانے مگر آج ان کے چہرے کو دیکھا ہے؟ لگتا ہے کہ مسلسل روتی رہی ہیں، آنکھیں انگارہ اور سوجی ہوئی ہیں، جو کوئی بھی سبب پوچھ رہا ہے تو طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر رہی ہیں اور مجھ سے التجا کی ہے کہ میں کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کروں کہ میں شرط جیت چکی ہوں۔'' ارم مزے لے لے کر یہ سب کچھ بتاتی رہی مگر ثوبیہ کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگا اور اس نے اداسی سے کہا۔

''بری بات ہے ارم! کسی کے گھر کا سکون برباد کر کے یوں خوش نہیں ہوتے، پھر کبھی ایسی حرکت کی تو میں تم سے بات نہیں کروں گی۔''

''اوکے وعدہ ہے پھر کبھی ایسا نہیں کروں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ثوبیہ سے اپنا موبائل لیا جس پر عرفان کی کال آ رہی تھی۔

☆☆☆

''Happy birthday to you۔'' جیسے ہی ثوبیہ نے اسٹاف روم میں قدم رکھا تو ارم نے دیکھتے ہی اسے وش کیا، پھر تو اس کی دیکھا دیکھی تمام لیکچررز نے بھی اسے مبارکباد دی، ارم نے اسے گفٹ کے ساتھ وہ موبائل سیٹ بھی دیا جو انور صاحب سے بات کرنے کے لئے خریدا تھا، وہ پورا کالج ٹائم اسٹوڈنٹس کی طرف سے وشز کارڈز اور گفٹس وصول کرتے کرتے ہی گزر گیا تھا، گھر پہنچی تو وہاں بھی اس کے لئے سرپرائز پارٹی بچوں اور امی ابو کی طرف سے تھی اسے دی گئی اور سب کی طرف سے خوبصورت تحفوں کا اس کے پاس ڈھیر لگ گیا، اتنی محبتیں پا کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے اور وہ اپنے رب کے آگے سربسجود ہوگئی، مگر دل میں ایک کسک سی تھی، وہ جو سب سے زیادہ عزیز اور پیارا تھا اسے اس نے تو ایک فون کال کر کے اسے وش بھی نہیں کیا، پھر خود ہی اپنے دل کو تسلی دی کہ وہ کام میں مصروف ہوگا پھر ابھی پورا دن بھی تو نہیں گزرا، یقیناً وہ وش کرے گا۔

مگر شام سے رات ہوگئی، نہ اس نے فون کیا نہ وش کیا، ثوبیہ کے کان فون کی رنگ کی طرف لگے رہے مگر اس کا فون نہیں آیا، اس کا دل بیٹھ سا گیا کہ سب اس کا جنم دن یاد رکھیں اور وہ نہ رکھے تو پھر اس دن کی اہمیت ہی کیا ہوئی، آخر کار جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو خود اس نے ہی کاشان کو کال کی تھی اور شکایت کی۔

''اب تو تمہیں کوئی اہم دن بھی یاد نہیں ہوتا، شادی سے پہلے تو تم بھولتے ہی نہیں تھے۔''

''اوہ گاڈ آج کہیں تمہاری برتھ ڈے تو نہیں؟ سوری یار واقعی میں کیسے بھول گیا۔''

''کتنے لوگوں نے مجھے مبارکباد دی مگر میرے کان تم سے کچھ سننے کو ترس گئے ہیں۔''

''میں نے سوری کر تو لی، دیکھو اس وقت میں کہیں باہر ہوں اور میرے دوست میرے ساتھ ہیں اس لئے زیادہ بات نہیں کر سکتا، بعد میں بات کروں گا۔''

''کاشان اب میں تمہارے یہ بہانے سن

سن کر عاجز آ گئی ہوں، تم جان بوجھ کر کتنے ہی عرصے سے مجھے Avoid کر رہے ہو۔" ثوبیہ نے غصے سے کہا۔

"بعد میں بات کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی تو ثوبیہ اور بھی بپھر گئی، اس نے دوبارہ کال کی تو موبائل بند ملا، پھر تو وہ بالکل آؤٹ ہو گئی اور سوچا۔

"تم کیا چاہتے ہو کہ فقط میں ہی تمہارے پیچھے پھروں؟ اب تو میں بھی تمہاری پرواہ نہیں کروں گی یہ مرد ہمیشہ شاکی ہوتے ہیں کہ پسند کی شادی کے بعد عورت محبوبہ ہی کیوں نہیں رہتی، بیوی کیوں بن جاتی ہے؟ تو آپ حضرات بھی تو محبوب نہیں رہتے، پورے کے پورے شوہر بن جاتے ہیں، شادی سے پہلے سالگرہ پر، عید پر اور ہر موقعے پر گفٹ دینا، وہ خوبصورت باتیں کرنا، میرے لباس کو اور مجھے ستائشی نظروں سے دیکھنا، وہ بیتابی وہ ہجر اور وصل کی ساعتیں کیا ہوئیں؟ شادی کے بعد تو ہمیں گھر کے کسی سامان کی طرح سجا کر بھول جاتے ہیں، اب دیکھنا میں بھی لفٹ نہیں کراؤں گی۔"

وہ بے سروپا سوچتی رہی، یوں کچھ دن اور گزر گئے اس ویک اینڈ پر وہ آیا، مگر اس کی حالت دیکھ کر وہ چونک گئی، وہ بہت تھکا تھکا اور کمزور لگ رہا تھا، مگر پھر انا پرست ثوبیہ جاگ اٹھی اور وہ اس کا حال پوچھنے کے بجائے مسلسل اسے نظر انداز کرتی رہی، کاشان نے بھی اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا، مگر حسب عادت کوئی شکوہ نہیں کیا، دوسرے دن بھی پورا دن ہی گزر گیا، کاشان زیادہ وقت ماں باپ اور بچوں کے ساتھ گزارتا اور شام ہوتے ہی واپسی کی تیاری میں لگ گیا، پھر جاتے وقت اس سے کہا۔

"کل سے تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی مگر اب کم از کم مسکرا کر رخصت تو کرو، نہ جانے پھر کتنے دنوں کے بعد آنا ہو۔"

"تمہیں میری مسکراہٹ کی پرواہ کب سے ہونے لگی، بلکہ اب تو شاید تمہیں میری بھی ضرورت نہیں رہی ہے فقط اک فالتو سی شئے سمجھ کر ڈالا ہوا ہے۔" وہ یک بہ یک جیسے ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"ایسا کیوں سمجھتی ہو ثوبی!" کاشان نے دکھ اور دھیرج سے کہا۔

"مگر تم نے کبھی اپنے رویے پر بھی غور کیا ہے؟ جب سے تم نے جاب کی ہے اور اپنے ریسرچ پروجیکٹ کی مصروفیتوں میں گم ہوئی ہو تمہیں میرے لئے فرصت ہی نہیں ملی، تمہیں تو اپنے شوہر کی خوشی سے زیادہ دوسری چیزیں عزیز ہیں۔"

"اوہ تو یوں کہو نہ کہ تم بھی روایتی مرد نکلے، جب تک میں گھر میں پڑی سڑ رہی تھی تو تم مجھے اپنی ملکیت سمجھ کر خوش ہوتے رہے، میں نے جاب کیا کی کہ جیسے قیامت آ گئی، جب تم نے دیکھا کہ میرے ٹیلنٹ کی وجہ سے میری شخصیت بنی اور مجھے گھر سے باہر اہمیت ملی تو تم احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے؟ تمہارا یہ اصل روپ تو اب میرے سامنے آیا ہے۔" وہ عادت کے مطابق نہ جانے اور بھی کیا کچھ کہتی رہی مگر پھر اچانک سدا کا صابر اور ٹھنڈے مزاج والا کاشان بھی بپھر گیا کہ آخر کار مرد تھا کب تک برداشت کرتا، وہ کڑک کر بولا۔

"بس کرو ثوبیہ! اب خاموش ہو جاؤ، میں نے تمہاری بہت باتیں برداشت کی ہیں اور بہت صبر کیا ہے یہ سوچ کر کہ آخر کار تمہیں خود اپنے رویے کا اندازا ہو جائے گا، میں نے تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا؟ تم سے کوئی فلرٹ نہیں کیا، بڑی محبت سے زندگی کا ہمسفر بنا کے گھر میں لایا، اپنے دل اور گھر کی مالکن بنایا اپنا پیار نچھاور کیا، تمہیں ہر آسائش دینے کے لئے خود کو کام کرنے کی مشین بنا دیا، مگر تمہیں میری اور میری محبت کی قدر ہی نہیں، بس اب کچھ تو بھرم رہنے دو، ہمارے درمیان جو دوریاں آ گئی ہیں ان کا احساس ہم دونوں تک ہی رہنے دو، اس بیڈ روم سے باہر یہ مسائل لے کر مت جاؤ کہ اب بچے اور امی ابو بھی متاثر ہونے لگیں، اپنی زبان کو لگام دو، خدارا اب بس کرو۔"

یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور پھر امی ابو کی دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت ہونے لگا تو دور کھڑی ثوبیہ پچھتاؤں کے احساس میں گھری اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ چلا گیا۔

"کوئی بات نہیں میں اسے منا لوں گی، وہ مجھ سے ناراض رہ ہی نہیں سکتا زیادہ دن۔" اس نے دل میں سوچا مگر احساس بعد میں ہوا کہ بہت حد تک صورتحال اب اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی، اس لئے کہ اب وہ سچ مچ اس سے ناراض ہو گیا تھا اور اس کی کوئی بھی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا، کچھ دن اسی طرح گزر گئے تب ثوبیہ بھی بوکھلا گئی، ایک دن اسے وہ موبائل سیٹ یاد آیا جو ارم نے اسے گفٹ کیا تھا اور وہ اسے استعمال نہیں کرتی تھی بس یونہی الماری میں رکھ دیا تھا، اس نے سوچا کہ وہ اس کی کوئی کال اٹینڈ نہیں کرے گا، اگر وہ اس موبائل سے اس کے لئے انجانے نمبر سے کال کرے تو شاید وہ کسی اور کی کال سمجھ کر اٹھا لے، بس وہ ایک بار اس سے بات تو کرے، وہ سب کچھ سنبھال لے گی، یہ سوچ کر وہ موبائل لے کر کالج گئی تا کہ ارم کے ساتھ جا کر نئی سم لے اور اس سے موبائل استعمال کرنے کا طریقہ بھی اچھی طرح سمجھ لے، دوسرے دن کالج میں ہی اسے تھوڑا فری ٹائم ملا تو اس نے کاشان کے نمبر پر کال کی۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے کاشان کی گمبھیر آواز سنی تو اس کا جی چاہا کہ وہ رو دے، آج کل اس کی بے رخی کے بعد وہ جیسے پھر سے شوہر سے اس کا محبوب بن گیا تھا، اس کی دوری اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ پتا نہیں کیوں اس سے بات نہیں کر پائی اور ایکدم کال ڈسکنیکٹ کر دی، اس نے سوچا کہ پہلے کی طرح وہ پھر اسے اپنی آواز سنا کر حیران کر دے اور خوب اس کو کھری کھری سنائے مگر اسے یاد آیا کہ ایسا تو وہ پہلے بھی کر چکی تھی جس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تھا اس لئے اب اسے دانشمندی سے کام لینا چاہیے کیونکہ اب فقط یہ موبائل ہی اس سے رابطے کا ذریعہ تھا اور اسے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ ثوبیہ ہے تو وہ اس کی کال اٹینڈ نہیں کرے گا، اسے احساس ہو رہا تھا کہ اپنی بیوقوفیوں اور جذباتی پن کی وجہ سے وہ اپنے گھر کا سکون برباد کر چکی تھی لہٰذا اب اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔

☆☆☆

ثوبیہ کلاس سے نکلی تو دیکھا کہ ارم کاریڈور کے ایک کونے میں کھڑی موبائل کان سے لگائے عرفان سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی، تو اسے بھی شادی سے پہلے والا وہ وقت یاد آیا جب زندگی کتنی حسین لگتی تھی، کسی زمانے میں وہ اور کاشان گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے، وہ یکا یک اداس ہو گئی تب ارم عرفان سے بات ختم کر کے اس کے پاس آئی اور اسے اداس دیکھ کر کہا۔

"ثوبی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، گھر میں سب خیریت ہے؟"

"ہوں......؟ ...... ہاں۔" وہ چونک کر فقط اتنا ہی کہہ سکی تھی اس کے باوجود کہ ارم اس کی

بہت اچھی فرینڈ تھی، مگر وہ اس سے اپنے انتہائی نجی مسائل ڈسکس نہیں کرتی تھی۔

گھر آ کر کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر آ کر لیٹی تو پھر کاشان کی یاد آئی، اسے رہ رہ کر اپنی لاپرواہیوں اور زیادتیوں کا احساس ہونے لگا، وہ شاید اب خود غرض بن گئی تھی کہ اسے اپنی ذات کے سوا اور کسی کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی، کاشان تو بے حد پیار کرنے والا اور نفیس انسان تھا، اس نے کبھی اپنے شوہر کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، اسے بے اختیار موبائل فون کا خیال آیا اور وہ فون اٹھا کر کاشان کا نمبر ڈائل کرنے لگی اور ایک مسڈ کال دی، جس کے جواب میں کاشان نے بھی مسڈ کال دی اس کے چہرے پر بے اختیار ایک مسکراہٹ آ گئی کہ ڈائریکٹ نہ سہی ان ڈائریکٹ ہی وہ اسے ریسپانس دے رہا تھا، مگر دوسری ہی لمحے شک کی لہر۔

''میرے لئے تو وقت نہیں مگر نا معلوم نمبر سے آنے والی مسڈ کال کا جواب دینے کے لئے وقت بہت ہے۔'' اس نے پھر مسڈ کال دی اور جواب میں مسڈ کال آئی تو یکا یک ماہر نفسیات ثوبیہ خان جاگ اٹھی۔

''اوہو...... ٹھیک، اب میں نفسیاتی طریقے سے تمہیں واپس ٹریک پر لاؤں گی۔''

دوسرے دن وہ اسے ہیلو، ہائے اور گڈ مارننگ وغیرہ جیسے ہلکے پھلکے ٹیکسٹ میسجز کرتی رہی جس کا جواب وہ دیتا رہا، دوپہر کے وقت جب سب کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے تو ثوبیہ بھی بیڈ روم میں آ کر اپنے بیڈ پر بیک پر تکیہ ٹکائے موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی اور منصوبے کے مطابق اسے ایک پیغام لکھ کر بھیجا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو میری بات کا یقین آئے گا یا نہیں مگر کل جب انجانے نمبر ملانے کے بعد آپ کی طرف سے بھی اچھا ریسپانس ملا تو لگا کہ آپ اچھے انسان ہیں، میں ایک بہت مجبور اور دکھی لڑکی ہوں، مجھے کسی اچھے اور سچے دوست کی تلاش ہے۔''

کچھ دیر بعد جواب میں کاشان نے کال کی تو اس نے ریسیو کی مگر کچھ بولی نہیں جبکہ کاشان نے اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد کہا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اچھا انسان سمجھا، میں آپ کا اچھا دوست بنوں گا مگر شرط یہ ہے کہ آپ مجھے دھوکا دینے کے بجائے مجھ سے سچ بولیں، آپ ہو سکتا ہے کہ لڑکی نہیں مگر لڑکا ہوں مگر پھر بھی میں آپ کا دوست بنوں گا، مگر آپ اس طرح خاموش رہیں گے تو میں آپ سے دوستی کیسے کروں گا؟'' وہ اپنے دھیمے اور خوبصورت آواز میں بولا تو ثوبیہ نے کال ڈسکنیکٹ کی اور پھر لکھ بھیجا۔

''نہیں حقیقت یہ ہے کہ میں واقعی لڑکی ہوں، میری کہانی بہت دکھ بھری ہے اور میں اپنی زندگی سے تنگ آ گئی ہوں اور مرنا چاہتی ہوں، میں آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتی صرف پیغام کے ذریعے بات کروں گی اور جواب سننے کے لئے آپ کو کال کر کے صرف آپ کی بات سنوں گی کہ آپ ہو سکتا ہے کہ بہت مصروف ہوں اور بار بار پیغام لکھنا، آپ کے لئے دشوار ہو۔'' تھوڑی دیر بعد اس نے کاشان کو کال کی تو وہ بولا۔

''آپ کے نہ بولنے والے فیصلے سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے، پھر تو میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پاؤں گا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوسی کفر

ہے، زندگی تو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا انمول تحفہ ہے اس لئے زندگی کو ختم کرنے کا سوچنا بھی گناہ ہے، آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں، اگر آپ کی کوئی مدد نہیں کر پایا تو شاید کوئی بہتر مشورہ ہی دے دوں، ویسے کسی کے کام آ کر مجھے خوشی ہو گی اور اپنا دکھ کہہ دینے سے آپ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔'' ثوبیہ نے جواب میں لکھ بھیجا۔

''نہیں نہیں میری بات نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے آپ پر بھروسہ نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ میں بول نہیں سکتی یعنی میں بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوں، آپ کی خوبصورت آواز سن کر لگتا ہے کہ آپ خود بھی خوبصورت اور اچھے انسان ہوں گے، کل ویک اینڈ ہے، ویک اینڈ والی رات میں دیر سے سوتی ہوں، اگر آپ اس وقت فری ہوں تو آپ کو اپنی کہانی سناؤں گی۔''

جواب میں کاشان نے کہا۔

''جی ضرور، میں فری ہوں گا، بلکہ میں تو خود ایک تنہا شخص ہوں، اکیلا رہتا ہوں اچھا ہے، کل آپ کا ساتھ ہی مل جائے گا۔''

کاشان کی یہ بات سن کر ثوبیہ اداس ہو گئی اور سوچنے لگی کہ وہ کیسی ماہر نفسیات ہے کہ اپنی عزیز ترین ہستی کی تنہائی اور اکیلے پن کو محسوس نہ کر سکی، مگر خیر، اب وہ نفسیاتی طریقے سے اس کے دل کا حال معلوم کرے گی، ثوبیہ کی حیثیت سے وہ اسے سمجھ نہ سکی تو اب ایک انجانی لڑکی کی حیثیت سے اس کے دل میں پنہاں جذبوں اور دکھوں تک رسائی حاصل کرے گی۔

☆☆☆

دوسرا دن ہفتے کا تھا، وہ پورا وقت کالج میں یہی سوچتی رہی کہ آخر آج رات وہ کاشان کو کون سی کہانی سنائے گی؟ اور پھر شام تک اس کے ذہن نے ایک کہانی کے تانے بانے بن لئے، اس نے اپنے ذاتی نمبر سے کاشان کو کال کی مگر رنگ بجتی رہی اور کوئی بھی کال ریسیو نہیں کی گئی، اس نے سوچا۔

''اچھا جی ثوبیہ کی حیثیت سے تم چاہے اب مجھے اگنور کرو مگر رات کو مجھ سے ہی باتیں کرو گے۔''

شام کو وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی تو موبائل کی رنگ سن کر بیڈ روم میں آئی، کاشان کی کال تھی جو اس کے آتے آتے بند ہو چکی تھی، اس کے ہونٹوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ آئی۔

''اوہو تو اس قدر بے صبری ہے، اس کا مطلب ہے کہ میرا پلان کامیاب رہا۔''

چائے پینے کے بعد اس نے کاشان کے نام پیغام لکھا۔

''میری کہانی بہت لمبی ہے اور ایک ہی وقت میں اتنی بڑی کہانی نہیں لکھ سکتی لہٰذا میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بذریعہ پیغام بھیجوں گی، ہر پیغام کو پڑھنے کے بعد مجھے ایک مسڈ کال دیجئے گا تاکہ مجھے پتا چلے کہ آپ میرا بھیجا ہوا ہر پیغام پڑھ رہے ہیں، دوسری بات کہ میں ایک ہاسٹل میں رہتی ہوں اور ہمارے ہاسٹل کی وارڈن ایک بہت ہی سخت خاتون ہیں جو کہ اس وقت راؤنڈ پر ہے اس لئے اس وقت بات نہیں کر سکتی، رات کو دیر سے بات کروں گی۔'' پیغام بھیجنے کے بعد کاشان نے کال کر کے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر آپ مجھے اپنا نام تو بتائیں؟''

''میرا نام رمشا ہے۔'' ثوبیہ نے لکھ بھیجا تو جواب میں اس کا پیغام آیا کہ۔

''رمشا مجھے آپ کے میسج کا انتظار رہے گا۔'' ثوبیہ اس سچویشن سے بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

رات گہری ہوتی جا رہی تھی، ہر طرف خاموشی تھی، سب لوگ اپنے اپنے بستروں پر مزے کی نیند میں تھے تب ثوبیہ اپنے تکیے سے ٹیک لگائے موبائل ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی، ہلکی خوابناک روشنی میں اس نے کاشان کو ایک مسڈ کال دی، جواباً فوراً ایک رنگ آئی اور پھر رنگ بجتی رہی تو اس نے کال اٹینڈ کی اور خاموشی سے کاشان کو سنتی رہی۔

"ہاں بھئی ہمیں آپ کی کہانی سننے کا بے چینی سے انتظار ہے، تو پہلی قسط بھیجئے۔"

جواب میں ثوبیہ نے لکھا۔

"میں پیدائشی گونگی نہیں ہوں، البتہ جب سے میں نے بات کرنا شروع کی تھی تو صاف نہیں بول پاتی تھی، میرے امی ابو نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، تقریباً سب کی ہی یہی رائے تھی کہ یہ ایک قسم کی کمزوری تھی جو وقت کے ساتھ آگے چل کر ختم ہو جائے گی، انہوں نے میرے والدین سے کہا کہ وہ مجھے گھر میں اچھا اور پرسکون ماحول دیں اور میرے اندر اعتماد پیدا کریں مگر بدقسمتی سے ہمارے گھر میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی، حالانکہ میری ممی اور پپا کی لو میرج تھی مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا تو ان کو ہمیشہ جھگڑتے ہی دیکھا، سبب یہ تھا کہ دونوں ہی شکی مزاج تھے، ایک دوسرے پر مختلف الزام لگاتے تھے میں اور میرا چھوٹا بھائی ان کی کئی باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے تھے، مگر جب وہ چیخ چیخ کر بولتے تو ہم دونوں خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ آتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر کانپتے اور روتے رہتے تھے، ڈاکٹروں نے میرے والدین سے میرے خوف زدہ رہنے کا سبب پوچھا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتے کہ اصل بات وہ بتا نہیں سکتے تھے، ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اگر میں خوف اور ذہنی اذیت کی حالت میں مزید رہی تو کبھی بھی ٹھیک طرح بول نہ پاؤں گی، یہ سن کر کچھ دن تو وہ ٹھیک رہے مگر پھر وہی لڑائی جھگڑا اور ایک دوسرے پر الزامات اور گالم گلوچ حالانکہ ہم اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے، پیسے کی کمی نہ تھی نہ ہی جاہلانہ ماحول تھا، مگر پھر بھی وہ جاہلوں کی طرح لڑتے، جب میں کچھ بڑی ہوئی تو کچھ کچھ سمجھنے لگی، میرا باپ شراب اور عورتوں کے پیچھے پیسا برباد کرتا تھا پھر شاید وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں ایسے پھنسے تھے کہ دونوں کے جھگڑوں میں اور بھی شدت آ گئی یہاں تک کہ ایک دن تو پپا غصے میں ممی پر پستول تان کر کھڑے ہو گئے تو میرا چھوٹا بھائی چیخ چیخ کر رونے لگا اور مجھ پر تو چیخنے چلانے کا دورہ سا پڑ گیا کیونکہ ہم دونوں ہی بے حد خوفزدہ ہو گئے تھے، یہاں تک کہ میں چیخنے چلاتی بے ہوش ہو گئی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں ایڈمٹ تھی اور میری زبان تو جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی، کافی دنوں کے علاج کے بعد مجھے گھر لایا گیا، میری طبیعت تو پہلے سے کافی بہتر تھی مگر میری زبان بند ہو چکی تھی، اب تو گھر بھی وہ نہیں رہا تھا اس دوران بہت کچھ بدل چکا تھا کیونکہ ممی اور پپا کے بیچ Divorce ہو چکی تھی، ممی مجھ سے ملنے کے لئے گھر آتی تو پپا انہیں مجھ سے ملنے نہیں دیتے تھے، اس طرح میں اور بھی ٹوٹ گئی، بکھر گئی، بولنے کی مشق کے لئے میرے فزیوتھراپی کے سیشنز ہوتے تھے مگر سچ تو یہ تھا کہ مجھے زندگی میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی نہ ہی میں خود بولنے کی کوشش کرتی، ڈاکٹروں نے پپا کو بتایا کہ میں بالکل بھی ان سے تعاون نہیں کر رہی تھی اور اگر ایسا رہا تو شاید میں ہمیشہ کے لئے بول نہ پاؤں گی مگر مجھے بولنے سے دلچسپی ہی نہیں تھی، جسمانی طرح تو اب میں نارمل تھی اس لئے مجھے اسکول بھیجا گیا، میرے پپا کیونکہ بڑے آدمی تھے، اس لئے انہوں نے پرائیویٹ بڑے اسکول کی انتظامیہ کو میری حالت کے بارے میں بتاتے ہوئے میرا خاص خیال رکھنے کا کہا گیا، اس لئے سب وہاں میرا خاص خیال رکھتے تھے اور مجھے میری بولنے کی معذوری کا احساس نہیں دلایا جاتا تھا، پڑھائی میں، میں ٹھیک تھی اور پپا نے گھر پر بھی مجھے پڑھانے کے لئے ٹیوٹر رکھے تھے اس لئے تعلیم کے مراحل طے کرنے میں مجھے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوا، میں نے میٹرک پاس کی اور پھر یونیورسٹی تک آ گئی، وہاں میری ملاقات اویس سے ہوئی اویس مجھ سے ایک سال سینئر تھا، وہ میری فرینڈ کا بھائی تھا، اس کا تعلق مڈل کلاس سے تھا، میری فرینڈ کی محبت میرے لئے دولت تھی اور پھر مجھے اویس سے محبت ہو گئی اور جب اویس نے پھر ماسٹرس ڈگری لی تو میں نے پپا سے سفارش کروا کر اسے ایک اچھی جاب دلوائی، یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس دوران ممی اور پپا دونوں دوسری شادی کر چکے تھے، میری سوتیلی ماں نے کبھی مجھے پیار نہیں کیا نہ ہی میرے بھائی کو بلکہ ان کے کہنے پر پپا نے بھائی کو ہاسٹل میں داخل کروا دیا، اب تو گھر مجھے اور بھی کھانے کو آتا، سوتیلی ماں کا رویہ میرے ساتھ دن بدن برا ہوتا گیا تب میرا جی شدت سے چاہتا کہ کاش اویس مجھ سے شادی کر کے مجھے یہاں سے کہیں دور لے جائے، جہاں فقط اس کا پیار ہو میرے لئے جبکہ محبت جتانے کے باوجود شادی کے ذکر پر اویس مختلف بہانے بنانے لگتا، میں نے اس سے کہا کہ وہ فکر نہ کرے پپا مجھے جہیز میں دنیا کی ہر آسائش کے علاوہ گھر بھی دیں گے جو پہلے ہی میرے نام سے تھا، مجھے اپنی معذوری کا احساس تھا اس لئے میں نے اویس سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھے فقط اس جہنم سے نکال لے جائے پھر اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے گا تو میں رکاوٹ نہیں بنوں گی وہ صرف مجھے اپنا نام دے، محبت دیتا رہے، مگر وہ تو محض اپنا Future بنانے کے لئے مجھے استعمال کرتا رہا تھا سو اس نے دوسری جگہ شادی کر لی تو ساری دنیا میرے لئے جیسے اندھیری ہو گئی، اس کی بے وفائی نے مجھ اور توڑ کے رکھ دیا، آخر کار میں نے سوچا کہ کوئی جاب کر کے خود کو بہلائے رکھوں، پھر پپا کی سفارش پر مجھے ایک جاب مل گئی پھر میں وہاں کے ہاسٹل میں شفٹ ہو گئی کہ گھر میں رہنا اب میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا، اب فقط ایک ہی خواہش ہے کہ اسپیشل ایجوکیشن (معذور لوگوں کے لئے) حاصل کر کے اپنے جیسے لوگوں کی خدمت کروں، مگر جب بھی اویس کی بے وفائی یاد آتی ہے زندگی زہر لگتی ہے۔"

ثوبیہ نے بہت ساری قسطوں میں یہ فرضی کہانی لکھ کر پوری کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جیسے سچ مچ وہ رمشا ہو کیونکہ وہ اس کردار میں ڈوب گئی تھی، اس کی انگلیاں ٹائپنگ کر کر کے درد کرنے لگیں تھیں، کہانی کا آخری حصہ پڑھ کر کاشان نے اسے کال کی تھی، اس کی آواز ثوبیہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"میری اچھی سی فرینڈ میں نے آپ کی پوری کہانی بہت غور سے پڑھی ہے لیکن اس دکھ بھری کہانی کو پڑھنے کے بعد مجھے آپ سے ہمدردی نہیں کیونکہ ہمدردی تو کمزور لوگوں سے کی جاتی ہے آپ خود کو بھی کمزور نہ سمجھیں کیونکہ آپ تو بہت باہمت لڑکی ہیں، دوسرا مشورہ میں آپ کو یہ دوں گا کہ اویس کو بھول جائیں، جو چلا گیا وہ آپ کی زندگی سے نکل گیا، زندگی آپ کے

سامنے بانہیں پھیلائے کھڑی ہے، آپ کو اس سے بہتر شخص مل جائے گا اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں یہ کہوں گا کہ وہ کم ظرف شخص تو آپ کے قابل ہی نہیں تھا، میں بھی آج کل بڑی تکلیف دہ زندگی گزار رہا ہوں مگر آپ کی کہانی پڑھ کر لگا کہ اس دنیا میں مجھ سے کئی گنا زیادہ دکھی لوگ ہیں، میں آپ کے لئے دعا گو ہوں، ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں اور......" ثوبیہ کاشان کے لہجے کی بھول بھلیوں میں گم تھی کہ اچانک اس کے بیڈ روم کے بند دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے کانوں میں اپنی ننھی سی ذونش کی آواز آئی۔

"امی......! امی......!...... دروازہ کھولیں۔" ثوبیہ نے فوراً کال ڈس کنیکٹ کی اور دروازے کی طرف بھاگی، دروازہ کھولا ہی تھا کہ ذونش اس سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی، وہ شاید نیند میں ڈر گئی تھی اور دادا دادی کے کمرے سے بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی، ثوبیہ نے اسے گود میں اٹھا کر اپنے برابر اپنے بیڈ پر لٹایا، وہ کچھ ہی دیر میں اس کے پاس پرسکون ہو کر سو گئی تب ثوبیہ نے موبائل اٹھا کر میسج لکھا۔

"اب رات بہت ہو چکی ہے اور میں بھی بہت تھکی ہوئی ہوں اس لئے باقی باتیں کل کریں گے۔" جواب میں کاشان نے کال کر کے کہا۔

"سب خیر تو ہے نا؟ میں نے دروازے کھٹکھٹانے کی آوازیں سنیں تھیں، کہیں آپ کی خطرناک وارڈن نے تو چھاپا نہیں مارا؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھیں، اب آپ بھی آرام کریں گڈ نائٹ۔"

جواب میں بھی "گڈ نائٹ" کا میسج آیا تو اس نے موبائل آف کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کا ذہن ایک ہی خیال میں اٹکا دیا کہ کاشان فقط ایک دن پہلے اس طرح موبائل پر چیٹ کرتی لڑکی سے اپنے سب دکھ سکھ شیئر کر سکتا تھا؟ کیا وہ رمشا پر اعتماد کرے گا؟ یہی سوچتے سوچتے آخر کار وہ بھی نیند کی وادیوں میں پہنچ گئی۔

☆☆☆

اب ایک نئی صورتحال شروع ہو گئی، کاشان ثوبیہ سے تو ناراض تھا مگر رمشا سے ہنس ہنس کر بات کرتا، وہ روزانہ چیٹنگ کرتے، کاشان اس سے آفس کی باتیں ڈسکس کرتا، لطیفے سناتا، کبھی شعر، مطلب کہ وہ اپنے دل کی باتیں اس سے کرتا اور وہ بھی رمشا کی حیثیت سے اس کی ہر بات کو اہمیت دیتی مگر کبھی کبھار اس پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو جاتی کہ کاشان ثوبیہ کو بھولے سے بھی فون نہیں کرتا مگر رمشا کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتا، اس کا مطلب تھا کہ ثوبیہ اور کاشان کے بیچ رمشا کا وجود پوری سچائی کے ساتھ کھڑا تھا، اب کبھی کبھی تو وہ رمشا سے جیلس ہو جاتی تھی کیونکہ وہ دن بہ دن کاشان کے قریب ہوتی جا رہی تھی، تب وہ سوچنے لگتی۔

"اُف یہ میں نے کیا کر دیا؟ اپنے اور کاشان کے بیچ خود ہی ایک لڑکی کا وجود لے کر آ گئی تھی؟ اب کیا کروں؟ رمشا کی صورت میں اس کی دوست بن کر اس کا ہر دکھ سکھ بانٹوں یا رمشا کے وجود کو پاش پاش کر دوں؟" ایک مرتبہ رمشا کی حیثیت سے کاشان سے پوچھا۔

"آپ نے کسی سے محبت کی ہے۔"

"لگتا ہے کہ وہ محبت تھی ہی نہیں، شاید ایک دھوکا تھا۔" کاشان دکھ سے بولا تو ثوبیہ جل ہی تو گئی تھی، وہ تو اپنا نام اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی، پھر اس نے لکھ بھیجا۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی نے آپ کے دل کو دکھایا ہے، دیکھیں میں نے اپنے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دیا، اب آپ بھی مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔"

تب وہ اسے سب کچھ بتانے لگا سب سچ سچ پڑھائی کے متعلق، ثوبیہ سے محبت کے متعلق اور پھر شادی کے بعد کے اختلافات کے متعلق، کہیں جھوٹ نہیں تھا، مگر پھر بھی ثوبیہ کو غصہ آ گیا کہ وہ ایک اجنبی لڑکی کو اپنے اور اس کے بارے میں سب کچھ کیوں بتا رہا ہے وہ بولے جا رہا تھا، اپنے دکھ بیان کر رہا تھا، تب اسے اپنے اندر کی ایک نئی تبدیلی کا بھی یک بہ یک احساس ہوا کہ وہ رمشا کی حیثیت سے اس کی ہر بات صبر اور سکون سے سنتی تھی (یا سننا پڑتا تھا) اور اس کی دلجوئی کرتی تھی اسے اہمیت کا احساس دلاتی تھی، اے کاش وہ ثوبیہ کی حیثیت سے یہ سب کچھ کرتی تو کتنا اچھا ہوتا، وہ کہتا رہا۔

"وہ مجھ سے کتنا ہی لڑے، جھگڑے مگر پھر بھی میں اس سے دور نہیں رہ سکتا مگر وہ میرے ساتھ کراچی نہیں آئی، میں اپنی پوری فیملی کو بہت مس کرتا ہوں، اس نے مجھے تنہا کر دیا، وہ خود نفسیات کے شعبے سے وابستہ ہے اور انسان کی ذہنی کیفیات کو عام آدمی کی نسبت زیادہ بہتر جانتی ہے پھر بھی اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں شدید ڈپریشن میں مبتلا ہو چکا ہوں، یہاں پر صبح سے شام تک آفس میں کام کرنے کے بعد جب گھر جانے کا سوچتا ہوں تو اس کے سونے آنگن کا خیال آتے ہی سوچتا ہوں کہ اس گھر کو گھر کہوں یا مکان؟ یہاں پر ہر قسم کی لڑکیاں مل جاتی ہیں، ایسی بھی تھیں جو میری تنہائیوں کی ساتھی بننے پر بھی راضی تھیں مگر مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی، میں لڑکیوں سے ہنس بول بھی لیتا ہوں مگر اس سے آگے کبھی نہیں سوچا، پچھلے دنوں جب میں بیمار تھا تو ایک مہینہ گھر میں رہا مگر ثوبیہ کو اپنی پروفیشنل اور سوشل سرگرمیوں سے فرصت ہی نہیں تھی کہ کبھی میری طرف بھی متوجہ ہوتی، اسے کیوں احساس نہیں ہوا کہ میں ایسا پہلے تو نہیں تھا اور اب ایسا کیوں ہو گیا ہوں، بجھا بجھا، مایوس بیمار......"

کاشان یہاں تک پہنچا تو ثوبیہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے، وہ کہتا رہا۔

"پھر کراچی میں اگر میرے مہربان اور شفیق آفیسر کی فیملی نہیں ہوتی جو میرا خیال اپنوں کی طرح رکھتی تو شاید میں سنبھلنے کے بجائے بالکل ٹوٹ کر رہ جاتا، میرے آفیسر اور ان کی وائف اگر میرا خیال اپنے اولاد کی طرح نہیں رکھتے تو میں اتنی جلدی ڈپریشن سے باہر نہیں آتا، وہ دونوں بھی تنہا رہتے ہیں کہ ان کے بیٹے ملک سے باہر ہیں، پھر مجھے آپ جیسی بہت پیاری فرینڈ مل گئی جس سے باتیں کر کے مجھے تنہائی کا احساس نہیں رہتا بلکہ ڈھارس ملتی ہے۔" اب تو ثوبیہ باقاعدہ رونے لگی اور اس کی ہچکیوں کی آواز سن کر کاشان بے چین ہو گیا۔

"آپ رو رہی ہیں؟ میں آپ کو دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا میری فرینڈ پلیز مت روئیں۔"

کال ڈس کنیکٹ کر کے وہ روتی رہی اس دن کے بعد تو جیسے اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی، جی چاہا کہ فوراً کاشان کے پاس پہنچ جائے، اس کو اپنے اندر سمیٹ لے، اسے اتنا پیار اور توجہ دے کہ اس کی ہر زیادتی کا ازالہ ہو جائے۔

اتوار کی صبح اس نے ثوبیہ کی حیثیت سے کاشان کو کال کی، وہ ابھی تک سو رہا تھا شاید کیونکہ جب اس نے کال اٹینڈ کر کے، ہیلو، کہا تو اس کی آواز خمار آلود تھی۔

"کاشان! کیسے ہو تم؟ ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ حیرانگی سے بولا۔

"کچھ نہیں، تم شاید سو رہے تھے، اٹھو اور فریش ہو جاؤ پھر بات کرتے ہیں۔"

"کیوں بھئی؟ خیر تو ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"آج صبح صبح ہی جھگڑے کا موڈ ہو رہا ہے کیا؟ جو کہنا ہے وہ کہہ دو میں ٹھیک ہوں۔"

"کاشان!" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"تم خود کو تنہا مت سمجھنا، میں ہوں نا، میں تمہیں ٹوٹنے نہیں دوں گی۔"

"خیر تو ہے بیگم صاحبہ! آج آپ بڑی بدلی بدلی باتیں کر رہی ہیں؟ تمہیں کب سے فکر ہونے لگی میری؟"

"بس اب ہم دور نہیں رہیں گے، ہم مل کر اپنے گھر کو خوبصورت بنائیں گے، اب میں تمہیں کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

"مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے تم سے، خدارا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ گھر کب آ رہے ہو؟ میرے پاس تمہارے لئے ایک سرپرائز ہے۔" وہ بولی۔

"کیسا سرپرائز؟"

"تم آؤ تو اس ویک اینڈ کو، پھر آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کریں گے، تب بتاؤں گی۔"

"اچھا!" وہ بے دلی سے بولا اور کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

☆☆☆

"رمشا آپ حیدرآباد میں رہتی ہیں نا؟ میں کل حیدرآباد آ رہا ہوں، میں اب اپنی اتنی پیاری فرینڈ سے ملاقات کرنا چاہوں گا، آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دیں۔"

جب کاشان نے یہ کہا تو ثوبیہ گڑبڑا گئی، کیونکہ جب بھی کاشان اس سے ملنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ یہی جواب دیتی تھی کہ وہ تو حیدرآباد میں رہتی ہے اس سے کیسے مل سکتی ہے؟ اب تو بات گلے پڑ رہی تھی، پھر اس نے اسے ٹالنے کے لئے لکھا۔

"او کے ایڈریس بھی بتا دوں گی، آپ حیدرآباد پہنچ کر مجھے بتایئے گا تب میں آپ کو ایڈریس بتاؤں گی۔"

"جب آپ حیدرآباد آئیں گے تو آپ کو میرا موبائل ہی بند ملے گا کاشان صاحب۔" وہ دل میں سوچ کر مسکرائی۔

☆☆☆

اس ویک اینڈ کو ثوبیہ نے خاص اہتمام کیا تھا، گھر کی صفائی ستھرائی کرائی اور نئی سیٹنگ کی اور نئی آرائشی چیزوں کے علاوہ گلدانوں میں اصلی پھول سجائے، اپنے ہاتھوں سے مزے کی ڈشز تیار کیں اور شام ہوتے ہی وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی، خوبصورت اور نازک سی تو تھی ہی کہ کوئی یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ اسکول گوئنگ دو بچوں کی ماں تھی، ہلکے میک اپ، جیولری اور پارلر سے آج ہی نئے اسٹائل کے بالوں کی کٹنگ اور سیٹنگ نے تو اسے بدل کر رکھ دیا تھا، یہاں تک کہ کاشان آیا تو گھر کو اور اسے دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

"کہیں جا رہی ہو باہر؟" کاشان نے پوچھا۔

"نہیں تو، کیوں؟" وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولی کیونکہ وہ اس سراپے کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔

"بس ایسا لگا تھا، خیر....."

رات کو سب نے مل کر کھانا کھایا اور کاشان نے ڈشز کی تعریف کی تو اس نے خوشی اور اطمینان کا ملا جلا احساس اپنے اندر پایا، پھر چائے کا دور چلا اور محفل جمی، بچے کاشان کے ساتھ لگے بیٹھے تھے، وہ سب کے لئے تحفے لایا تھا، ایک پیکٹ اس نے ثوبیہ کی طرف بھی بڑھایا، اس کو کھول کر دیکھا، نیوی بیلو کلر کی خوبصورت اور اسٹائلش ساڑھی تھی اور پرفیوم تھا ساتھ میں۔

"تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔" ثوبیہ کو لگا کہ زندگی نے ایکدم نیا اور خوبصورت موڑ اختیار کر لیا تھا۔

رات کو سب سو گئے اور اب وہی دونوں ڈرائنگ روم میں رہ گئے تو کاشان نے ثوبیہ سے کہا۔

"تمہیں غالباً کوئی سرپرائز دینا تھا۔"

"ہاں وہ...... مگر......؟" ثوبیہ کچھ گڑبڑا گئی کہ اس کی نظروں سے آج عجیب شوخی سی تھی، پھر اس نے الفاظ کو جوڑا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم ایک اجنبی لڑکی سے اتنا عرصہ حال دل کیوں کہتے رہے اور...... اور...... مجھ سے اتنا دور کیوں ہو گئے؟"

"کون سی لڑکی؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ گڑبڑانے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اطمینان سے کہہ رہا تھا تو وہ حیران رہ گئی، اس نے تو سمجھا تھا کہ اس انکشاف سے وہ کنفیوژ ہو جائے گا اب تو وہ خود کنفیوژ ہوتے ہوئے بولی۔

"وہ...... رمشا......"

"اوہ...... اچھا...... وہ رمشا، ہاں اس سے میں اس لئے اپنی ہر بات شیئر کرتا ہوں کہ وہ مجھے سمجھتی ہے، وہ مجھے اپنے دل کی بات بتاتی ہے اور مجھ سے میرے دل کی بات کہتی ہے، حالانکہ

وہ آج تک مجھ سے ملی بھی نہیں مگر میرے لہجے سے وہ میرے اندر کے موسموں کا حال جان لیتی ہے، بول بھی نہیں سکتی مگر میرا ہر دکھ سکھ شیئر کر لیتی ہے، اسے پتا ہے کہ کون سی باتیں مجھے دکھ دیتی ہیں اور کون سی باتیں خوشی کا باعث بنتی ہیں، وہ میری بچی فرینڈ ہے۔“

وہ کہتا جا رہا تھا اور وہ حواس باختہ ہو کر اسے سن اور دیکھ رہی تھی کہ آج کا کاشان وہ پہلے والا تو نہیں تھا، ترو تازہ، فریش اور بدلا بدلا سا تھا، وہ کہتا رہا۔

”میں نے اس لئے بھی اس سے حال دل کہا کہ وہ انتہائی سادہ یا بیوقوف ضرور ہے مگر میرے لئے اجنبی ہرگز نہیں۔“

”کہ...... کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم اسے جانتے ہو؟“

”ہاں۔“ کاشان نے مسکرا کر کہا۔

”پہلے دن تو میں واقعی شش و پنج میں تھا کہ وہ کون ہے، مجھے لگا کہ کوئی مجھے بیوقوف بنا رہا ہے رمشا ایک دھوکا ہے لیکن جس رات اس نے مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی اسی رات مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کون تھی؟“

”مطلب؟“ ثوبیہ تو چکراتی جا رہی تھی۔

”وہ جب مجھ سے بات کر رہی تھی تو اسی وقت دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تھی۔“

”ہاں۔“ ثوبیہ نے بے اختیار ہاں کی اور جھینپ گئی۔

”اس بیوقوف نے سمجھا کہ وہ کال کو ڈسکنیکٹ کر چکی تھی مگر ایسا نہیں تھا، پھر جب وہ میری لاڈلی پیاری بیٹی کو دروازہ کھول کر کمرے میں لائی تو کیا میں اپنی بیٹی کی رونے کی آواز اور ثوبیہ کو اسے بہلانے اور سلانے کی آوازیں پہچان نہیں پاؤں گا۔“

”اوہ گاڈ تو میں خود بیوقوف بن گئی اور تم اس سچویشن کا مزہ لیتے رہے۔“ کاشان نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

”جو لوگ دوسروں کو بیوقوف بناتے ہیں وہ دراصل خود کو بیوقوف بناتے ہیں۔“

”میرا پورا منصوبہ ناکام ہو گیا۔“ ثوبیہ سر پر ہاتھ رکھ کر روہانسی ہو کر بولی۔

”نہیں۔“ کاشان یک بہ یک سنجیدہ ہو گیا۔

”میں اس پلان کو ناکام نہیں کہوں گا کیونکہ رمشا کی حیثیت سے ہی سہی تم نے مجھے اپنی بات تمہیں سمجھانے کا موقع دیا، ایک تو بیچاری گونگی تھی اس لئے بھی خاموشی سے اسے میری ہر بات سننی پڑی ورنہ ثوبیہ تو فقط بولنا جانتی ہے سننا نہیں، سو یہ سرپرائز تو ناکام گیا تمہارا۔“

”ہاں مگر ایک اور بھی سرپرائز ہے ابھی۔“ اس نے قریب پڑی ہوئی فائل سے ایک پیپر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا، کاشان نے اسے پڑھ کر سچ مچ حیران ہو کر کہا۔

”تم اپنی جاب سے long leave (طویل رخصت) لے رہی ہو، مگر کیوں؟ وہ تمہارے خواب، وہ ریسرچ پراجیکٹ، وہ تمہارا ٹیلنٹ وغیرہ سب کیا ہوئے؟“

”کاشان اب احساس ہوا ہے کہ تمہارے سوا کچھ بھی اہم نہیں ہے، تمہارے بغیر گزرے ہوئے پچھلے دنوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں، اب میں تمہیں تنہا جانے نہیں دوں گی، میں نے بہت غلط کیا ہے، میاں بیوی کا ساتھ ہر دکھ سکھ کا ساتھ ہے مگر میں نے خود تمہیں تنہا کر دیا اس امید پر کہ تمہارا تبادلہ جلد ادھر ہو جائے گا، اب ہم سب مل کر کراچی میں رہیں گے۔“

”اب تمہیں یہ قربانی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اب تک ناراض ہو؟“

”نہیں یہ بات نہیں مگر ایک سرپرائز میرے پاس بھی ہے تمہارے لئے۔“ اس نے بھی اپنے بریف کیس میں سے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی، ثوبیہ نے پڑھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

”تمہارا ٹرانسفر آرڈر ہے حیدرآباد کا؟“

”ہاں یہ مہربانی بھی اس شفیق آفیسر کی ہے جن کی کوششوں سے میرا ٹرانسفر آرڈر ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے گھر کا سکون اور آرام بھی چاہیے۔“

”آئی ایم سوری شان۔“ ثوبیہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

”کبھی کبھی تو ساتھ رہنے والے اور میاں بیوی جیسے قریب تر رشتے میں بندھے لوگ بھی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے تو کہیں غیر بھی اپنوں سے بڑھ کر محبت دیتے ہیں، بہت عظیم ہیں وہ ہستیاں جن کے اپنے بیٹے تو سات سمندر پار رہتے ہیں مگر انہوں نے تمہیں بیٹا بنایا، میں ان سے ملوں گی، ان کو تھینکس کہوں گی۔“

”اب بس کرو۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور کہا۔

”غلطی کا احساس ہو جائے تو وہ ہمارے لئے ایک نیا تجربہ بن جاتا ہے جو ہمیں آگے چل کر ایسی غلطیاں کرنے سے روکتا ہے، مجھے ہمیشہ سے تمہاری خوشی عزیز تھی اسی لئے میں نے روایتی شوہروں کی طرح نہ تم پر اپنی مرضی ٹھونسی نہ حکم چلایا، تم جاب کرنا چاہو یا اپنے پروفیشن میں آگے بڑھنا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا مگر میری صرف ایک گزارش ہے۔“

”وہ کیا؟“ ثوبیہ نے اپنی خوبصورت بھیگی بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آئندہ کبھی بھی اگر ثوبیہ کی حیثیت سے میری بات نہ سمجھ پاؤ تو رمشا بن کر ایسا کرنا۔“

”تم رمشا کو بھول نہیں سکتے؟ اب اس کی ضرورت ہی نہیں ہے بھئی۔“

”ضرورت تو بہت ہے۔“ وہ شرارت سے اس کے بالوں کو بکھیرتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ وہ پھر سے پہلے والی ضدی ثوبیہ بن گئی۔

”پہلے فیصلہ کر لو، آج اور ابھی کہ تمہیں رمشا چاہیے یا ثوبیہ؟“

”مجھے دونوں ہی چاہئیں۔“

”مگر اب رمشا کیوں آخر؟“

”بس بن گئیں نہ پھر بیوی، رمشا میری دوست ہے بھئی اور اس میں ایک سب سے بڑی خوبی ہے جو کہ ہر شوہر کی دل کی آواز ہے۔“

”ایسا کیا ہے اس میں جو مجھ میں نہیں؟“ وہ سن کر بولی۔

”وہ......“ وہ رکا۔

”ہاں...... ہاں...... وہ...... کیا؟“

”وہ......“ وہ مکمل شرارت کے موڈ میں تھا۔

”اب بتاؤ بھی تو......“

”اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گونگی ہے۔“ اس نے کہا اور زور سے قہقہہ مارا تو بے اختیار ثوبیہ کو بھی ہنسی آ گئی، جب گھر میں دونوں کی ہنسی گونجی تو جیسے گھر کا ذرا ذرا بھی ان کی ہنسی اور خوشی میں شامل ہو کر جھومنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔

☆☆☆

سلطنت

دوسری اور آخری قسط

طیبہ ہاشمی

مکمل ناول

"میاں چائے نوش فرمایئے گا۔" چائے فروش کے پکارنے پر وہ چونکا اور چہرہ موڑ کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

"یہ دن بھی دیکھنا لکھے تھے قسمت میں۔" چائے فروش اب کسی دوسرے آدمی سے مخاطب تھا۔

"اپنا گھر بار چھوڑنا آسان نہیں ہوتا مگر اب کیا کیجئے۔" اس دوسرے آدمی کی آواز میں عجیب سا درد تھا ایسا درد جو اندر ہی اندر دل کو چھیل ڈالتا ہے، یہ ایسا درد تھا جو یہاں لینے والے ہر انسان کا درد تھا۔

عباس جو پہلے خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اس سے رہا نہ گیا۔

"ہر کام اچھے کے لئے ہی ہوتا ہے اور وہ بھی اب آپ کا ملک ہے آپ لوگوں کے لئے ہی معرض وجود میں آیا ہے۔"

"تم ابھی بچے ہو میاں، آنے والا کل کس نے دیکھا ہے۔"

"امید تو انسان اچھی دکھ سکتا ہے اور کل تو واقعی میں کسی نے نہیں دیکھا، کل کی کیا بات آنے والے لمحے کی خبر نہیں ہے انسان کو، تو پھر اس بات پر سر کھپانے کی کیا ضرورت۔" عباس کی بات پر وہ آدمی خاموش ہو گیا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ آنے والا لمحہ آپ کے لئے بہتر ہے، بالکل نہیں، تو پھر آپ کیوں فکر کرتے ہیں، اپنے خدا پر بھروسہ کریں، وہ سب کے لئے بہتر وسیلے پیدا کرنے والا ہے۔" وہ آدمی بڑی خاموش نظروں سے عباس کی باتیں سن رہا تھا۔

"صحیح وقت پر صحیح فیصلہ آپ کے اعلیٰ دماغ ہونے کی نشانی ہوتا ہے، یہی وقت ہے جب آپ فیصلہ کر سکتے ہیں، اچھا یا برا، اسے کل پر چھوڑ دیں اور اگر برا بھی ہو تو کوئی بات نہیں، وہاں آپ اپنے ملک میں ہوں گے، اپنے لوگوں میں جو ل

کر آپ کے برے کو اچھے میں بدل سکتے ہیں، بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔"

عباس کا ولولہ اور جوش دیکھنے کے قابل تھا اس کے بدن میں پھیلی کمزوری جانے کہاں جا چھپی تھی، پرجوش سا وہ اس آدمی کی ہمت بندھا رہا تھا جو آنے والے وسوسوں میں گھرا ہوا تھا اور اس جیسے جانے اور کتنے لوگ تھے جن کو ہمت دلانے کی ضرورت تھی۔

عباس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا، وہ جوان باتوں میں اتنا مصروف تھا چونک کر پیچھے کو پلٹا۔

☆☆☆

"آداب عرض ہے۔" عباس نے اس آنے والے کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی، وہ خورشید جہاں کا خاص ملازم تھا جس کے ساتھ وہ اکثر باہر آتی جاتی تھی۔

"ذرا ادھر آیئے گا۔" اس نے بڑے معذرتی انداز میں عباس کو دوسری طرف آنے کا اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہیے میاں کیسے گزر رہی ہے؟" وہ ایک طرف کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"جی کرم ہے پروردگار کا۔"

"میاں ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ خورشید بٹیا نے کل آپ کو اپنی کوٹھی پر یاد کیا ہے اور خاص تاکید کی ہے کہ آنا بھولیے گا مت۔" اتنا کہہ کر وہ جھک کر آداب کہتا واپسی کے لئے مڑ گیا۔

"پتہ نہیں سلطنت ڈھاکہ سے واپس آئی ہے کہ نہیں۔" اس کا ذہن ایک دم سلطنت کی طرف سفر کر گیا۔

"اب تک تو آ جانا چاہیے تھا کتنے دن ہو چلے ہیں۔" اپنے آپ سے اندر ہی اندر کچھ کہتا وہ واپس مڑنے لگا تو پھر اس کی آواز نے قدم رک لئے۔

"اور ایک بات میاں، انہوں نے کہا تھا کہ شام سے پہلے آیئے گا۔" عباس چلتا ہوا اسی دکان کے قریب آن رکا۔

"آپ نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں، ہم تو پاکستان نہ جانے کی رٹ لگائے بیٹھے تھے۔" اس آدمی کی بات سن کر عباس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پچھلے چند روز سے ہمارا گھر جھگڑے کی زد میں تھا، سارے گھر والے جانے پر زور دے رہے تھے اور میں اکیلا نہ جانے کی رٹ لگا رہا تھا، لیکن آپ کی باتوں نے میرے ذہن کو اپنے وطن کی محبت سے منور کر دیا ہے، اپنا گھر اپنا ملک، اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں ہوتی۔"

"ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں، خدا تمہاری خوشیوں کی عمر لمبی کرے۔" وہ آدمی اس کے کندھے پر تشکرانہ تھپکی دیتا ہوا آگے کو بڑھ گیا، چائے فروش کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

"میں مر جاؤں گا مگر اس گھر سے باہر قدم نہیں نکالوں گا۔"

"امین تم سمجھتے کیوں نہیں ہو یہ ملک ہمارا نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھیا، اگر یہ ملک ہمارا نہیں ہے میں کیسے مان لوں کہ وہ ملک ہمارا ہو گا جسے میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔" اس نے ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے آنگن میں بچھے تخت پر دونوں ماموں بحث کرتے

نظر آئے، بڑے ماموں نے ہاتھ میں اخبار پکڑ رکھا تھا۔

"تم وہاں چل کر تو دیکھو وہاں کی ہر چیز ہماری ہو گی، وہاں کے لوگ، وہاں کی فضا میں جن میں مندر کے گھنٹے نہیں اذان کی آواز گونجتی ہے۔"

"آپ جو مرضی کہیں لیں میں نہیں جانے کا۔" چھوٹے ماموں اپنا فیصلہ سنا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یار میری بات تو سنو۔" بڑے ماموں پچھلے کئی روز سے انہیں سمجھا رہے تھے مگر وہ ماننے میں نہیں آ رہے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں بھائی میاں، لیکن جو آپ کہہ رہے ہیں میں ایسا نہیں کروں گا، آدھی سے زیادہ زندگی گزر چکی ہے اور جو زندگی کے سال بچے ہیں میں یہیں گزارنا پسند کروں گا۔" وہ یہ بات کہنے کے بعد سے دروازہ پار کر گئے، عباس آنگن میں آ چکا تھا۔

باہر گلی میں برابر والے مکان سے سامان اٹھ رہا تھا، چھکن صاحب بھی کراچی کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے، امین کا فیصلہ سن کر وہ تو آگ بگولہ ہو گئے۔

"اے لو میاں، یہ ملک بنا کس لئے ہے جب ہم نے وہاں بسنا ہی نہیں ہے مجھے تو لگتا ہے جناح صاحب اتنی دیر سے جھک ہی مار رہے تھے۔"

"کیسے سمجھاؤں میں سب کو۔" چھوٹے ماموں منہ میں بڑبڑائے، اتنی دیر میں بڑے ماموں بھی دہلیز پار کر کے باہر آ چکے تھے۔

"میاں، آپ ہی سمجھائیں انہیں۔" وہ ان دونوں کے قریب چلے آئے۔

"وقت ہے ابھی سنبھل جاؤ، بعد میں پچھتانا پڑے گا۔" چھکن صاحب چھڑی ہاتھ میں پکڑے امین ماموں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اتنی دیر سے جو ہم یہاں رہ رہیں ہیں تو کیا اپنا گھر سمجھ کر نہیں رہ رہے تھے، صدیوں سے ڈیرہ ہے یہاں ہمارا، تب تو کوئی خیال نہ آیا اور آج اسے دیار غیر کہہ کر، چھوڑ رہے ہیں۔"

"اے لو کر لو بات، امین میاں آپ کو کیا ہو گیا ہے جو آپ یہ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، یہ ملک کب تھا ہمارا۔" امین ماموں کو بات سن کر پھر تاؤ سا آ گیا مگر انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

گھر میں جو ان دنوں بات چل رہی تھی اس سے برعکس اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔

خورشید کا پیغام پا کر اس کو اک بے چینی نے آن گھیرا تھا۔

"جانے کیا بات ہے، سلطنت آئی یا نہیں۔"

دوسرے دن جاتی دوپہر کے ساتھ ہی وہ بھی گھر سے باہر نکل آیا، گرمی کے مارے ہر ذی روح کا برا حال تھا، خالی سڑکوں پر کبھی کبھی کوئی موٹر شوں کرتی گزر جاتی، سڑک کے کنارے کھڑے درختوں کے نیچے بیٹھے لوگ خود کو گرمی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے، لکھنؤ شہر جو کبھی اپنی مثال آپ ہوتا تھا، آج سنسان اور اداس اداس لگ رہا تھا اس کے مکین ڈھیرے ڈھیرے یہ سرزمین چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

خورشید کے ہاں جانے سے پہلے اسے چندر داس (اس کا پرانا کلاس فیلو) سے کسی کام کے سلسلے میں ملنا تھا، اس لئے پہلے وہ اس کے پاس گیا تھا اور پھر سہ پہر کے جاتے ہی وہ

خورشید کی کوٹھی میں داخل ہو گیا، جس کی بجری کی چوڑی سڑک کے ساتھ ساتھ رنگ برنگے پھولوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، گلاب، موتیا، بیلا، ہر رنگ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا، تھوڑی دور موسری کی ٹہنیوں پر ننھے ننھے پرندے چہچہا رہے تھے۔

وہ اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوا سامنے برآمدے میں خورشید کی اماں تخت پر بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹنے میں مصروف نظر آئیں، جان پہچان تھی اس لئے وہ سیدھا ان کے پاس چلا آیا، آداب وتسلیم کے بعد انہوں نے گھر کے ملازم کے ہاتھ خورشید کو پیغام بھجوایا اور وہ بھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھی دوڑی چلی آئی اور انہی قدموں سے اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

عباس ہچکچاتے ہوئے ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ تشریف رکھیئے میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئی، اس کے کمرے سے باہر جاتے ہی عباس اطمینان سے کرسی پر بیٹھا رہا اور سرسری سا کمرے کا جائزہ لینے لگا، کمرہ عام کمروں کی نسبت کافی بڑا تھا جیسے ضرورت کی ہر چیز نے اچھے طریقے سے مزین کر رکھا تھا، خورشید جاتے جاتے ٹیبل فین چلا گئی تھی اس لئے گرمی کا احساس زائل ہو گیا تھا۔

''سلطنت پتہ نہیں آئی کہ نہیں۔'' گھوم پھر کر اس کا ذہن سلطنت کی طرف چلا گیا اور کیوں نہ جاتا، ایک وہی تو تھی جو اس تپتے موسم میں ٹھنڈی پھوار کی مانند تھی، جس کو سوچنے پر ہی ہر قسم کا برا احساس زائل ہو جاتا تھا۔

پتہ نہیں کیوں اب بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ آس پاس ہی ہے، خورشید جلد ہی کمرے میں واپس آ گئی۔

''سلطنت ڈھاکہ کیا گئی، آپ تو ملنے سے بھی گئے۔'' وہ اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولی تو اس کی بات سن کر وہ ہولے سے مسکرایا اور اسے اپنی بیماری کا بتانے لگا کہ کیسے وہ اتنے دن بخار میں مبتلا رہا۔

''اپنی اماں کی طبیعت کا سنایئے سلطنت نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں۔''

یہاں آ کر ایک بے چینی سی اس کے گرد گھومنے لگی تھی، وہ پاس نہیں تھی پھر بھی فضاؤں میں اسی کی خوشبو بسی ہوئی تھی جیسے وہ آس پاس ہی ہو اس کے، خورشید اس سے بات کر رہی تھی مگر اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔

''ہاں، بیمار تو ہیں۔'' اس سے جیسے اتنا ہی جواب بن پایا، خورشید کو بھی اس کے چہرے پر سلطنت کی ڈوبتی ابھرتی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں وہ جیسے کچھ سوچ کر اندر ہی اندر مسکرا دی۔

وہ خورشید سے سلطنت کی واپسی کا پوچھنا چاہ رہا تھا مگر وہ اس سے اور ہی سوال کیے جا رہی تھی۔

''آج کل ملکی حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ ٹینشن پر ٹینشن۔'' وہ جیسے جان بوجھ کر اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''کیا آپ پاکستان نہیں جائیں گے۔'' عباس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے تھے، بند ہو گئے، تھوڑی دیر وہ خاموش رہا پھر گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''فیصلہ ہندوستان کی قسمت کا ہوا ہے میری کا نہیں، اپنی نیا تو ابھی بیچ منجدھار میں ہی ڈول رہی ہے۔'' بات کرتے ہوئے وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔

خورشید کو وہ اس وقت کتنا سچا انسان لگا تھا جو محبت میں، میں بہت دور نکل گیا تھا ہوتا ہے ایسا کبھی کبھی جب انسان خود کو ایک کشتی کی مانند لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے وہ جہاں چاہیں بہالے جائیں اس کی قسمت، اس نے بھی تو خود کو سلطنت کے سپرد کر دیا تھا، یہ محبت اسے کہاں لے جائے گی، اس نے قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

''ڈولتی نیا کو آپ نے مضبوطی سے تھام تو لیا ہے۔'' خورشید کا اشارہ نکاح کی طرف تھا۔

''تھام تو لیا ہے مگر طوفان بھی سر پر کھڑے ہیں جو ڈولتی نیا کو سہارا دینے پر پوری طرح خوش نہیں ہونے دے رہے۔''

یہ جملہ عباس نے ادا نہیں کیا تھا، عباس چونکا آواز جانی پہچانی تھی بلکہ یہی آواز تھی جس نے اس کی زندگی کے ستونوں کی مضبوطی سے تھام رکھا تھا عباس نے خورشید کی طرف دیکھا جو ہنستے جا رہی تھی عباس نے جان لیا کہ اس نے اسے یہاں کیوں بلایا ہے۔

اتنی دیر میں خورشید کا ملازم شربت سے بھرا جگ گلاس سمیت اندر آیا تو جلدی سے کوئی پردوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا چودھویں کے چاند کی مانند آنکھوں کو خیرہ کر گیا سلطنت غرارہ پہنے کریپ سے دوپٹہ سر پر جمائے عباس کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی، ہلکا گلابی رنگ جیسے عاشق تھا اس پر شاید عباس کو یہ رنگ بہت پسند تھا اسی لئے اس پر بہت جچتا تھا۔

ملازم سے شربت لے کر وہ اسے کمرے سے باہر بھیج چکی تھی، وہ شربت سے بھرا گلاس اسے پیش کر رہی تھی، دونوں ایک دوسرے کو قیامت خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے، کمرے کی فضاؤں پر اک عجیب سا سکوت طاری ہو گیا، کیا کہہ رہے تھے یہ گزرتے لمحے، ان لمحوں کی پکار سے انجان تو دونوں نہیں تھے وہ جس رشتے کی ڈور سے بندھے تھے اس کی حقیقت سے انکار نہیں تھا ملازم کے ساتھ ساتھ خورشید بھی کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

وہ دونوں اس وقت کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے، محبت کا نشہ ان دونوں کی آنکھوں میں ڈولتا بینائی کھو دے رہا تھا، انہیں اس احساس کے علاوہ اور کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

عباس نے شربت کے ساتھ ساتھ تو اس کا ہاتھ بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

یہ خوبصورت لمحے ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں اور آج وہ بھی جگہ کا تعین کیے بغیر ہی ان لمحے کی مضبوط گرفت میں آ گئے تھے، سلطنت موم بنی عباس کی سانسوں کی گرمی کے آگے پگھل گئی تھی، آج ان دونوں کی ہستیاں اک نیا جیون پا رہی تھیں جیسے کوئی تقسیم جدا نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

''میں تمہارے بغیر تنہا نہیں جاؤں گا امین۔'' بڑے ماموں زور زور سے رو رہے تھے۔

''میرا کون ہے تمہارے بغیر، ایک دفعہ اور سوچ لو۔'' امین ماموں بھائی کی حالت پر پریشان ہو گئے تھے جو نڈھال سے اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے وہ شاید بھائی کی حالت دیکھ کر اپنا فیصلہ بدل دیتے مگر بیوی کی مجبوری بھی اڑے آ رہی تھی۔

''ہم سے جو مرضی کروالیں بھیا مگر ہم سے یہ نہ ہو گا، ہمارا اور امتحان نہ لیں۔'' نواب بوا دونوں بھائیوں کی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگیں۔

''اس ملک کے دو ٹکڑے نہیں ہو رہے، روحوں سے روحیں جدا ہو رہی ہیں، جان سے پیارے دو حصوں میں بٹ رہے ہیں۔''

دونوں ممانیاں بھی قریب بیٹھی دونوں بھائیوں کی حالت دیکھ رہی تھی، چھوٹی ممانی نے چہرے دوسری طرف پھیر لیا تھا، ان کا میکا ہی تھا وہ تو کسی قیمت پر پاکستان نہیں جائیں گی، وہ دل میں تہہ کر چکی تھیں، بڑی ممانی بہر حال اپنے خاوند کی حالت پر پریشان تھیں، بھائی سے بھائی جدا ہو رہا تھا، قیامت ہی تو تھی، زندگی میں پہلی دفعہ بڑی ممانی نے اپنے شوہر کو یوں زار و قطار روتے دیکھا تھا، وہ بھائی سے بھائی کی محبت کا اندازہ لگا رہی تھیں، خون کے رشتے میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

انہوں نے امین ماموں کی طرف دیکھا، ایک بھائی جدا ہونے کے خدشے سے رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے اور دوسرا نجانے مجبوری کی کون سی ڈوری سے بندھا ہے، یا یہ زمین جس نے جنموں اسے اپنے لہو سے سینچا ہے خود سے جدا نہیں ہونے دے رہی، یہ تو اب خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ سچ کیا ہے۔

☆☆☆

مسہری میں لیٹے لیٹے آنکھیں موندے وہ اب بھی کسی کو اپنے بہت قریب پا رہی تھی اتنے دن اس سے دور رہ کر جو دل میں پیاس کے شعلے جلے تھے انہیں عباس کی چاہت کی مست پھوار نے لمحے میں بجھا دیا تھا، اسے تو ڈھا کہ ہی برا لگنے لگا تھا، دن گن گن کے گزارے تھے اس نے، وہ قیامت خیز گھڑیاں جو اس پر بیتی تھیں، عباس کے چھونے نے ان کا درد رگ و پے سے باہر نکال پھینکا تھا، اب وہ تھی اور عباس کا مست خیال۔

کس قدر خوبصورت ہے یہ احساس، جو مجھے بے قراری بخشے ہوئے ہے، بند آنکھوں جاگتی آنکھوں، بس وہی سراپا تھا جو بار بار اس سے لپیٹ کر اسے گدگدا رہا تھا اس کی پیاس بڑھا رہا تھا، بار بار اس کے ملن کی مانگ کر رہا تھا، وہ تکیہ منہ پر رکھے شرما کر کروٹ بدل گئی مبادا کوئی چہرے پہ بکھرے ملن کے یہ رنگ نہ دیکھ لے۔

حسنی اس کے لئے ٹھنڈے پانی کا گلاس لائی تھی، مگر اس کی پیاس چاہت کی جن لذتوں سے آشنا ہو چکی تھی اسے یہ پانی سیراب نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے بڑی بے نیازی سے گلاس ایک طرف رکھ دیا، حسنی کے چہرے پر تعجب کے رنگ اترے مگر وہ بولی کچھ نہیں، بس کھڑی رہی جسے وہ اسے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔

"جاؤ اب۔" سلطنت نے اسے خاموشی سے کھڑے رہنے پر کہا جیسے وہ اس وقت اپنے اور عباس کے خوبصورت احساس کے درمیان کسی تیسرے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"بڑے نواب اور چھوٹے نواب آپ کی باتیں کر رہے تھے کمرے میں۔" حسنی کی بات پر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا کہہ رہے تھے۔" دوپٹہ سنبھالتی وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"آپ کے نکاح کی بات کر رہے تھے نواب سعادت علی خان کے بیٹے کے ساتھ۔" حسنی تو یہ سب ہنستے ہوئے بتا رہی تھی مگر سن کر اس پر جیسے کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہو، اس کا سارا بدن جیسے کسی تپش کے زیر اثر آ گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

"نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے بڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے حسنی کو دیکھا۔

"جاؤ بوا کو بلاؤ۔"

بوا کو بلا کر اس نے پتہ لگانے کے لئے بھیجا اور وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا، ملک کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے، اس

لئے نواب سعادت علی خان صرف نکاح پڑھوا کر سلطنت کو اپنے ساتھ ولایت لے جانا چاہتے تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"نکاح یہ نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔" بوا کے بھی طوطے اڑ گئے۔

"اب اگر نواب صاحب کو پتہ چل جائے کہ اس چکر میں، میں بھی شامل ہوں تو جانے کیا ہو گا۔" نواب رجب علی کا غصہ اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔

دوسرے دن اس نے بوا کے کہنے پر عباس کو خورشید کے گھر بلوایا تھا مگر وہ لکھنؤ میں نہیں تھا وہ فیض آباد اپنی آپا ناہید کے ہاں گیا ہوا تھا۔

☆☆☆

"عباس، کہاں چلے گئے ہو میاں میری جان پر بنی ہے۔" وہ پائیں باغ میں ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہی تھی، شام کا وقت تھا دادی حضور کے پاس بیٹھی حسنی گھڑونچی پر موتیے کے گجرے بنا رہی تھی آج یہ کام اس نے نہیں کیا تھا۔

وقت کا پہیہ زور و شور سے آگے بڑھ رہا تھا، دادی حضور سے یوں پریشانی سے ٹہلتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"سلطنت بٹیا، کیا کوئی پریشانی ہے۔" وہ بڑی محبت سے بولیں۔

"چند دن کی مہمان رہ گئی ہے میری بچی اس گھر میں، بن ماں کی بچی کے نصیب اچھے لکھنا میرے مولا۔" وہ دعائیں دینے لگیں۔

"نہیں تو دادی حضور، ہم تو یونہی ٹہل رہے تھے، آپ کیوں دکھی ہو رہی ہیں ہم تو اچھے بھلے ہیں۔" اس نے بامشکل خود کو قابو کرتے، ہوئے دادی کو حوصلہ دیا اور ان کے سامنے بیٹھ کر جہاں حسنی موتیے کے پھولوں کے ہار گوندھ رہی تھی۔

"سارا لکھنؤ خالی ہو رہا ہے، سارا شہر ویران ہو گیا۔" دادی کا دل جیسے کٹ سا گیا۔

"دادی حضور ابا ہماری رخصتی اتنی جلدی کیوں چاہتے ہیں۔" آخر اس نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

"پتہ نہیں بٹیا کیا جلدی ہے اسے، میں تو خود ڈرتی ہوں اتنی افراتفری میں تمہارا ہاتھ کس غلط ہاتھ میں نہ چلا جائے۔" اپنی دادی کی بات سن کر اسے جیسے حوصلہ ہوا۔

"تو آپ ابا سے بات کریں ناں ہم بھی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی، ضروری تو نہیں کہ ملک کی قسمت کے ساتھ ہماری قسمت کا فیصلہ بھی ہو جائے۔" بوا اتنے میں چائے کی ٹرالی گھسیٹتی وہاں چلی آئیں۔

"میں نے تو سو بار سمجھایا ہے مگر جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتا ہے پھر وہ اپنی بھی نہیں سنتا۔" وہ بڑے ہارے ہوئے انداز میں بولیں جیسے اب کچھ نہیں ہو سکتا، ان کی بات سن اس کے دل پر جیسے دوبارہ سے غم کی بدلی آن ٹھہری اور وہ بڑے دکھی سے انداز میں چائے پیئے بغیر ہی وہاں سے چلی گئی تو بوا چاہتے ہوئے بھی اسے نہ روک سکیں۔

☆☆☆

ناہید آپا بھی لاہور جانے کی تیاریوں میں جتی ہوئی تھیں، زینو کے خط پر خط آ رہے تھے کہ اماں کہہ رہی ہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور چلی آؤ، وہیں عباس کو پتہ چلا تھا کہ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پہلے سے زیادہ بیمار ہو گئیں ہیں وہ آپا تیاری بھی کر رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔

"دل نہیں چاہ رہا، کیسے چھوڑ کر جاؤں اپنے

گھر کو، یہ گھر میں نے کتنی محبتوں سے بنایا تھا۔" اپنے چھوٹے سے کچن سیلن زدہ آنگن میں گلاب کے پھولوں کی ڈال پکڑے اس کا دل آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔

"عباس میں جب سے بیاہ کر اس گھر میں آئی ہوں، اس گھر کے ذرے ذرے نے مجھے محبت دی ہے، میں کیسے بھول پاؤں گی اسے۔" ان کے گال آنسوؤں کی نمی سے تر ہو چکے تھے، انہوں نے غم، خوشی، کھٹے میٹھے دن، سب کچھ ہی تو دیکھا تھا اس گھر میں، اب کیسے چھوڑ کر جائیں یہاں سے۔

آپا کی حالت دیکھ کر اس کا دل دکھی سا ہو گیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل آیا، فیض آباد کا یہ گلاب باڑی علاقہ۔

اپنے مکینوں کی طرح اس کا دل بھی کوئی چیر رہا تھا، اس نے بھی ان گلیوں میں ٹھہرتے ان چہروں کو دیکھا تھا شناسائی کے پل صدیوں میں نہیں پلوں میں طے کیے تھے اور جو لوگ اب یہاں سے کوچ کر رہے تھے ان کو اپنی بانہوں میں بسایا تھا سہارا دیا تھا اور آج وہ لوگ اسے مجبوراً بے سہارا چھوڑے جا رہے تھے۔

"اے لوگو! اس کرہ ارض کو تباہی سے بچا لو، دنیا چاہتوں سے بستی ہے نفرتوں سے نہیں۔" لیکن اس کی پکار کون سنتا۔

عباس پیکنگ میں آپا کی مدد کر رہا تھا، ساری چیز سنبھالنے کے بعد آپا اسے اپنے چھوٹے سے باغیچے میں لے آئی، صبح انہوں نے لاہور کے لئے نکل جانا تھا حیدر بھائی بچوں کے ساتھ برآمدے میں لیٹے تھے، باغیچے میں کھلے پھولوں سے ساری فضا مہکی ہوئی تھی۔

"میں ہمیشہ اس وقت بچوں کو سلانے کے بعد ادھر آ جاتی تھی، یہ مہکی مہکی سی فضا مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔" ان کی آنکھیں پھر پانی سے بھر گئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" عباس نے بہن کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے حوصلہ دیا۔

"میں کیا کروں عباس میرا دل جیسے کوئی کاٹ رہا ہے، میں یہاں کی کسی بھی چیز کو ساری زندگی بھول نہیں پاؤں گی۔"

"آپ حوصلہ رکھیں آپا، دکھی تو سب ہیں مگر کیا کیا جا سکتا ہے، آپ دل چھوڑ دیں گی تو بھائی اور بچوں کو کون سنبھالے گا۔"

وہ عباس کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، وہ رات آپا نے کانٹوں کے بستر پر گزار دی تھی۔

وہ اس کے ساتھ ہی لکھنو آئیں تھیں جہاں بڑے ماموں اور ممانی اکبری سمیت لاہور جانے کے لئے تیار تھا۔

عباس نے اپنے بارے میں سب کو یہ بتایا تھا کہ اسے یہاں کام ہے اس لئے ابھی وہ یہاں سے نہیں جائے گا کچھ دن بعد ہمیشہ کے لئے لاہور آ جائے گا، لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا ابھی اس نے اپنے اور سلطنت کے بارے میں کچھ سوچنا تھا۔

دوسرے دن سب لوگ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے تھے گو وہ سب اپنے ملک میں جا رہے تھے مگر ہر آنکھ میں نمی تیر رہی تھی اپنے ہنستے بستے گھر چھوڑ کر جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔

☆☆☆

خورشید کے ذریعے اسے پتہ چلا تھا کہ سلطنت کسی ضروری کام کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتی ہے۔

سارا گھر سنسان پڑا تھا، امین ماموں کے دونوں بچے چپ چاپ کمرے میں پڑے دیواریں دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہی وہ گھر ہے جہاں کل تک وہ اکبری آپا کی ڈانٹ کھاتے تھے، بڑے ابا کا پیارا بڑی امی کا دلار، آج یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

"ایسی ویرانی کبھی دیکھی نہ تھی اس گھر نے۔" نوابن چائے بناتی بول رہی تھی۔

"ایسے لگتا ہے جیسے یہاں کوئی بسا نہ ہو۔" بڑے ماموں کے جانے سے وہ بہت دکھی ہو رہی تھیں۔

"دیکھو اب موئے کوئے بھی نہیں بول رہے جس سے تھوڑا سا زندگی کا احساس ہو۔" چھوٹی ممانی نے بھی رنجیدہ سے لہجے میں کہا اور نوابن سے چائے کا کپ لے کر عباس کو دینے اس کے کمرے میں گئیں، وہ گرمی کے باوجود کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا انہیں آتا دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا، وہ اس سے بھی گھر میں بکھری ویرانی کا ذکر کرنے لگیں۔

"اب تو کچھ عرصہ یونہی لگے گا، عادت جو نہیں اکیلے رہنے کی۔" اس نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب تو یہ عادت ڈالنا ہو گی۔" اتنا کہتی وہ انہی قدموں واپس لوٹ آئیں۔

کل تک وہ یہ گھر چھوڑنے پر راضی نہیں تھیں اور اب یہی گھر انہیں ویران لگ رہا ہے، اہمیت گھر کی نہیں ان میں بسنے والے انسانوں کی ہوتی ہے، جو کسی بھی مکان کو گھر بناتے ہیں، اس نے سوچا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

شام کو اس سے پہلے سلطنت خورشید کے گھر پہنچ چکی تھی، اس کا سوگوار سا حسن اسے بے چین کر گیا۔

"پریشان کی کیا بات ہے وقت آئے گا تو بتا دیں گے، نکاح کیا ہے کوئی جرم نہیں۔" عباس کے دلاسے پر بھی اسے چین نہ آیا۔

"ابا حضور نے سارے انتظام کر لئے ہیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا اور ویسے بھی اب آپ میری بیوی ہیں، زبردستی کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" عباس کے اتنے استحقاق پر اس کا دل حسن جیسے کچھ پلوں کے لئے شانت سا ہو گیا، وہ تو یونہی ڈر رہی ہے۔

اس کا وجود جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا، مگر یہ خوبصورت احساس زیادہ دیر تک نہیں رہا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں سلطنت، بھروسہ رکھیں مجھ پر۔" عباس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ ہاتھ میں نے یونہی وقت گزاری کے لئے نہیں پکڑا، آپ کے ساتھ میرا تعلق مرنے کے بعد بھی رہے گا، یہ میرا وعدہ ہے۔" سفید رنگ کے چوڑی پاجامے میں ہلکے سبز رنگ کی قمیض پہنے وہ مسہری کے قریب کھڑی تھی، کاجل سے خالی آنکھیں، جن میں کسی نامعلوم سے خوف کی پرچھائیاں سر نکالے جھانک رہی تھیں، عباس کے اندر تک اتر گئیں۔

کانوں میں چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں آویزاں تھیں، عباس اسے بہلانے کے لئے یونہی ان بالیوں سے کھیلنے لگا تو اس نے شرم سے گردن نیچے کو جھکا دی۔

"یہ سب میرا ہے اسے کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا۔" عباس نے فرط جذبات سے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ایک بار پھر پیار کا بادل ٹوٹ کے برسا تھا۔

☆☆☆

"ہوئی بات ان سے۔" بوا کمرے میں آئیں تو وہ آگے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی،

دھیان کہیں اور تھا اس لئے ان کی بات سلطنت نے سنی نہیں۔

"نواب زادی ہم آپ سے مخاطب ہیں۔"

بوا کی دوسری پکار پر وہ چونک گئی اور کمرے میں ان کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر کھلے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"عباس میاں ملے تھے؟ کیا کہا انہوں نے؟" بوا نے اوپر تلے دو سوال کر ڈالے۔

"انہوں نے۔" وہ اچانک ان کے سوال پوچھنے پر ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ اس نے کیا کہا تھا لیکن اسے اس کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ عباس کی چاہت کا بادل ایک بار پھر ٹوٹ کے برسا تھا اس کے دل کی زمین پر، سوکھی زمین سیراب ہوئی تھی۔

ذہن کے پردے پر جیسے سفیدی سی پھر گئی تھی، یاد کرنے پر بھی کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

"کہاں کھو گئیں بٹیا۔" انہوں نے یوں اسے کہیں کھو جانے پر پریشان ہو کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا، اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے پانی کا گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا، بوا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، ذہن کو ہوش میں لاتے ہوئے اسے کچھ کچھ یاد آیا۔

"کہہ رہے تھے کہ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔"

"کب بٹیا کب، اب تو پانی سر تک پہنچ چکا ہے، مجھے تو تمہاری فکر ہے، نواب صاحب غصے میں کہیں؟" بوا نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو سلطنت بھی تھوڑی دیر کے لئے پریشانیوں کی زد میں آ گئی۔

☆☆☆

آج کل وقت بنستی ہواؤں کے کندھوں پر سوار تھا، تیزی جیسے اس کے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

زینو کے اوپر تلے دو خط اسے موصول ہوئے تھے، ماموں اور آپا لاہور خیریت سے پہنچ چکے تھے مگر بری خبر یہ تھی کہ اماں کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی بلکہ بقول زینو کے کہ وہ صرف عباس بھائی کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔

زینو نے اماں کا جس طرح ذکر کیا تھا اس کا دل چاہا وہ اڑ کر لاہور چلا جائے، ماں آخر ماں ہوتی ہے وہ لاکھ اپنے آپ میں مگن تھا مگر ماں کی بیماری نے اسے ہلا ڈالا۔

لاہور جانے سے پہلے وہ ایک بار سلطنت سے ملنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت سلطنت کے ساتھ میر انیس کی آخری آرام گاہ پر موجود تھا، وہ جانے سے پہلے اس سے ملنا چاہتا تھا اتنا لمبا سفر، کہتے ہیں سفر کرنے سے پہلے جس آخری چہرے کو آپ دیکھتے ہیں وہی سارے سفر میں آپ کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، وہ بھی اسے آنکھوں میں بسائے سارا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کی چادر میں لپٹا اس کا نورانی چہرہ، پانی کے بوجھ تلے دبی کاجل سے خالی آنکھیں، کپکپاتے ہونٹ، عباس نے نجانے کیا سوچ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا، کیسے جا پاؤں گا میں۔

کافی دیر دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی، بس خاموشی تھی جو دونوں کو ایک دائرے میں مقید کیے ہوئے تھی، عباس دوبارہ اس کی طرف رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"عباس میں کیا کروں گی آپ کے بغیر، میرے ابا کو آپ نہیں جانتے۔" اس نے عباس کا

ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو وہ اس کے اور نزدیک ہو گیا۔

"میری تو مجھے صرف چند دن اور دے دے، میں جلد لاہور سے آ کر نواب صاحب سے خود مل لوں گا۔" وہ روتی ہوئی مچل کر اس کے کندھے سے جا لگی۔

"عباس کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔"

"میری زندگی۔ ساتھ ہی سب ختم ہو گا، جب تک میری زندگی۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا ہو گا، میں واپس آؤں گا ہم دونوں کی زندگی کے لئے۔"

عباس ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف اس کی ماں تھی اور دوسری طرف اس کی زندگی اور اس وقت اسے ماں کی زندگی زیادہ اہم لگ رہی تھی، اولاد ہونے کا فرض اسے لاہور کی طرف کھینچ رہا تھا جہاں اس کی ماں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

☆☆☆

وہ چلا گیا تھا مگر وہ جیسے کانٹوں کے بستر پر لوٹنے لگی تھی کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔

اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اس ملک کی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کی قسمت میں ابھی چین نہیں تھا، عباس کو لاہور گئے سات آٹھ دن ہو چلے تھے اور اس کی تو جیسے خوشیاں ہی اس کے ساتھ چلی گئیں تھیں۔

نواب صاحب جی کمرے میں آئے تب وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی، انہیں آتا دیکھ کر اس نے دوپٹہ جلدی سے سر پر اوڑھ لیا، نواب صاحب کو وہ اس وقت بہت پریشان اور بیمار لگی تھی ان کا جیسے دل بھر آیا۔

"ہم ٹھیک ہیں ابا حضور، آپ نے کیسے زحمت کی ہمیں بلا لیا ہوتا۔"

"اپنی بیٹی سے ملنے کو دل چاہا، میں چلا آیا۔" اس نے کرسی ان کے قریب کر دی، وہ بیٹھ گئے اور وہ ان کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ میری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے تم نے بہت اکیلے وقت گزارا ہے، بحیثیت باپ مجھے تمہیں وقت دینا چاہیے تھا۔" وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جتنا مرضی خود سر ہو کر اس نے وہ کام کر لیا تھا مگر تھی تو وہ ایک بیٹی۔

"میں اب اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں، میں اپنی بیٹی کو ایک ایسا جیون ساتھی دینا چاہتا ہوں جو ہمیشہ اس کا ساتھ دے اس کے ساتھ رہے۔" وہ بھی بات کرتے ہوئے رو دیئے انہوں نے کرسی سے اٹھ کر سلطنت کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"جیون ساتھی۔" سلطنت کی جان جیسے حلق کو آ گئی، آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

"یہ کیا کہہ دیا ابا حضور نے، یا اللہ میری سننے کی طاقت کو چھین لے مجھ سے، میں ایسا کچھ بھی کر نہیں پاؤں گی۔" اس نے روتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی۔

"چند روز میں آپ کا نکاح ہے۔"

ابا حضور کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی، کانوں کے آگے جیسے سائیں سائیں ہو رہا تھا وہ کیا کہہ رہے تھے کہ اسے کچھ پتہ نہ تھا اسے لگا باہر گئے اور کیسے وہ مسہری تک آئی۔

"عباس آپ تو کہتے تھے کہ میں پریشان نہ ہوں، اب آپ بتائیں میں کیا کروں۔" وہ رو رو کر عباس کے خیالوں سے مخاطب تھی، مارے خوف کے اس کا بدن کانپ رہا تھا، میں تو عباس کی امانت ہوں میں کیسے یہ سب، وہ بستر میں سر دیئے زور زور سے رونے لگی، بوا بھی سن کر سکتے میں آ گئیں۔

"چند روز۔"
"اب تو نواب صاحب کو بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"
"لیکن کیسے بوا، مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب، ابا مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔" وہ دونوں ہاتھوں کو سینے کے ساتھ جوڑے ڈر کے مارے رو رہی تھی۔
"ایک نہ ایک دن تو بتانا ہی پڑے گا، یہ باتیں چھپی تھوڑی رہتی ہیں اور ویسے بھی نکاح کے روز بتایا تو نواب صاحب کی عزت خاک میں نہ مل جائے گی، آپ آج ہی بات کریں نواب صاحب سے۔"
اسے پتہ تھا جس دن یہ بات ابا حضور تک پہنچی وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔
"آپ سب جانتی ہیں پھر بھی ایسا کرنے کو کہہ رہی ہیں۔"
"پھر دوسرا کون سا راستہ ہے بٹیا، آپ نے تو خود کو بھی اور مجھے بھی مشکلوں میں پھنسا دیا۔" بوا کے شکوے پر وہ ان کے قریب چلی آئی۔
"آپ ہی مجھے بچا سکتی ہیں بوا۔" وہ ان کے گلے سے جا لگی تو ان کا دل پسیج گیا۔
"دعا مانگیں مولا سے، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔"
"مولا مشکل کشا میری مدد کو آیئے۔"
وہ کام اس سے ہو تو گیا تھا لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کا سامنا کر سکتی، بیٹیاں تو ماں باپ کا مان ہوتی ہیں، لیکن جو حرکت اس سے ہوئی تھی وہ اس کے ابا حضور کو بے نامی کے اندھے کنویں میں پھینک دے گی، زمانے کی انگلیاں اٹھیں گی ان پر، وہ کس کس کے سوال کا جواب دیں گے۔
"یہ باتیں اسے اس وقت یاد کیوں نہ آئیں۔" اس کے اندر سے جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا، عباس کے پیار کی پٹی کیا اتنی مضبوطی کے ساتھ آنکھوں پر بندھی تھی کہ اسے اور کچھ بھی یاد نہ رہا۔
اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز سن کر اس کی ہچکی بندھ گئی، وہ کیسے سمجھاتی سب کو یہ محبت میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم سوچنے کا موقع نہیں دیتا، اس نے عباس سے حقیقی محبت کی تھی اور وہ اس بات پر شرمندہ بھی نہیں تھی، مگر نجانے کیوں اپنے ابا حضور کو دیکھ کر اسے احساس گناہ ستانے لگا۔
بوا کمرے سے باہر چلی گئی تو وہ کھلی کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی، باہر تپتی دھوپ کو اپنے پروں تلے ڈھانپتے ہوئے کالی گھٹائیں دوڑی چلی آ رہی تھیں آناً فاناً سارا آسمان سیاہ رنگت اختیار کر گیا اور چھم چھم بارش برسنے لگی۔
"عباس تمہارے بغیر میں ان مشکل لمحات کا سامنا کیسے کروں۔" آنکھیں بھی برسات لٹا رہی تھیں۔
دن کب ختم ہوا رات کب آئی اور کب گئی اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا تو صرف یہ کہ وہ کیا کرے۔
انجان راہوں پر اپنے لئے راستہ تلاش کرتی وہ جانے کہاں کی کہاں پہنچ گئی، جانے کیسے کیسے ریگ زار پیروں میں چھید ڈال رہے تھے، کیسے کیسے سمندر حائل تھے۔
"پار کر پاؤں گی یا ان پانیوں میں ڈوب جاؤں گی۔"
ایسی ہزاروں سوچوں کو سوچتی بالآخر وہ ایک راستے پر آن کھڑی ہوئی جس پر چلنے کے سوا اسے کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔
راستہ چن تو لیا تھا اس نے مگر وہ یہ سب کیسے کرے گی۔

بوا کے سامنے اظہار خیال کرنے کے بعد وہ ایک طرف نڈھال ہو کر بیٹھ گئی، بوا کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، سالوں سے وہ نوابوں کا نمک کھاتی آئی تھی، کیسے کرتی وہ یہ سب، لیکن وہی بات کہ چارہ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

"میں یہ سب نہیں کر سکتا۔" اماں بستر مرگ پر لیٹی اس سے اپنی آخری خواہش کا اظہار کر رہی تھیں یوں تھا کہ بس لبوں پر جان تھی، جب سے وہ لاہور آیا تھا ان کا ایک ہی تقاضا تھا، اکبری کو اپنی زندگی میں شامل کر لو اور وہ انہیں ٹال رہا تھا، لیکن آج پھر وہی بات ان کے لبوں پر تھی۔
"میرے بھائی کی آس کو نہ توڑو عباس۔"
"اماں آپ بیمار ہیں اتنا مت سوچیں۔"
اس نے بڑے پیار سے بیمار ماں کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"میرا بھائی مایوس لوٹا تو میں تمہیں قیامت کے روز معاف نہیں کروں گی۔"
اماں کی بات سن کر اس نے ٹھنڈی سی آہ بھری اب وہ اپنی ماں کو کیا بتاتا کہ اگر وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو قیامت کے روز نہ وہ اور نہ اس کا ضمیر اسے معاف کرے گا۔
"میں اتنی دور سے صرف آپ کو ٹھیک دیکھنے کے لئے آیا ہوں، آپ اس بات کو لے کر مزید بیمار ہو جائیں گی۔"
"اماں ٹھیک کہتی ہیں عباس چھوڑو ضد کو۔" ناہید دہلیز کے اندر قدم رکھتیں بولیں، عباس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور ان کی بات سن کر تاؤ سا کھا کر رہ گیا، ان کے پیچھے پیچھے بڑے بھیا حسن بھی کمرے میں چلے آئے، جو کافی دنوں سے ماں بیٹے میں ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔
گھر میں کافی رونق لگی ہوئی تھی، ناہید آپا کے بچے حیدر بھائی، بڑے ماموں ممانی، چھوٹے چچا سب لوگ بھارت کو خیر باد کہہ چکے تھے، دونوں بھابیاں باورچی خانے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھیں، بڑی بھابھی اندر سے جل بھن گئی تھیں اتنے سارے لوگ جمع تھے گھر میں، کام سے تو فرصت نہ ملتی، زینو اور ناہید تو ماں کو سنبھال رہی تھیں۔
"میں ضد نہیں کر رہا، میرے انکار کو آپ ضد کا نام نہ دیں میں اکبری کو پسند نہیں کرتا۔" یہ بات اس نے بہت آہستہ سے کہی تھی جو صرف ناہید آپا نے سنی تھی۔
"تمہارے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں میاں۔" وہ بدک کر اٹھ گئیں۔
"کیا کہہ رہا ہے یہ۔" بڑے بھیا بھی غصے سے بولے، اماں کا نقاہت سے برا حال تھا۔
"ہم سچ کہہ رہے ہیں۔"
"بڑے آئے سچ کہنے والے۔" آپا اس کا ہاتھ پکڑتی کمرے سے باہر نکل آئیں، آگے دونوں بھابیاں دادی اماں کے ساتھ آنگن میں بیٹھی تھیں، ناہید کو یوں عباس کا ہاتھ پکڑے لے جاتے ہوئے دونوں بڑے معنی خیز انداز میں ہنسیں۔
"جانے کیا چل رہا ہے ان ماں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان۔" چھوٹی بھابھی بولیں۔
"ہمیں کیا لگے جو مرضی چلے۔" بڑی بھابھی نے نخوت سے ناک سکوڑی۔
"کیوں بڑے بھیا نے کوئی بات نہیں کی ہوتے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔"
"بڑے گھنے ہیں، اندر کی بات کبھی نہیں بتاتے اور ہمیں کیا ان کے معاملے میں خود ہی سمیٹیں۔"

"بچی بھابھی حسین تو ایسے نہیں ہیں، ہر بات کا ذکر کرتے ہیں وہ میرے ساتھ، اندر باہر کی ساری باتیں۔" چھوٹی بھابھی نے پتہ نہیں ظہورن بھابھی کو جلانے کے لئے یہ بات کہی تھی یا واقعی وہ ایسے تھے، ظہورن بھابھی کے چہرے کے تیور یکدم بدل گئے۔

"خوش قسمت ہو دیورانی صاحبہ جو میاں صاحب دل کی بات نہیں چھپاتے ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ ہوتا کہ ان کی جیب میں کتنے پیسے ہیں، دل کی بات تو دور ہے۔"

☆☆☆

"بولو کوئی اور تو نہیں دیکھ رکھی۔" ناہید آپا نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے سوال دغا۔

"دیکھ رکھی بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ سنجیدہ سا ان کی غصے سے بھری شکل دیکھ رہا تھا۔

"میں دیکھ رکھی بھی ہو تو واقعی ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارے لئے جو اکبری ہے وہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔"

"آپا آپ ہماری بڑی بہن ہیں، آپ تو سمجھیں ہمارے دل کی بات۔"

"تمہیں سمجھوں یا ماں کو دیکھو جو بستر مرگ پر ہے، تمہیں اپنا ارادہ بدلنا ہوگا۔" وہ بضد تھیں، وہ اٹھ کر بددل سا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

مجبوریاں تو انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں انسان چاہیے جتنا مرضی ان سے پیچھا چھڑائے۔

سلطنت کا چہرہ نظروں کے سامنے آیا تو اس کا دل غم سے بھر گیا جانے کس حال میں ہو گی وہ، زینو اس کے لئے چائے کا کپ لائی۔

"آپ کو اس حال میں دیکھ کر میرا دل بہت جلتا ہے بھیا۔" چائے پکڑانے کے بعد وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"وہ نواب زادی بہت یاد آتی ہیں؟"

عباس کو لگا جیسے کسی نے بہت بھاری پتھر اس کے سینے پر لا رکھا ہو، تکلیف سی محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں اپنے دکھ کو اپنے اندر رکھ کر وہ نڈھال ہو چلا تھا کسی کے ساتھ تو وہ اپنے دل کی بات کہے۔

"وہ نواب زادی آپ کی بھابھی بن چکی ہے۔" دھپ کر کے کوئی چیز زینو کے سر پر آن گری۔

"بھابھی۔"

"ہاں میں سول میرج کر چکا ہوں۔"

"بھیا لیکن اماں، اکبری۔" حیرانگی سے اس کا منہ کھل گیا۔

"یہ بات میں نے صرف تم سے کہی ہے، کسی کو علم نہیں ہے۔" اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"وقت آنے پر سب کو بتا دوں گا۔"

بیمار ماں کا سوچتے ہوئے زینو کے اوسان خطا ہو رہے تھے، وہ تو نواب زادی کے ساتھ بھیا کے چکر کو بس چکر ہی سمجھ رہی تھی اسے یقین نہیں تھا کہ بھیا اتنا بڑا قدم اٹھا لیں گے۔

☆☆☆

اس محبت نے بڑے بڑے قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اک آخری نظر اپنے بنگلے پر ڈالتے ہوئے اس کا رواں رواں اشک بار تھا، اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑ دے، وہ اپنے ابا حضور کا سامنا نہیں کر سکتی تھی، اپنے اپنے پیارے رشتوں کو چھوڑ کر وہ اپنے گھر کی دہلیز پار کر آئی تھی، رات کے اندھیرے میں بنگلے پر پھیلے چاندنی کے سائے، کل صبح بدنامی کے دھبوں میں بدل جائیں گے یہ گھر آج رات تک

عزت و احترام کا مرکز ہے، کل کا ابھرتا سورج اپنے ساتھ لوگوں کی اس گھر پر اٹھتی انگلیاں بھی لائے گا، کیا کیا نہ ہو گا کل، کل کل، اس نے اپنی سیاہ چادر کو اپنے سراپے پر پھیلے ہوئے دیکھتے سوچا، یہ چادر کیا چھپا پائے گی اس گناہ کو جو وہ کرنے جا رہی تھی، اپنے باپ کو "بدنامی" جیسے قاتل کے ہاتھوں سونپنا، کیا یہ گناہ نہیں ہے؟ کیسے کل کو وہ اس سڑک پر چلتے لوگوں کا سامنا کریں گے، کیا ان کی اٹھتی نظریں چھید نہ ڈالیں گی ان کے بدن میں۔

کیسے کیسے سوال تھے جو اس کا ضمیر اس کے گرد دائرہ کھینچے اس سے کر رہا تھا، آنسوؤں کی مالا تھی جو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھی، کیا بکھری ہوئی چیزیں سمیٹی جا سکتی ہیں؟ ہاں اس کے اندر سے پکار سی گونجی، چیزیں سمیٹی جا سکتی ہیں مگر دل کے ٹکڑے اور زمانے کے ہاتھ آئی بات، کوئی سمیٹ نہیں سکتا، چاہ کر بھی نہیں۔

ندامت کے بادل جیسے اس کے گرد جمع ہونے کی کوشش کر رہے تھے بار بار اس کا ذہن اس نقطے پر آ رہا تھا کہ جیسے اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، محبت غلط نہیں ہوئی ہاں کبھی کبھی اس کو پانے کے غلط طریقوں کا استعمال انسان کر بیٹھتا ہے جس سے محبت بھی بدنام ہو جاتی ہے۔

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا وہ دہلیز پار کر آئی تھی اپنے گھر کی۔

☆☆☆

تاروں بھرے آسمان کے نیچے تنہا و پریشان دل کے ساتھ وہ تخت پر لیٹا تھا چھت پر کوئی اور نہیں تھا اور اس وقت وہ کسی اور کی موجودگی چاہ بھی نہیں رہا تھا۔

کل رات سے اس کا دل بہت پریشان سا تھا سارا دن بھی یونہی گزرا، پتہ نہیں سلطنت کیسی ہے، وہ حقیقت میں اس کی وجہ سے پریشان تھا، اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی کوئی بہت اہم شے اس سے جدا ہو رہی ہے، یا چھن گئی ہے۔

کیا کروں اور کیسے حل کروں اس مسئلے کو۔

سارے گھر والے آنگن میں اپنی چارپائیوں پر پہنچ چکے تھے لیکن اس نے زینو سے کہہ کر اپنا بستر چھت پر بچھوایا تھا، وہ تنہائی چاہتا تھا جہاں وہ ہو اور سلطنت کا خیال، تھوڑی دیر پہلے وہ اماں کے پاس سے اٹھ کر اوپر آیا تھا، وہ جب بھی ان کے قریب ہوتا اور اگر وہ زبان سے کچھ نہ کہتیں تو ان کی آنکھیں اس کے دل پر کڑا ہاتھ ڈال لیتیں، وہ اس کی ماں تھیں انہیں یوں اس حال میں بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

بڑے ماموں اپنی فیملی سمیت پرسوں سے ابرار میاں کے ہاں گوالمنڈی میں تھے، ناہید آپا کے ساتھ ساتھ حسن بھیا کی شکوہ کناں نظریں اسے جیسے مجرم ٹھہراتی رہتیں، سب کا خیال تھا کہ اب اگر اماں یوں موت کی طرف بڑھ رہی ہیں تو اس میں اس کی "نہ" کا زیادہ دخل ہے۔

گھر میں صرف زینو تھی یا اس کے بعد اس کی دادی جان جو اسے جان سے بھی زیادہ چاہتی تھیں، وہ تھیں جنہوں نے کبھی اس سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

"میرے لال کی بھی مان لو کیا ہرج ہے اچھا سمجھ دار بچہ ہے کوئی غلط فیصلہ تھوڑی کرے گا اپنے بارے میں، اپنی مرضی ضرور تھوپنا ہے اس پر۔" مگر ناہید آپا انہیں چپ کروا دیں۔

"دادی اماں اس کے بڑے ہیں اس کا اچھا برا سوچنے کے لئے، اپنی من مانی کر کے ہم اس کی زندگی تباہ نہیں ہونے دیں گی۔"

آپا کی بات سوچ کر اس کے اندر ایک بار پھر غصہ سا ابھر گیا، اس لئے اسے کچھ بھی اچھا نہیں

لگ رہا تھا۔

ہوا برائے نام ہی چل رہی تھی جس زدہ سی فضا نے ماحول کو عجیب افسردہ سا بنا دیا تھا، اس نے کچھ سوچتے ہوئے کروٹ بدل لی تو ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے اوپر کو اٹھتی سڑھیوں کی طرف اپنا رخ موڑ لیا، زینو پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے اس کے قریب چلی آئی اور اسے جاگتا پا کر پانی سے بھرے جگ کو چھوٹے سے لکڑی کے اسٹول پر رکھ کر اس کے پیروں کی طرف بیٹھ گئی۔

"آپ سوئے نہیں ابھی۔" زینو کے پوچھنے پر اس نے اپنی کھلی آنکھیں بند کر لیں۔

"ناہید آپا کی باتیں بری لگیں آپ کو؟" زینو سمجھ گی کہ تھوڑی دیر پہلے ناہید آپا جو اس سے باتیں کر رہی تھیں وہ انہوں نے دل پر لے لی ہیں۔

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔" اس نے جیسے اسے اپنی طرف سے دلاسہ دینا چاہا مگر وہ تو جیسے آگے بھرا پڑا تھا ایک دم پھٹ پڑا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں، بولو زینو۔" وہ ایک جھٹکے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میری زندگی داؤ پر لگی ہے اور سب کو اپنی پڑی ہے، کوئی میرے بارے میں بھی سوچ رہا ہے۔" آج پہلی دفعہ وہ اتنے جوش سے بولا تھا۔

"سلطنت نہ جانے کس حال میں ہو گی، میں اسے جس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں میرا دل ہی جانتا ہے۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا اور کسی احساس کے تحت اپنی انگلیوں سے اپنے ماتھے پر آئے بالوں کو جھنجھوڑنے لگا۔

"میں اس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔" زینو سے عباس کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔

"اتنی محبت کرتے ہیں آپ ان سے۔" بنا دیکھے ہی زینو کو سلطنت پر ڈھیروں پیار آ رہا تھا جس نے اس کے جوان بھائی کو اپنے پیار سے اپنی زلفوں کو اسیر بنا لیا تھا۔

"ایک بات کہوں عباس بھیا۔" عباس نے بند آنکھوں سے ہی "ہوں" کہا۔

"آپ اکبری سے بات کریں۔" زینو کی بات پر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"اسے کہیں کہ وہ خود ہی اس رشتے سے انکار کر دے۔" زینو کی بات پر اسے یاد آ گیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی وہ ایسا کرنے کی کوشش کر چکا ہے جو کہ بڑی بری طرح ناکام ہو گئی تھی بلکہ وہ تو کچھ غلط ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ مان جائے گی۔" عباس نے ایسے زینو کی طرف دیکھا جیسے اس نے کوئی نادانی والی بات کہہ دی ہو۔

"کوئی لڑکی کبھی یہ برداشت نہیں کرتی کہ کوئی اسے ناپسند کرے اور پھر وہ جس سے اس کی شادی ہو رہی ہو، آپ کے انکار کو اپنی بے عزتی سمجھ کر وہ میرا خیال ہے انکار کر دے گی۔" زینو کی بات اسے پسند آئی تھی شاید اب کی بار کام بن جائے اور وہ اپنے منہ سے خود ہی انکار کر دے۔

☆☆☆

"آگرہ۔" شاہان مغلیہ کی ایک عظیم یادگار، یہ وہ شہر ہے جہاں آ کر لوگ محبت پر یقین پاتے ہیں جس کے زرے زرے نے دنیا کو محبت کر کے اسے نبھانے کی تعلیم دی ہے۔

کوئی امیر ہو یا غریب، یہ ایسا جذبہ ہے جو سب پر یکساں نچھاور کیا جاتا ہے، کوئی جھونپڑے میں بیٹھ کر اس کی نرماہٹ کو دل میں محسوس کرتا ہے اور کوئی محلوں میں اس کی پکار سنتا ہے۔

محبت زندگی تک کا رشتہ نہیں ہے اس کا تعلق مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے اور اس بات کا ثبوت اسی شہر میں ملتا ہے۔

"تاج محل" سفید سنگ مرمر سے بنا ایک حسین شاہکار، جسے دیکھ کر دل میں سویا محبت کا دیوتا جاگ اٹھتا ہے اور پکار پکار کر کہتا ہے۔

"اے لوگو! میں محبت ہوں، مہد سے لحد تک میں تمہارے ساتھ ہوں، میرے دم سے اس دنیا کی رنگینی ہے، یہ دنیا ایک ایسی کشتی ہے، جو ہر وقت طوفانوں کی زد میں رہتی ہے، میرا ساتھ تمام تکالیف سے نجات دے دیتا ہے۔"

تاج محل اس کے ٹھنڈے سفید سایوں میں بیٹھ کر دنیا کا غم پل بھر کے لئے کہیں غائب ہو جاتا ہے اس کے ساتھ بہتی جمنا، صدیوں سے پیار اور ملن کے گیت گاتی آگے بڑھتی رہتی ہے اور اپنی طرف آنے والوں کو بتاتی ہے کہ یہ تاج محبت کرنے والوں کی پناہ گاہ ہے اس کے سائے تلے جو بھی آئے گا وہ سمجھ محبت کے سائے تلے چلا آیا۔

بوا اسے اپنے ساتھ آگرہ لائی تھیں جہاں ان کی رشتے کی بہن حمیدہ بانو رہتی تھیں، وہ ان کے ساتھ ایک ایسے گھر کے سامنے کھڑی تھی جو اس کے نوکروں کے شایان بھی نہیں تھا۔

ٹوٹا پھوٹا کچی مٹی سے بنا گھر جس کا خستہ حال دروازہ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا اندر آنے کے لئے خود ہی راستہ دے رہا تھا، چھوٹی چھوٹی دیواریں جن کو کوئی بچہ بھی پھلانگ سکتا تھا ایک دو جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں، ٹوٹی ہو جگہ پر جھاڑ جھنکار کھڑی کر کے راستہ روکا گیا تھا، لمبی سی گلی اور گلی کے دوسری طرف قبرستان، اس کا دل دہل گیا، کیا یہاں رہنا ہے اسے، اس نے آنسو پیتے ہوئے بڑے کرب سے سوچا اور بوا کے ساتھ اندر چلی آئی، اندر بھی باہر والی حالت تھی، بڑے سے سیلن زدہ آنگن کی ایک نکڑ میں چھوٹا سا کمرہ جس کے آگے ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا پردے پر جنم جنم کی میل جمی ہوئی تھی اسے دیکھ کر ابکائی آ گی بڑی مشکل سے اس نے خود کو روکا۔

اپنے ہاتھ میں مختصر سا سامان پکڑے بوا اس کے آگے آگے چل رہی تھی، برسات کے دن تھے، بارش برس کر تھم چکی تھی مگر آنگن میں جگہ جگہ بارش کا پانی جوہڑوں کی صورت میں موجود تھا، وہ اپنی شلوار کے پائنچے اوپر کو اٹھاتی قدم بڑھانے لگی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر اپنے پیروں پر ٹک گئی، سفید نرم و ملائم گداز سے بھرے پاؤں، کیا یہ ایسی جگہوں پر چلنے کے قابل ہیں اس کے گلے میں جیسے جھاڑیوں سی اگ آئیں نوکیلی خار دار، اسے لگا جیسا اس کے سانس کو کوئی ململ کے دوپٹے کی طرح نوکیلی جھاڑیوں پر سے کھینچ رہا ہو، آنسوؤں کی مالا ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی چادر میں جذب ہونے لگی۔

بوا نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

"نہ میری بچی نہ رو، میں ہوں تیرے ساتھ، پتہ نہیں کتنے دکھ لکھے ہیں تیری قسمت میں۔" بوا کے دلاسے پر اس کے دل کا بوجھ کچھ کم سا ہوا بوا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں لے آئیں، جہاں حمیدہ بانو پرانی سی کھٹیا پر لیٹی خراٹے لے رہی تھیں، بوا نے بڑے شرمندہ سے انداز میں اسے جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور بھی دونوں خالہ زاد بہنیں اک دوسرے کے گلے لگیں۔

ملنے ملانے کے بعد حمیدہ بانو سے بڑی متجسس نظروں سے سلطنت کا جائزہ لیا، "اس گھر

میں یہ نایاب ہیرا۔" انہوں نے بوا کو کچھ کر پوچھا، بوا نے ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔

"ہائے ری قسمت کی ماری، ساری نصیب کی بات ہے کہاں لکھنو کے محل اور کہاں آگرہ کا یہ کچا مکان، چلو کوئی بات نہیں آج سے اسے بھی اپنا گھر ہی سمجھو۔" حمیدہ بانو لالچی سی عورت تھی، خاوند کے مرنے کے بعد وہ اکیلی ہی تھی، بچہ وچہ کوئی نہیں تھا، بس ایسے ہی ادھر ادھر کے کام کر کے وہ اپنا گزارہ کرتی تھی اب بھی بوا نے اسے چار پیسے پکڑا دیئے تھے اسی لئے بڑی کھلی کھلی پھرنے لگی۔

سلطنت کو اس نے چادر سیدھی بچھا کر بیٹھنے کے لئے کہا تھا لیکن وہ نازوں کی پلی جس کی مسہری پر بھی گلاب کی خوشبوئیں چھڑکی جاتی تھی، وہ کیسے بیٹھتی اتنی گندی جگہ پر، بوا سب کچھ سمجھتی تھی اس لئے قریب پڑی لوہے کی کرسی، انہوں نے سلطنت کے آگے رکھ دی اور التجائی نظروں سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اب یہیں رہنا ہے آپ کو۔" بوا کے سمجھانے پر وہ اپنے دل کو سنبھالتی کرسی پر بیٹھ گئی، بوا بھی اسی عورت کے ساتھ باہر چلی گئیں۔

کمرے کے اندر ہی مٹی کا چولہا تھا اس کے پاس ہی کھانے پکانے کی چیزیں یونہی کھلی پڑیں تھیں، چولہے کے اردگرد راکھ بکھری ہوئی تھی، قریب ہی ٹوٹی ہوئی صراحی، دو تین جگہوں پر گھی گرا ہوا تھا، ان سب چیزوں نے کتنا گندا ماحول پیدا کیا ہوا تھا، اس کا دل چاہا وہ دوڑ جائے یہاں سے، اسے نہیں رہنا ایسی جگہ، مگر اب وہ دوڑ کر آگے اور کہاں جاسکتی تھی، ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا تھا جسے پتہ نہیں کہاں جاکے رکنا تھا۔

☆☆☆

زینو کو ساتھ لے کر وہ گوالمنڈی آیا تھا اکبری سے بات کرنے، زینو کو وہ اس لئے لایا تھا تا کہ کچھ ایسا ماحول بن سکے جس سے با آسانی وہ اس سے بات کر سکے۔

سب سے ملنے ملانے کے بعد زینو بڑے طریقے کے ساتھ ان دونوں کو چھت پر تنہا چھوڑ کر آئی تھی، بڑے ماموں گھر نہیں تھے۔

"میں شروع دن سے جانتی ہوں کہ آپ مجھے نہیں چاہتے، اس کے باوجود میں آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں اس لئے نہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اکبری کی اتنی بے باکی پر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"محبت اور مجھ سے؟"

"یہ بات آپ نہیں جانتے کیونکہ آپ نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔" عباس سن کر جیسے تپ سا گیا وہ کیا کہنے آیا تھا اور کیا سن رہا تھا، وہ آج پہلی دفعہ اس سے اتنی لمبی بات کر رہا تھا۔

"میں نے جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔" اکبری کے اندر جیسے کوئی تیر سا چبھ گیا، بچپن سے وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی، عباس پر یہ رشتے والی بات بہت بعد میں کھلی تھی مگر اکبری پر جلد ہی یہ راز افشا ہو گیا تھا اس لئے اس کی دھڑکنوں نے اسی نام کی مالا جپنا شروع کردی تھی۔

اکبری نے غم سے بوجھل پلکیں اٹھا کر عباس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں پھیر گیا۔

"میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں او شادی بھی اسی سے کروں گا۔"

"آپ کا مطلب سمجھ گئی میں، آپ چاہتے ہیں کہ پھر بھی اماں کو میں خود ہی جواب دے دوں، آپ میں ہمت نہیں ہے ماں کا دل دکھانے کی۔" وہ جوش سے بولی۔

"جائیے میں انکار نہیں کرتی۔"

یہ کیسا تکرار تھا جو وہ کر رہی تھی، عباس پہلے ہی اس بات کو لے کر بہت پریشان تھا اور اوپر سے اکبری کا یہ رویہ، وہ غصے سے اس سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا، محبت میں کیسا کیسا وقت آجاتا ہے، اس نے پریشان ہو کر خود سے کہا، کیا کروں میں، سوچنے کی جیسے صلاحیت کسی مفلوج ہو گئی تھی، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا، لیکن کچھ تو کرنا تھا، اس نے جیسے کچھ کہنے کے لئے پھر دوبارہ اس کی طرف رخ موڑا۔

"میں تم سے محبت نہیں کرتا اور شادی کے لئے محبت بھی ضرور ہونی چاہیے۔"

"کوئی بات نہیں محبت بھی ہو جائے گی شادی کے بعد۔" اس کا وہ دلبرانہ انداز اسے حقیقت میں چڑا رہا تھا۔

"اس غلط فہمی میں نہ رہنا۔" عباس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا اسے لگا جیسے اسے کسی نے چیلنج کر دیا ہو۔

"سید عباس زیدی صرف ایک بار کسی کی زلفوں کا اسیر ہوا ہے، بار بار وہ کسی کے دام نہیں آتا۔" وہ اتنے مضبوط لہجے میں پورا ناپ تول کر بولا تھا کہ ایک دفعہ تو اکبری کے بھی پاؤں ڈگمگا گئے۔

"میرے ساتھ شادی کا مطلب ہے کانٹوں پر چلنا اور وہ بھی نوکیلے۔" اکبری پر اک تلخ نظر ڈال کر وہ سیڑھیاں اترنے لگ گیا۔

باورچی خانے میں کھڑے ہو کر بھی اس کا ذہن انہی کی باتوں کی طرف دوڑ لگائے ہوئے تھا۔

"اگر جو وہ کہتے ہیں انہوں نے کر دکھایا تو؟" بڑا سا سوالیہ نشان اس کے گرد دائرہ کھینچ گیا، مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

"وہ جتنا خود کو ظالم پیش کر رہے ہیں اتنے وہ ہیں نہیں، وہ بس مجھے روکنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں، وقت کے ساتھ وہ اسے بھول جائیں گے۔" اپنے دل کو دلیلیں دے کر اس نے شانت کر دیا تھا۔

☆☆☆

ملک کی قسمت کے ساتھ ساتھ عباس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونے جا رہا تھا، گھر میں وہ یوں پریشان حال پھر رہا تھا جیسے اس کی کوئی بہت اہم شے کہیں کھو گئی ہے، اماں کل رات سے بے ہوش تھیں اماں کی حالت گھر کے ہر فرد کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی، بہرحال ماں بھی اس کے لئے مقدم تھی، اپنی طرف سے تو اس نے ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا تھا، مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

اب بھی سب لوگ اماں کے قریب جمع تھے، تھوڑی دیر پہلے انہیں ہوش آیا تھا، ڈاکٹر صاحب دیکھ کر گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ انہیں کوئی ذہنی تکلیف نہیں ملنی چاہیے، ناہید آپا اور زینو کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں کیونکہ ڈاکٹر نے کھلے لفظوں کہاں تھا کہ بس اب ان کے لئے دعا کیجئے دوا کا وقت نہیں رہا۔

ماں تو ماں ہوتی ہے عباس بھی ان کے پلنگ کے قریب بیٹھا ان کا بازو پکڑے رو رہا تھا، نقاہت کے باوجود انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا، بڑے ماموں ممانی اور دونوں بھابیاں بھی وہاں موجود تھیں، دادی اماں خود ہی بیمار تھیں اس لئے زینو نے ان کا پلنگ باہر ہی بچھوا دیا تھا، ابا میاں بھی عباس کے انتظار میں بیٹھے تھے، بی بی کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔

"اری دلہن۔" دادی اماں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"میرا وقت تم کیوں لے رہی ہو، کتنے چاؤ

سے بیاہ کر لائی تھی میں تمہیں، اتنی جلدی سدھارنے لگیں۔" دادی کی بات سن کر سب ہی رونے لگے، عباس نے مڑ کر زینو کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھایا، وہ بھی ان کی نظروں کا مطلب سمجھتی جلدی سے باہر نکل کر دادی اماں کو مزید کچھ بھی کہنے کے لئے روکا اماں کی حالت پہلے ہی ایسی ہے اوپر سے ان کی باتیں۔

اماں نے ہاتھ کے اشارے سے عباس کو اپنے منہ کے قریب بلایا تھا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔

"اسے میری وصیت ہی سمجھ لو۔" اماں کی بات سن کر اور وقت کی نزاکت سمجھتے ہوئے اس نے سر کو ہاں میں ہلا دیا تھا لیکن پھر ہاں کرنے کے بعد وہ ان کے سینے سے لگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، بے رحم وقت کا ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر لگا تھا، وقت کس موڑ پر اسے لے آیا تھا جہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس کے ساتھ انصاف کر رہا ہے اور کس کے ساتھ بے انصافی۔

☆☆☆

نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تیرتے پانی کی حقیقت صرف زینو پر آشکار تھی۔

دستخط کیا ہوئے اس کی تو جیسے کایا ہی پلٹ گئی، گھر کے حالات ملکی حالات، وہ جیسے ہر طرف سے کسی زبردست گھیراؤ میں آ گیا۔

پاکستان اور ہندوستان کے بیچ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، دونوں سرحدوں کے درمیان اتنی اونچی فصلیں کھڑی ہو گئیں جن کو کوئی پار نہیں کر سکتا تھا۔

"سلطنت کا کیا حال ہو گا۔" اسے اندر ہی اندر یہ بات کھائے جا رہی تھی وہ خود کو اس کا مجرم سمجھ رہا تھا۔

"اس کے ابا حضور نواب صاحب علی نے جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا نکاح کا سن کر انہوں نے کہیں۔" دل پر جیسے یہ سوچ برچھی سے کوئی گھونپ دیتا اوپر تلے مصیبتوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا تھا۔

اماں کی موت نے اسے ہلا دیا تھا وہ کس کس بات کا غم کرتا، کوئی ایک دکھ تھوڑی تھا اسے تکلیف دینے کو، اماں تو مرنے سے پہلے بھائی کے سامنے سرخرو ہو گئیں تھیں مگر وہ خود کا سامنا کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔

"کیا جواب دوں گا میں خود کو اور اس کو۔" غم کی تصویر بنا وہ اک نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا۔

☆☆☆

دونوں ملکوں کے جھنڈے اپنی اپنی سرحدوں پر لہرا دیئے گئے تھے، اس تقسیم نے مظالم کا ایسا بازار گرم کیا تھا جس کو سوچ کر بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔

عباس کی زندگی میں بھی طوفان آیا تھا جو اس کا سب کچھ بہا لے گا اس کی سلطنت اس سے چھن گئی تھی، رہ رہ کر اسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا، اپنے کمرے میں وہ مسہری پر لیٹا تھا، عباس کے ساتھ ہی زینو کا بھی سالار سے نکاح ہو گیا تھا اور وہ اسے لے کر کراچی چلا گیا تھا۔

سلطنت کے ساتھ بیتے لمحوں کا فسوں نشہ بن کر اس کی نس نس کو مہکائے ہوئے تھا، وہ مختصر لمحے جو اس کی زندگی میں بہار بن کر آئے تھے، اس کی ویران ہوئی زندگی کو مہکا رہے تھے، اپنی بیتے لمحوں کو بانہوں کے ہالے میں لئے وہ اپنے روز و شب گزارنے لگا تھا۔

اب بھی وہ اپنے کمرے میں لیٹا تھا جب اکبری سرخ جوڑے میں ملبوس اس کے لئے ٹھنڈے پانی کا گلاس لائی تھی، اپنے خیالوں میں گم اسے اکبری کے آنے کی خبر نہ ہوئی وہ ویسے ہی لیٹا رہا، اکبری نے پانی سے بھرا گلاس مسہری کے قریب پڑے چھوٹے سے گول میز کے اوپر رکھ دیا اور خود وہ اس کے قریب آ بیٹھی، عباس اس کی آہٹ سن کر چونک گیا۔

کچھ لمحے یونہی دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر نہ جانے کیا سوچ کر عباس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر جانے لگا، پچھلے پندرہ بیس دن سے یہ اس کی عادت بن گئی تھی وہ جب بھی اس کے پاس آتی وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اٹھ جاتا مگر آج وہ بھی ٹھان کر آئی تھی، اس نے جلدی سے عباس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کی اس حرکت پر عباس نے تیوری چڑھائے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا، شرمندگی کے باعث اکبری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"مجھے میرا گناہ تو بتائیں، مجھ سے کیا بھول ہو گئی۔"

"میرے ساتھ شادی کرنا تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے، یہ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔" اکبری کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا، وہ مرد جس سے وہ اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کا دل ہی جانتا تھا اس کا یوں بار بار ٹھکرانا اسے دیوانہ بنائے جا رہا تھا۔

"میں آپ کی بیوی ہوں، آپ پر سارے حق رکھتی ہوں، پندرہ بیس دن ہونے کو آئے آپ نے ابھی تک مجھے چھوا نہیں۔" وہ روتی ہوئی اس کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اس کے ہاتھ میں تھا، سارا کچھ میرا ہونے کے باوجود میرا کچھ بھی نہیں ہے۔

"میں نے تمہیں بہت سمجھایا تھا لیکن تم نہیں مانی اب اسے سزا سمجھو یا کچھ اور۔" بات کہہ کر وہ پھر باہر جانے لگا تو وہ برق رفتاری سے اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"کون ہے وہ جس نے میرا حق چھینا ہے مجھ سے۔" وہ بولا کچھ نہیں بس خاموشی سے کھڑا رہا۔

"میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔"

"میں اس کا یہاں ذکر ضروری نہیں سمجھتا اور میرا راستہ روک کر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم کو۔" اس نے ایک جھٹکے سے اسے ایک طرف کر دیا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

وقت ایک ایسا ساتھی ہے جو ساتھ ساتھ تو چلتا ہے مگر نظر نہیں آتا، احساس تک نہیں ہونے دیتا ہے کہ میں ساتھ ہوں۔

ہندوستان کی تقسیم کو پانچ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا وہ لوگ جو اس عظیم تقسیم کے گرداب میں پھنسے تھے وہ ابھی نکل نہیں پائے تھے، اس تقسیم نے وہ عظیم بربادی جنم دی جو تاریخ عالم میں اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھی نہ سنی، ظلم کے وہ باب رقم ہوئے جنہیں نسلیں یاد رکھیں گی، یہ وہ تقسیم تھی جس نے ہندوستان کے امراؤ کو سڑکوں پہ لا پھینکا اور غریبوں کو محلوں میں لا بٹھایا۔

غم کے ایسے ایسے پہاڑ لوگوں کی زندگیوں پر ٹوٹے جن کا کوئی ازالہ نہیں کر سکتا تھا اور کچھ ایسا ہی غم سلطنت کی جھولی میں بھی آن گرا تھا جس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"عباس کی جدائی اور ابا کی رسوائی۔" ناسور بن کر اسے اندر ہی اندر ختم کئے جا رہے تھے۔

غم سے گھڑی اس زندگی میں اسے ایک خوشی بھی بن مانگے مل گئی تھی وہ عباس کے بچے کی

ماں بننے والی تھی، بس یہی بات تھی جو زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھی ورنہ وہ جن حالات سے گزر رہی تھی زندہ رہنے کا کوئی تک نہیں بنتا تھا، اب بھی وہ اس گھر کے چھوٹے سے سیلن زدہ آنگن میں کھٹیا بچھائے بیٹھی تھی، نواب رجب علی خان کی بیٹی، اس نے ٹھنڈی سے آہ بھری، سامنے قبرستان سائیں سائیں کر رہا تھا دل تو پہلے ہی اداس تھا اور اوپر سے ایسا ماحول، زندہ رہتے ہوئے مردوں کے ساتھ جینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

دسمبر کی شام دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی، بوا کسی کام سے باہر گئیں تھیں انہوں نے اسے صرف آرام کی ہدایت کی تھی اور پچھلے پانچ مہینوں سے وہ آرام ہی کر رہی تھی۔

ڈھلتی سرد شام کی ویرانی اک ویران دل ہی جان سکتا ہے، وہ دل جس نے ایسا زخم کھایا تھا جس کی کوئی دوا نہیں تھی۔

دروازے پر ہلکی سے دستک سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، ذہن جو ماضی کے دھندلکوں میں الجھا ہوا تھا لوٹ آیا، وہ اٹھی اور دروازے کی طرف گئی، ''رفیق ہریانوی'' اس کا دل نام سن کر زور زور سے دھڑکنے لگا ان گزرے پانچ مہینوں میں یہ آدمی کوئی بیس دفعہ آیا تھا اور آتا بھی اس وقت جب بوا اور خالہ گھر نہ ہوتیں وہ اس کھٹیا کا مالک تھا کرائے کے بہانے یونہی چکر لگاتا رہتا سلطنت کو اس کی گندگی نظریں بہت بری لگتی تھیں، اس نے اب پھر بہانہ کر کے اسے ٹال دیا تھا۔

☆☆☆

''اب سو بھی جاؤ بٹیا اور کتنی دیر تک جاگو گی۔'' بوا یہ بات کوئی تین دفعہ کہہ چکی تھیں مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

''نیند نہیں آ رہی بوا۔'' وہ بوا کے ساتھ فرش پر بستر بچھائے لیٹی تھی حمیدہ خالہ اس گھر کی اکلوتی کھٹیا پر لیٹی خراٹے لے رہی تھی، پچھلے پانچ مہینوں سے وہ ان کے ساتھ رہ رہی تھیں جیسے بھی گزر رہی تھی انہیں منظور تھا، سر چھپانے کی جگہ تو تھی، کبھی کبھی بوا جب بے حال ہوتی سلطنت کو دیکھتی تو اس کا دل کٹ سا جاتا، میری بچی کن حالوں کو پہنچ گئی ہے، کہاں وہ نوابی زندگی اور کہاں یہ نوکروں سے بھی بدتر زندگی۔

''آنکھیں بند کرو گی تو آ جائے گی نیند، اس حالت میں آرام بہت ضروری ہوتا ہے۔'' سلطنت نے ہولے سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیا تو اک انجانی سی کشش نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا، کیسا ان دیکھا رشتہ تھا یہ، اس کے دل میں جیسے ڈھیروں پیار بھر گیا۔

''میرے عباس کا بچہ۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں تو عباس کا وجیہہ سراپا اس کی آنکھوں کے آگے لہرا گیا، میرا اور عباس کا بچہ، وہ محبت سے اسے سوچتے ہوئے کروٹ بدل گئی، یہ فرش پر بچھا بستر اسے پھولوں سے بچی مسہری سے کم نہیں لگ رہا تھا اس کا عباس اس کے ساتھ تھا اس کے بچے کی صورت میں۔

☆☆☆

''نکاح کے بعد زینو پہلی بار لاہور آئی تھی، کچھ ملک تقسیم کے عمل سے گزر رہا تھا، مہاجرین کا آنا جانا شروع تھا اور کچھ ان کے ساتھ ہونے والے مظالم نے جیسے لوگوں کو ہراساں کر رکھا تھا، سالار کے گھر والے اسے لاہور جانے سے روک رہے تھے مگر پھر سالار نے گھر والوں کو منا کر اسے لاہور بھیج دیا تھا دراصل زینو امید سے تھی ان کا خیال تھا کہ پہلا پہلا بچہ ہے کہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔'' دادی جان اکبری کے سامنے دس بیس بار یہ بات دہرا چکی تھی کہ زینو امید سے ہے اکبری کو بھی کہیں دکھلاؤ۔

''حسین کی بہو۔'' دادی نے رسوئی گھر کے باہر بیٹھی منجھلی بھابھی کو آواز دی۔

''جی اماں۔'' وہ وہیں سے با آواز بلند بولیں جانتی تھی کہ دادی اونچا سنتی ہیں۔

''یہ کام تو تمہاری ساس کے تھے لیکن خدا کے کاموں میں کون بول سکتا ہے، میں کہتی ہوں اکبری کو کسی کو دکھلاؤ، مجھے بہت فکر ہو رہی ہے۔''

''کتنی دفعہ تو کہہ چکی ہوں دادی جان، اب کوئی نہ مانے تو اس کی مرضی، اب ہم ہاتھ پکڑ کر لے جانے سے تو رہے۔''

''بڑی تو چلی گئی اب تم ہی ہو اس گھر کی بڑی بہو، تمہی کو کہتے ہیں۔''

بڑی بھابھی حسن بھیا کو لے کر ہمیشہ کے لئے اعظم گڑھ (یو، پی) چلی گئی تھیں، بڑے بھیا نے تو بہت جان چھڑائی مگر پھر عباس کے سمجھانے پر کہ اماں رہی نہیں رہی، آپ اپنی زندگی کیوں عذاب بناتے ہیں، جہاں بھابھی خوش ہیں وہیں رہ کر دیکھ لیں، حسن بھیا کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی روز روز کی لڑائی سے وہ بھی تنگ آ گئے تھے، اماں زندہ ہوتیں تو شاید وہ یہ لڑائی ہمیشہ کی طرح برداشت کرتے رہتے مگر اب کس کے لئے۔

اکبری کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی دونوں میں ہونے والی باتیں سن رہی تھی، دل جیسے کٹ سا گیا۔

''اب ہم کیا کہیں ان کو۔'' وہ اندر آ گئی پچھلے چار پانچ مہینوں سے وہ اسی جہنم سے گزر رہی تھی، یہ ایسی آگ تھی جو اس کا سب کچھ جلاتے جا رہی تھی کون سی بیوی ہے جو خاوند پاس ہوا اور نامراد ہے۔

''جانے کون جنم جلی ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔'' کبھی کبھی وہ سوچتی عباس اتنی محبت کرتے ہیں اسے سے، کیا اتنی حسین ہے وہ جو میں انہیں کبھی نظر نہیں آئی، ایک دفعہ عباس نے اسے کہا تھا۔

''مجھے کسی کی امانت سمجھنا، خیانت کا سوچنا بھی نہ، یہ خیال دل سے نکال دینا کہ کبھی عباس کو جیت جاؤ گی وہ بہت پہلے کا ہار چکا ہے۔''

''میں کیا کر رہی ہوں یہاں نہ شوہر میرا، پھر کیوں پڑی ہوں یہاں، گھر والے الگ شک کر رہے ہیں کہ بچہ نہیں ہو رہا۔''

رات کو بستر پر لیٹے ہوئے بھی وہ کروٹ پر کروٹیں بدل رہی تھی، ان گزرے مہینوں میں عباس میں ذرا برابر میں فرق نہیں آیا تھا بلکہ یوں کہہ لیں کہ ہر گزرتا لمحہ عباس کو اسی کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اکبری چھت میں نظریں گاڑے ہوئے تھی مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا، عباس لائبریری میں تھے زینو کے ساتھ۔

☆☆☆

''ہندوستان جانا چاہ رہا ہوں۔'' عباس بلاوجہ کسی کتاب کے ورکے الٹ رہا تھا، زینو نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔

''اماں کے بعد کچھ ایسے حالات بنے کہ میری مجبوری بن گئی کہ میں نہ جاؤں، لیکن اب اور......اور برداشت نہیں کر سکتا۔''

''لیکن بھیا آپ۔'' زینو نے کچھ سمجھانا چاہا اسے۔

''میں اسے جن حالات میں چھوڑ کر آیا تھا، پتہ نہیں کیا بنا ہو گا اس کا۔'' وہ کتاب ایک طرف رکھ کر پریشان سا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگا۔

''وہ بہت اچھی ہے زینو، مجھ سے بہت

محبت کرتی ہے اور میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں اسے پاکستان لے کر آؤں گا۔"

"سوچ لیں بھیا کیا آپ ایسا کر پائیں گے میرا مطلب ہے کہ اکبری اور وہ۔"

"اکبری کو یہ سب کرنا پڑے گا کیونکہ اگر وہ نہیں تو میں نہیں۔" عباس کے لہجے کے مضبوطی پر زنیو خاموش ہو گئی، اس سے بڑھ کر ان کی محبت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا اور جہاں محبت ہو وہاں اور کچھ بھی نہ ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

☆☆☆

عباس کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی، لحاف لئے بغیر وہ لیٹی تھی، کمرے میں مکمل خاموشی تھی وہ چلتا ہوا مسہری کے قریب آیا اور میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیا، سردی کے باوجود اسے پیاس محسوس ہوئی تھی، جانے کیسا صحرا تھا اندر جو ابھی ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا تپش تھی چار سو، اس کی تنو جانے کیسی ہو گی، وہم سا ہو چلا تھا اسے، اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے، جس تنو کسی مصیبت میں ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور پھر وہ دل جو ایک ساتھ دھڑکے ہوں جن پر چاہت کے بادل ٹوٹ کے برسے ہوں۔

ہر رات وہ جب بھی مسہری پر لیٹتا اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس کی تنو اس کے ساتھ لئے اس کے جواں سینے پر سر رکھے وہ میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہے اور وہ اس مٹھاس کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا ہے، اس کے بدن سے اٹھتی مخصوص خوشبو چار سو پھیلی ہے اس کا خوشبو سے بھرا گداز بدن اس کی بانہوں کے ہالے میں اسے دیوانا بنا رہا ہے، تنو کی چاہت کی بوندیں قطرہ قطرہ اس پر گرتی اس کے ہوش اڑا رہی ہیں، اس کی پیاس بجھا رہی ہیں اسے پاگل کر رہی ہیں۔

وہ مسہری پر چت لیٹ گیا یہ جانے بغیر کہ ساتھ لیٹی یہ لڑکی اتنی دیر سے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح آنکھیں بند کر لیں سلطنت کا خیال اک حسین بادل کی صورت اس کے حواسوں پر دھیرے دھیرے چھانے لگا، وہ مخصوص خوشبو وہی گداز بدن، لیکن یہ کیا، کسی کی آہٹ پر اس کی بند آنکھیں کھل گئیں، اس کے اندر جاگی پیاس ادھوری رہی تھی۔

اکبری اس کے بہت قریب آ چکی تھی، عباس نے کچھ سوچتے ہوئے غصے نے آنکھیں بند کر لیں خیالوں کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا تھا، اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور اپنے ہاتھ کی مدد سے اسے خود سے الگ کرتا ہوا اٹھ بیٹھا تو اکبری مارے جوش پھٹ پڑی جلن کی آگے دوچند ہو گئی۔

"بیوی ہوں میں آپ کی مت اتنا ذلیل کریں آپ مجھے۔" عباس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا، وہ کیا سوچ کر لیٹا تھا، اکبری کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو وہ چہرے سے ہاتھ ہٹاتے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ بات میں کتنی دفعہ سمجھاؤں۔" غصے سے بولا۔

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا، بس مجھے بچہ چاہیے۔" وہ نظریں نیچی کیے آنسو صاف کرتے بولی، عباس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو۔

"بچہ۔"

"جی بچہ، ہم دونوں کا بچہ۔" اکبری کو اس کی حیرانگی بہت بری لگی تھی۔

"میں سب کی باتیں نہیں سن سکتی، بس مجھے ایک بچہ چاہیے۔" وہ ایک ہی بات پر بضد تھی۔

"میں یہ نہیں کر سکتا۔" عباس کے انکار پر وہ یکدم مسہری سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں نہیں کر سکتے آپ ایسا۔" وہ اسکے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"بعض باتوں کا جواب نہیں ہوتا انسان کے پاس اور میرے پاس بھی اس بات کا جواب نہیں ہے۔"

"عباس آپ ایسا کچھ نہیں کر سکتے میرے ساتھ یہ بے انصافی ہے۔" بولتے بولتے اس کا گلا رندھ گیا، عباس پر سوچ انداز میں سر نیچے کیے ہوئے تھا وہ اس کے سامنے رو رہی تھی اور اس کا یوں رونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"میری بات مانی ہوتی تو شاید یہ دن دیکھنا نہ پڑتا تمہیں۔"

"آپ میرے اس فیصلے کو میری غلطی کہہ رہے ہیں، مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ میں نے جو کیا غلط کیا۔" عباس خاموش رہا، وہ روتے روتے نیچے فرش پر بیٹھ گئی، کمرے میں پھیلا ہلکا ہلکا سا اندھیرا ماحول کو بھی غم زدہ سا بنا رہا تھا عباس دکھی ضرور ہو رہا تھا مگر وہ کچھ ایسا نہیں کر سکتا تھا جو وہ چاہ رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے دونوں کے درمیاں خاموشی ہچکولے کھاتی رہی بس اس کے سسکنے کی آواز خاموشیوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

"میں تو سمجھی تھی کہ آپ بدل جائیں گے میری محبت میں اتنی طاقت ہے کہ آپ مجبور ہو جائیں گے۔" تھوڑے توقف کے بعد اس کی آواز آئی۔

"میری محبت میں کسی تیسرے کی گنجائش نہیں ہے اسے میری مجبوری سمجھ لو یا کچھ اور...... اور ایک بات بدل جانا مطلب میری موت، میرے بارے میں ایسا سوچ کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔" عباس کی باتیں سن کر اکبری کے تو ہوش اڑ گئے تھے، اتنی محبت، کیا اتنی اہم ہے وہ ان کے لئے، وہ سکتے کی حالت میں عباس کو دیکھ رہی تھی جو اس کے ذکر پر کھل اٹھے تھے، اسے اس وقت اپنا آپ اتنا غیر اہم لگ رہا تھا وہ یہاں نہ ہو کر بھی ادھر تھی اور وہ ادھر ہو کر بھی کہیں نہیں تھی۔

"اور رہی بات بچوں کی تو جو بچے دو دلوں کی چاہت سے جنم لے کر اس دنیا میں آتے ہیں ان کے ماتھوں سے چمکتی الوہی روشنی چہار عالم کو روشن کر دیتی ہے میں ایسے بچوں کو دنیا میں لانے کا سبب نہیں بن سکتا جن کے باپ کے دل میں ان کی ماں کے لئے کبھی چاہت ایک بوند بھی گری ہو۔" اکبری کو لگا جیسے کسی نے اسے اونچی جگہ سے دھکا دے دیا ہو، سکتے کے عالم میں وہ عباس کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

"میں سلطنت کے علاوہ کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔"

"میں دوسری عورت نہیں آپ کی بیوی ہوں۔" اکبری کی آنکھوں میں عجیب سا کرب ہچکولے کھا رہا تھا۔

"دل کا رشتہ کاغذ تک آنے میں دیر نہیں لگاتا اور کاغذ کا رشتہ، پھاڑ دو تو بات ختم۔" اکبری تو روح تک کانپ گئی تھی یہ عباس نے کیا کہہ دیا تھا، کیا ان کا رشتہ صرف کاغذ تک ہی ہے یہ کبھی دل تک نہیں آئے گا۔

"میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" بات کرتے ہوئے عباس کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھیں بھی ہلکے ہلکے سے نم ہو گئیں۔

"میں نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ اس سے محبت کی ہے، اب کسی اور عورت کی گنجائش نہیں بنتی دل میں۔" وہ بھیگے ہوئے لہجے کے ساتھ بڑا مجبور سا بولا تو اکبری نے احساس

ذلت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

"قسم سے تمہیں دیکھتا ہوں تو اک ہوک سی اٹھتی ہے دل میں، کم بخت اتنی دیر سے کہاں تھی تم۔" رفیق ہریانوی اس کے سامنے کسی جن کی طرح آن دھمکا تھا۔

"اپنی اوقات میں رہا کرو۔" سلطنت کا چہرہ احساس ندامت سے سرخ ہو گیا۔

"تم جیسا حسین چہرہ سامنے ہو تو اوقات کیسے یاد رہتی ہے، خدا کی قسم تمہارے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔" کرائے کے بہانے وہ پھر اس کا راستے روک کھڑا ہو گیا تھا وہ پوری طرح اس کی نظروں کے شکنجے میں تھی۔

"ایک قیامت کیا کم تھی اس شہر میں جو تم بھی آن بسی۔" اس کا اشارہ تاج محل کی طرف تھا، تاج محل کے ذکر پر سلطنت کی آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ لہرا گیا رفیق ہریانوی کے سامنے ہونے کے باوجود اس کا ذہن کہیں پیچھے کو دوڑ لگا گیا ایک دفعہ عباس نے خورشید کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

"اس پتھر کا تم سے کیا مقابلہ، تم تو خدا کا زندہ و جاوید شہکار ہو، کئی تاج محل تمہارے قدموں میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔" سلطنت کی آنکھیں سوچ کر نم ہو گئیں، پتہ نہیں عباس لکھنو آئے یا نہیں، آئے ہوں گے تو مجھے نہ پا کر ان پر کیا بیتی ہوگی، عباس اس نے اندر ہی اندر پوری شدت سے عباس کو پکارا، آپ کے بغیر آپ کی سلطنت تنہا ہے، اس دنیا کی گندگی نظروں کا سامنا کرنے کی سکت نہیں ہے ہم میں۔

"یہ کرایہ ورایہ تو بہانہ ہے میں تو حقیقت میں تمہارا دیدار کرنے آتا ہوں۔"

سلطنت جو کہیں اور گم تھی اس کی بات سن کر درشت نظروں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ اتنی دیر میں بوا بھی چلی آئیں وہ رفیق کی آخری بات سن چکی تھیں۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری بچی پر اپنی گندی نظر ڈالنے کی، مردود نکل جا یہاں سے۔" سلطنت بوا کے آ جانے پر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی، وہ جانتی تھی کہ اب بوا خود ہی نپٹ لیں گی۔

"تمہارے جیسے کو تو ہم اپنی حویلی میں گھسنے نہیں دیتے یہ تو بس برا وقت یہاں لے آیا ہمیں، ورنہ تمہارے جیسے ایسی باتیں کریں ہمیں، نکل جاؤ یہاں سے اور کبھی پلٹ کر نہ آنا، کرایہ تمہارے تمہیں مل جایا کرے گا۔" بوا سلطنت کا ہاتھ پکڑ اس گھر کے اکلوتے کمرے میں لے گئیں۔

☆☆☆

"حمیدن تم بھی سن لو وہ بندہ اس گھر میں نظر نہیں آنا چاہیے۔" بوا نے حمیدن خالہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا، پچھلے پانچ مہینوں سے وہی اس گھر کا سارا سرکل چلا رہی تھیں، حویلی سے نکلتے وقت سلطنت اپنے کچھ زیور اور نقدی لے آئی تھی، برے وقت کے لئے، اس لئے بوا وہی تھوڑا تھوڑا بیچ کر گزارہ کر رہی تھیں۔

"بڑی آپا کیا کروں میں، کم بختی مارا بن بلائے آن دھمکتا ہے۔"

"بس میں نے کہہ دیا اس کی گندی نظریں برداشت نہیں ہیں مجھے۔" بوا نے صاف صاف سنا دیا۔

"آپ برا مت مناؤ میں سمجھا دوں گی اسے۔" بوا کو تو یہ سب کہہ کر حمیدن نے ٹال دیا تھا لیکن وہ اسے اس گھر میں آنے سے روک نہیں سکتی تھیں، ایک تو یہ اس کا گھر تھا اور دوسرا خالہ کو بھی آئے دن اس کی ضرورت رہتی تھی، پیسہ اور کئی کام تھے جو وہ خالہ کے کر دیا کرتا تھا اور حساب بھی نہیں رکھتا تھا، یہ دونوں تو جانے کب چلی جائیں یہاں سے مگر اسے تو ادھر ہی رہنا تھا انہی لوگوں کے ساتھ اس نے بوا کی بات سن ضرور لی تھی مگر اس پر عمل کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

سلطنت کی طبیعت آئے دن بگڑی رہتی، لیکن اس باوجود وہ عباس کو ایک لمحے کے لئے بھولی نہیں تھی اور بھولتی بھی کیسے وہ تو اس کی نس نس میں لہو کے ساتھ گردش کر رہا تھا وہ اسی کا لہو تھا جو اس کے اندر پیپ رہا تھا اسے اپنے ہونے کا یقین دے کر زندہ رہنے پر مجبور کر رہا تھا ورنہ جن حالوں اپنے گھر سے باہر نکلی تھی زندہ رہنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔

"کبھی کبھی وہ سوچتی ابا حضور نے وہ بات جانے کیسے برداشت کی ہوگی، مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی یا۔" دل سوچ کر ہی کانپ جاتا، کیسے لوگوں کا سامنا کرتے ہوں گے، دادی حضور تو پہلے ہی بیمار تھیں کیا سہہ پائی ہوں گی وہ یہ درد، کیسے کیسے پہاڑ نہ ٹوٹے ہوں گے ان پر۔

"ماں قسم کبھی اتنا ڈوب کر میرے بارے میں بھی سوچوں تو اپنی جان دے دوں میں۔" رفیق کی آواز اسے اپنے بہت قریب سے سنائی دی تھی، سلطنت کی سوچ جو ماضی کا سفر کر رہی تھی یکدم حال کے الجھے ہوئے تاروں میں آن اٹکی۔

"آپ کیوں ہماری زندگی کو اور عذاب میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، پہلے ہی کیا ہم کم پریشان ہیں۔" سلطنت کا پریشان لہجہ اس سے پوشیدہ نہیں تھا۔

"تمہاری جیسی بیوی کو چھوڑ کر کوئی جنت میں نہ جائے اور وہ پاکستان بھاگ گیا کیسا مرد تھا تمہارا۔" رفیق کی بات سن کر اس کی رگیں تن گئیں کوئی اس کے عباس کو برا کہے وہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

"بوا نے منع کیا تھا آپ کو یہاں آنے سے، اس لئے آپ خاموشی سے اپنا راستہ پکڑیں، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" سلطنت کی بات پر وہ ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا، اتنی دیر میں حمیدن خالہ بھی باہر سے آ گئیں، رفیق کو سلطنت کے ساتھ بات کرتے وہ ان دونوں کے قریب چلی آئیں۔

"خالہ ان سے کہہ دیں یہ یہاں سے چلے جائیں۔" اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔

"کیوں اس جھنجھٹ میں پڑتے ہو میاں، شادی شدہ ہے۔" خالہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے یہ لڑکی چاہیے، ہر حال میں۔" اس نے خالہ کو ایسے دیکھا جیسے وہ سب کچھ کرسکتی ہو۔

"رئیس نواب زادی ہے، لکھنو کے کسی رئیس نواب کی بیٹی، تمہارے جیسے کو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔" خالہ کی بات پر وہ ہنسا اور ہنستا ہوا کھٹیا پر لیٹ گیا۔

"تم کس مرض کی دوا ہو، تم کرو گی سب کچھ، پیسے میں نہا دوں گا تجھے خدا قسم اتنا پیسہ تم نے کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہوگا۔" اس کی بات سن کر خالہ کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی مگر پھر نجانے کیا سوچ کر وہ روشنی ہلکی سی ماند پڑ گئی۔

آج کل خالہ کے ذہن پر رفیق کی بات ہی سوار تھی پیسہ بوا کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ کب کی رفیق کی بات مان چکی ہوتی، اس کا کیا رشتہ تھا سلطنت کے ساتھ، جانے کس نواب کی بیٹی تھی وہ اور کن حالوں میں یہاں آئی تھی، انہیں اس بات

سے کیا۔

☆☆☆

کتنے دنوں سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خورشید کو خط لکھے مگر نجانے کیا سوچ کر اس کے ہاتھوں میں قلم کانپنے لگتا، لیکن آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خورشید کو خط لکھے۔

خط میں اس نے ساری تفصیل بتائی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ عباس کے بچے کی ماں بننے والی ہے، اپنے گھر والوں کے بارے میں اس نے پوچھا تھا۔

خط پوسٹ کرنے کے بعد اس کو عجیب وہم سا ہو چلا تھا نجانے خورشید کا جوابی خط کس طرح کا آئے گا، میرے گھر والے کیسے ہوں گے، اس نے خط میں عباس کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔

اور پھر اس کا وہم سچ ثابت ہو گیا، خورشید کے خط نے تو اس پر غموں کا پہاڑ توڑ دیا، نواب رجب علی خان اس بدنامی کو نہ سہتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے اسی دن اس جہان فانی کو چھوڑ گئے، دادی حضور پہلے ہی بیمار تھیں، بیٹے کی جدائی ان سے بھی برداشت نہ ہوئی وہ بھی ان کے پیچھے راہی ملک عدم ہو گئیں اور رہے چھوٹے نواب وہ کبھی دلی اور کبھی لکھنو، عباس بھی ابھی تک لکھنو نہیں آئے۔

آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے، اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں قبر میں ڈال دیا اس نے، کیسی بیٹی تھی وہ جس کی بدنامی کا بار اس کا باپ نہ اٹھا پایا۔

"ہم آپ کی قاتل ہوں ابا حضور۔" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی بوا اور حمیدن خالہ بڑی مشکل سے اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔

"ہائے میرے نواب کو کیا ہو گیا، بڑی بیگم، کتنی محبت کرتے تھے سب مجھ سے اور میں نے بدلے میں کیا دیا۔" بوا کو بھی رہ رہ کر سب یاد آ رہا تھا، سلطنت کو تو غش پر غش پڑ رہے تھے۔

"ہائے ہم اپنے آپ میں اتنے الجھے تھے کہ ہمیں اپنے ابا حضور کی موت کا بھی اشارہ نہ ہوا۔"

"ہائے کوئی مار ڈالو ہمیں۔" وہ زور زور سے خود کو پیٹنے لگی بوا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ روک لئے۔

"نہ کر میری بچی اب جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا؟" بوا کے بھی آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، انہوں نے بھی اس حویلی کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی وہ حویلی جواب اجاڑ کھنڈ بن گئی ہو گی، وہ سوچ کر ہی دہل گئیں۔

"اب تو ساری زندگی اسی غم کے ساتھ چلنا ہے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔"

"یہ ہونی ہمارے ہاتھوں ہوئی ہے ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتے۔" روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"جانے اس وقت کتنی تکلیف ہوئی ہو گی میرے ابا کو جو وہ سہہ نہ پائے، میرے مولا ہمیں معاف کر دینا۔"

اپنی محبت کو پانے کے چکروں میں وہ نہ محبت کو پا سکی اور نہ اپنے ابا کو بدنامی کی موت سے بچا سکی، کتنی بدقسمت تھی وہ، آج وہ سہی معنوں میں اپنے گھر سے قدم باہر نکالنے پر پچھتا رہی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھوں اس سائباں کو اتار پھینکا تھا۔

اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا، آنسوؤں نے تو جیسے ناتا جوڑ لیا تھا اس سے کسی پل نہ آنکھیں سوکھتی، عباس بھی نہ آئے اور ابا بھی چل دیئے۔

بوا اب ہر وقت اس کی دل جوئی میں لگی تھیں، دکھ تو انہیں بھی کم نہ تھا اس گھر کا نمک کھایا تھا انہوں نے، لیکن سلطنت کی حالت کی وجہ سے انہیں اسے خوش کرنے کے لئے بلاوجہ ہنسنا بھی پڑتا۔

"میری بچی اب اپنا نہیں تو اس بچے کا سوچ جو تیرے اندر پل رہا ہے اب یہی تیری زندگی کا سہارا ہے۔" سلطنت نے بوا کی بات پر روتی آنکھوں سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"عباس میں جانتی ہوں آپ بے وفا نہیں ہیں لیکن پھر بھی آپ پلٹ کر لکھنو کیوں نہیں آئے آپ نے میرے بارے میں کیوں نہ سوچا۔" وہ دل ہی دل میں عباس سے گلہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت کا پنچھی ہولے ہولے پرواز پکڑ رہا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ سلطنت بھی سنبھل رہی تھی لیکن رفیق کی گندی نظروں سے وہ خود کو بچا نہیں پا رہی تھی، بوا سے کوئی دو تین دفعہ اس کی منہ ماری ہو چکی تھی، سلطنت جیسے خوف زدہ رہنے لگی تھی جانے کیا کرے وہ۔

حمیدن خالہ کی جیبوں کو اس نے پیسوں سے بھر دیا تھا اور پچھلے دو مہینے سے وہ مکان کا کرایہ بھی نہیں دے رہا تھا اور ایک دفعہ بات کرتے ہوتے سلطنت نے سن لیا تھا کہ وہ یہ گھر خالہ حمیدن کے نام کر رہا ہے، وہ کیا چاہتا ہے جو یہ سب کر رہا ہے؟ سوچ سوچ کر اس کا سر چکرانے لگتا۔

☆☆☆

عباس نے گھر بھر میں یہ بتا کر کہ وہ ہندوستان جا رہا ہے اکبری پر بجلی گرا دی تھی۔

"ہندوستان جا رہے ہیں۔" اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔

"ہندوستان سے مطلب، تنو کے پاس۔"

اسے یاد آیا پچھلے دنوں عباس رات کو سوتے میں تنو تنو کہہ کر اٹھ گئے، شاید انہوں نے کوئی برا خواب دیکھا تھا، اکبری نے پہلی دفعہ عباس کو اتنا پریشان حال دیکھا تھا جانے خواب میں کیا دیکھ لیا تھا انہوں نے کہ باقی ماندہ رات ان سے کٹ نہیں رہی تھی۔

"محبت کرنے والے جتنے مرضی دور، ہوں دل سے دور نہیں ہوتے۔" اکبری کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا عباس نے وہ رات کمرے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹنے میں گزار دی تھی۔

"اب وہ ہندوستان جا رہے ہیں، میں تو کہیں کی نہیں رہ جاؤں گی۔" وہ سب کو بتانے کے بعد کمرے میں آیا تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" عباس نے اس کی بات پر پلٹ کر غصے سے اسے دیکھا، وہ دروازہ کے ساتھ یوں لگ کے کھڑی تھی جیسے واقعی اسے باہر نہیں جانے دے گی۔

"میں اس مسئلے پر کچھ بھی بولنا نہیں چاہتا۔" وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"مجھے بات کرنی ہے آپ سے۔" وہ بولتی ہوئی اس کے قریب آ گئی اور غور سے عباس کے چہرے کو دیکھنے لگی، ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے ایسا جواں مرد اور میں پا کر بھی اس کی محبتوں سے محروم ہوں۔

عباس نے اس کے اتنے غور کرنے پر اک لمحے کے لئے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا دیں۔

"آپ تو دیکھتے بھی مجھے یوں ہیں جیسے کسی نامحرم پر نظر پڑ گئی ہو۔"

"جو چیز میرے اختیار میں نہیں اس کا ذکر

کیوں بار بار کرتی ہو، تم سمجھو کے تم ایک پتھر کے آگے اپنا سر پھوڑ رہی ہو، لہولہان ہو جاؤ گی، پتھر سے مدد کی امید مت رکھو، وہ تو خود کسی دوسرے کے آسرے پر ہوتا ہے۔"

"میں بس ایک چلتا پھرتا بت ہوں میرے اندر لہو بن کر دوڑنے والا مجھ سے بہت دور ہے۔" عباس کی بات پر اکبری نے تھوک ایسے نگلا اندر جیسے زہر نگل رہی ہو اسے ایسے لگا جیسے کوئی چیز اسے اندر ہی اندر کاٹ رہی ہو۔

"مجھے یہاں روک کر کیا کرو گی تم، میں کہیں بھی رہو میں اس سے جدا نہیں ہوں، اس لئے نہ خود کو اذیت دو اور نہ مجھے۔" عباس کے اس جملے نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا تھا وہ چاہ کر بھی آگے بول نہ پائی۔

☆☆☆

سردی گئی اب پھر گرمی آنے کو تھی، وقت اپنی رفتار سے سفر طے کر رہا تھا اب اس کا وقت بھی کٹنے کو تا، وہ ننھا سا پھول اس کی سونی گود میں کھیلے گا، وہ ایک دفعہ پھر عباس کو اپنے سامنے دیکھ پائے گی، خوشی کے ساتھ ساتھ کئی دکھ بھی وقت نے جھولی میں ڈال دیئے تھے۔

وہ ہولے ہولے سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آنگن میں ٹہل رہی تھی، سورج میاں واپسی کا قصد کر رہے تھے، چیت کی ہوائیں گنگناتی ہوئی قریب سے گزر رہی تھیں، کچھ خوشی کچھ غم کی کیفیت لئے وہ خاموش سی تھی، پھر کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرتے ہوئے، وہ دھیرے سے کھٹیا پر بیٹھنے لگی تبھی رفیق دروازہ زور سے کھولتا ہوا اندر چلا آیا اور اک نظر اس پر ڈالتا مسکراتا ہوا اندر حمیدن خالہ کے پاس چلا گیا۔

"کیا ہوا ہے آج اسے، بڑی جلدی میں نظر آ رہا ہے۔" اسے جیسے حیرت نے آن گھیرا، اسے اس پر کچھ شک سا ہو گیا تھا کچھ تو کر رہا تھا وہ، اسے تجسس کو ساتھ لئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کے پاس جا کر ان کے درمیان ہونے والی باتیں سننے لگی۔

"یہ نوٹوں کی گڈی پکڑو، باقی کام کے بعد۔" رفیق کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"اب چلتا ہوں، جو کرنا ہے یاد ہے ناں، اپنی راہ کے سارے روڑے نکال پھینکوں گا میں۔" سلطنت خوف زدہ سی جلدی سے دروازے سے ہٹ گئی، یہ کیا کہہ رہا تھا، کون سے روڑے اور حمیدن خالہ کو پیسے کیوں دیئے، یہی باتیں سوچتی وہ دوبارہ کھٹیا پر آ بیٹھی، چڑیاں اس گھر کے اکلوتے درخت پر بیٹھی شور کر رہی تھیں، تھوڑی دیر میں اذان ہونے والی ہے۔

"یا اللہ مدد فرما، جانے کیا ہونے والا ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا اور اس پر پڑی فاتحانہ نظر ڈالتا اس کے قریب چلا آیا۔

کافی دیر وہ بغیر کچھ بولے اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر واپس چلا گیا، سلطنت کے تو اس کے طریقے کار پر پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی، عجیب پر اسرار سا طریقہ کار تھا اسکا۔

"بوا کہاں ہیں۔" وہ سوچنے لگی ان کے بغیر کتنی تنہا تھی وہ، وہی تو اس کا سہارا تھیں، جو اس کی طرف اٹھنے والی گندی نظروں کو کچل کر رکھ دیا کرتی تھیں، وہ دل میں زور زور سے دعا کرنے لگی کہ بوا چلی آئیں۔

لیکن رات کے نو بھی بج گئے مگر بوا گھر نہیں آئیں، اتنی دیر کہاں لگا دی انہوں نے آس پڑوس میں ہی گئیں تھیں، تھوڑے ہی عرصے میں کافی جان پہچان ہو گئی تھی یہاں ان کی۔

رات بھی گزر گئی مگر بوا نہیں لوٹیں، سلطنت ساری رات نہیں سوئی تھی، طرح طرح کے وہم ستا رہے تھے، بوا کدھر جا سکتی ہیں، یہاں کوئی ہے ان کا عزیز، مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا جیسے کچھ غلط ہونے والا ہے۔

"میرے اللہ میری مدد فرما اور بوا کو بھیج دے۔" حمیدن خالہ بھی پریشان تھیں ساری رات وہ بھی اس کے ساتھ جاگتی رہیں۔

"خود ہی آ جائے گی وہ بوڑھیا، میں کہاں ڈھونڈوں۔" حمیدن خالہ کو تو اس نے ٹال دیا تھا مگر پھر سلطنت کے اصرار پر وہ جانے کے لئے مان گیا۔

"تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے ایک بار کہو ہزار بار جائیں۔" سلطنت کی مجبوری تھی جو اس کے منہ لگنا پڑ رہا تھا۔

آدھے سے زیادہ دن گزر چکا تھا مگر بوا کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا، کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا انہیں، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، نہیں نہیں اس نے ذہن میں آئے برے خیال کو جھٹکا۔

مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ برا خیال حقیقت کا روپ لیے آنگن میں چارپائی پر موت کی آغوش میں سو رہا تھا، سلطنت کے تو ہوش گم ہوا اس حالت میں، یہ سب کیسے ہو گیا، رفیق کے ساتھ پولیس کے لوگ بھی گھر میں آئے تھے، آس پڑوس کے لوگ بھی آنگن میں اکٹھے ہو گئے۔

سلطنت کمرے کے دروازے میں کھڑی سکتے کی حالت میں تھی اور پھر جب سکتہ ٹوٹا پھر اک سیل رواں تھا جو اس کی آنکھوں سے جاری ہو گیا تھا، قسمت کی ماری یہ بازی بھی ہار گئی تھی، یہی ہستی تھی جس کے بل بوتے پر وہ اس ظالم دنیا کے سامنے کھڑی تھی، اس کی نظر سامنے کھڑے رفیق پر پڑی، بوا ہم آپ کی کون کون سی نیکی یاد کریں، آپ نے ہر برے وقت میں ہمارا ساتھ دیا، ابا نے رہے دادی نہ رہیں، بوا آپ تو ہمارا سہارا تھیں آپ تو ایسا نہ کرتیں، وہ بلک بلک کر رو رہی تھی، اس ظالم دنیا نے ایک اور غم میری جھولی میں ڈال دیا، ہائے ری قسمت، ہم سے زیادہ بد نصیب بھی کوئی ہو گا جس کا کوئی عزیز رشتہ اس کے پاس نہیں، پولیس کے دو اہلکار اس کے پاس آئے تھے اور انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ یہاں سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر ایک گندا نالے میں پاؤں پھسلنے کے باعث گر گئیں، آج صبح ہی ان کی لاش ملی ہے۔

بوا نے تو مجھے آس پڑوس میں جانے کے لئے کہا تھا وہ اتنی دور کیونکر چلی گئی جب کہ انہیں کوئی کام بھی نہیں تھا، روتے روتے اس کا ذہن اس بات پر اٹک گیا، کہیں کسی نے جان بوجھ کر تو نہیں، کیا رفیق، ذہن اس بات پر اٹکا مگر کسی نے اندر سے اسے چپ کروا دیا۔

وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی، اسے رفیق کا کل کا رویہ یاد آ رہا تھا تو کیا حمیدن خالہ بھی اس میں شامل ہیں، پیسے تو وہ انہیں ہی دے رہا تھا، اس نے زور سے اپنا سر دیوار کے ساتھ دے مارا، ہم اور کتنے لوگوں کی موت کا سبب بنیں گے، بوا وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ اس کی ماں کی جگہ پر تھیں، ماں اس نے دیکھی نہیں تھی مگر وہ پیار اسے بوا نے دیا تھا آج اسے لگ رہا تھا ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا ہے، باپ تو رہا نہیں، ماں تو زندہ رہتی۔

آج پہلی دفعہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل تنہا ہے کیا کرے وہ، حمیدن خالہ کے بغیر اس کا اب کوئی سہارا نہیں، اس کی جو حالت تھی وہ تو تنہا ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی، رفیق کو

برداشت کرنا بھی اس کی مجبوری تھی، لیکن جب وہ سامنے آتا اس کا دل چاہتا وہ چھری گھونپ دے اس کے اندر، پہلے اسے شک تھا مگر اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بوا کے قاتل کوئی اور نہیں یہی ہے، روپیہ دے کر اس نے پہلے حمیدن خالہ کا منہ بند کیا اور پھر پولیس کو بھی چپ کروا دیا، وہ تنہا کمزور لڑکی اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

لکھنو کی سرزمین ایک بار پھر اس کے قدموں کے نیچے تھی، پورے نو مہینے بعد وہ اس شہر میں دوبارہ آیا تھا جہاں کبھی اس کی محبت پھولوں کی مانند مہکی تھی، یہ وہی شہر تھا جہاں سلطنت تھی اس کے دل کی ملکہ۔

اس کے قدم چھوٹے ماموں کے گھر کو نہیں، سلطنت کے بنگلے کی طرف اٹھ رہے تھے، اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا، میں خود نواب صاحب کو سب کچھ بتا دوں گا اور یہ کہہ دوں گا کہ سلطنت میری بیوی ہے، جو بھی کہنا ہے آپ مجھ سے کہیں، وہ لاہور شہر سے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا بلکہ اس نے آتے وقت اکبری کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔

''زندگی میں میرا ایک ہی اصول رہا ہے، اپنی محبت میں کسی تیسرے کو شریک نہ کرو اور جو کام بھی کرو اسے آخر تک نبھاؤ۔'' سلطنت میری پہلی اور آخری محبت اور میری بیوی ہے، میں سال پہلے کا اس سے شادی کر چکا ہوں۔

اکبری کے سر کے اوپر جیسے کوئی بم آ گرا ہو جیسے بم ہیروشیما نہیں اس کے سر پر پھوٹا ہو، اسے اپنے اردگرد گرد سے اڑتی دکھائی دے رہی تھی جس میں عباس کا دھندلا چہرہ دور ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''تم سے میرا نکاح میری مجبوری تھی میری مرتی ماں کی خواہش، میں نکاح نامے پر دستخط تو کر سکتا تھا مگر اس کے بعد جو میرے اختیار میں نہیں وہ میں تمہیں نہیں دے سکتا تھا، ازدواجی تعلقات اگر محبت کے ساتھ اک دوسرے کے ساتھ جڑیں تو آنے والا وقت بہار بن کر زندگی پر چھا جاتا ہے۔''

ان آٹھ نو ماہ میں ہم دونوں میں جو بھی ہوا میں اس کی تم سے معافی بھی نہیں مانگوں گا کیونکہ میں نے جو بھی کیا تم کو اس کا پہلے ہی علم تھا۔

''میں اسے واپس لانے جا رہا ہوں امید ہے تم مجھے روکو گی نہیں، میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر تمہاری زندگی برباد ہے، لیکن میں اسے مزید برباد نہیں ہونے دوں گا، میں آ کر ماموں سے بات کروں گا، میں اپنے ساتھ تمہیں باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔''

بنگلے پر پھیلی اداسی اور ویرانی اسے چونکا گئی، باہر دروازے پر خلاف معمول کوئی چوکیدار موجود نہیں تھا، وہ اندر آ گیا، وہ بنگلہ جو بھی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے پورے علاقے میں پہلے نمبر پر تھا اس پر ایسی قیامت خیز ویرانی، لان میں لمبی لمبی خودرو گھاس اگ آئی تھی خشک پتوں کے ڈھیر سے تھے جو جا بجا لگے ہوئے تھے۔

کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا، سرخ چھوٹی اینٹوں سے بنی روش جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھی، اس گھر کے مکین کہاں ہے، میری سلطنت کہاں ہے، اس سناٹے نے اس کے اندر خوف سا بھر دیا تھا وہ جلد از جلد اندر جا کر پتہ لگانا چاہ رہا تھا۔

وہ ابھی اندرونی دروازے کے پاس گیا تو اسے وہاں ایک نوعمر لڑکی نظر آئی جو پچھواڑے کی طرف سے آ رہی تھی، ویران ویران آنکھوں کے ساتھ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس گھر میں بہت عرصے بعد کسی

آدمی کو دیکھا ہو، وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا، وہ چند ثانیے چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا، اس سے بات نہیں بن پا رہی تھی، وہ کیسے سلطنت کی بات کرے اس سے پھر وہ ہمت کر کے بولا۔

''میرا نام سید عباس زیدی ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں۔'' عباس کو یوں لگا جیسے ابھی کہیں سے سلطنت دوڑتی ہوئی آ گے گی اور اس سے لپٹ جائے گی، وہ تھوڑی دیر انتظار کرتا رہا مگر نہیں بنگلے پر تو ہر طرف سناٹوں کا راج تھا کسی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔

وہ لڑکی اب بھی اسے دیکھ رہی تھی، کیسے پوچھے وہ، بے دھڑک یوں سلطنت کے بارے میں سلطنت کے بارے میں پوچھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''مجھے نواب رجب علی خان سے ملنا ہے۔'' آخر کو وہ بڑا حوصلہ کر کے بولا۔

اتنا پوچھنا تھا کہ لڑکی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، عباس اس کے یوں رونے پر پریشان ہو گیا۔

''کیا بات ہے آپ رو کیوں رہی ہیں۔''

''نواب صاحب تو گزر گئے۔'' وہ دوپٹہ منہ پر رکھے ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی، عباس کو جیسے دھچکا سا لگا، گزر گئے اور سلطنت۔

''سلطنت کہاں ہے۔'' عباس نے دھڑک اس کے بارے میں پوچھا تھا اس لڑکی کے بہتے آنسو جیسے تھم سے گئے۔

''سلطنت آپا، آپ کیسے جانتے ہیں انہیں۔''

''ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔''

''آپ ان سے ملنے آئے ہیں اور وہ یہاں میں نہیں۔''

''کیا مطلب، کہاں ہے وہ۔'' عباس کو جیسے تشویش نے آن گھیرا، کتنی دور سے وہ آیا تھا۔

''پتہ نہیں۔'' لڑکی کا جواب جیسے تپا گیا اسے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو پتہ نہ ہو۔'' وہ بات کرتا ہوا اندرونی دروازے کے باہر بنی سیڑھی پر بڑا بے آسرا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہم اجنبی لوگوں سے ان کے بارے میں بات نہیں کر سکتے۔'' اس لڑکی کو لگا جیسے وہ اسے زیادہ ہی کرید رہا ہے۔

''اب میں کیا کہوں آپ سے کہ میں اس کے لئے اجنبی نہیں ہوں، مہربانی فرما کر آپ صرف مجھے یہ بتا دیں کہ وہ ہے کہاں۔'' وہ اندر ہی اندر اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ان گزرے نو مہینوں میں کچھ نہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ جس کا اس علم نہیں۔

''آپ کیوں ان کے بارے میں اتنا پوچھ رہے ہیں، آپ ہیں کون۔''

''ہم دونوں اک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں میرا اور اس کا رشتہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔'' پھر اس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

''ہائے ری قسمت، وہ آپ ہے جس کی وجہ سے اس بنگلے کو نظر لگ گئی، ہماری آپا گھر سے بے گھر ہو گئیں۔'' وہ حسنی تھی، عباس کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، پھر حسنی نے سب کچھ اسے بتا دیا۔

''آپ یہاں ہیں تو ہماری آپا کدھر ہیں۔'' حسنی خود کو پیٹنے لگی۔

یہ کیسی شام عباس کی زندگی میں اتری تھی، یہ کیا ہو گیا سلطنت، میں کیوں تمہارے بارے میں اتنا بے فکرا ہو گیا۔

اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے کہاں جائے، کیسے پتہ لگائے کہ وہ کہاں ہے وہ

جس نے میری وجہ سے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔

لکھنو کی ویران سڑکوں پر وہ شکستہ حال یوں پھر رہا تھا جیسے اس کی کوئی بہت ہی اہم شے گم ہو گئی ہے اور مل کے نہیں دے رہی، کتنا خوش تھا وہ کہ وہ سلطنت کو لینے جا رہا ہے اسے کیا پتہ تھا اس کا خزانہ اس سے کہیں کھو گیا ہے۔

☆☆☆

پورے نو مہینے آہوں اور سسکیوں کے بیچ گزارنے کے بعد آخر کار اک ننھی سی خوشی اس کے دامن میں چلی آئی، عباس کا ہم شکل عباس کا بیٹا اس کی زندگی میں بہار لے آیا تھا، خوش ہونے کی بجائے وہ رو رو کر برا حال کر رہی تھی۔

"عباس ہم کہاں ڈھونڈیں آپ کو، یہ خوشی ہم سے اکیلے برداشت نہیں ہو رہی، یہ وقت ہم پر اس طرح آئے گا یہ ہم نے سوچا نہیں تھا، ہم نے تو کیسے کیسے خواب دیکھے تھے، کوئی بھی پورا نہ ہوا، ہم کتنے بدنصیب ہیں۔" وہ ننھے سے بچے کا منہ چومے روتے جا رہی تھی۔

"یہ ہمارے عباس کا بیٹا ہے۔"

"وہ عباس جس نے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ تم کہاں ہو۔" رفیق اس کی بات سن چکا تھا۔

"اگر اسے تم سے محبت تھی تو اسے آنا چاہیے تھا، مجھے تو لگتا ہے وہ بھی بھنورہ ہی تھا اس چوسا اور گیا۔" سلطنت کی روتی آنکھوں میں غصہ عود کر آیا۔

دل ہی دل میں وہ ان سے نہ کرنے کا شکوہ کرتی تھی مگر کوئی اس کے منہ پر اسے برا کہے اسے منظور نہیں تھا اور وہ شکوے کے باوجود جانتی تھی کہ اس کا عباس بے وفا نہیں ہے ضرور ان کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔

"تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔"

"میری بلا سے مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔" وہ کمرے کے اندر چلا آیا تو بچہ اس کے اندر آنے پر یا کچھ اور زور زور سے رونے لگا۔

"لگتا ہے اسے میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔" سلطنت نے اس کی بات سن کر غصے بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"وہ ہمارا بیٹا ہے جانتا ہے کس کو اندر آنا چاہیے اور کس کو نہیں۔"

"اب تو سدا وہ مجھے ہی دیکھے گا یہاں، دوسرا باپ جو بننے والا ہوں میں اس کا۔" رفیق کی بات پر سلطنت کا پورا بدن پسینے میں نہلا گیا۔

"تم نے سوچ بھی کیسے لی یہ بات۔" وہ اپنی طرف سے بڑی بے خوف ہو کر بولی۔

"جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تب، میں تو بس تمہارے فارغ ہونے کا ہی انتظار کر رہا تھا۔" سلطنت کے تو مارے خوف لمبے لمبے سانس آنے لگے۔

کہاں جائیں کیسے بچائیں خود کو، طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے زندگی جیسے کسی بند کمرے میں قید ہو کے رہ گئی تھی اور اوپر سے قیامت یہ تھی کہ اس کمرے کا دروازہ بھی کوئی نہ تھا، اپنے بچے کو سینے سے لگا وہ ادھر ادھر پریشانی سے چکر لگا رہی تھی۔

سلطنت کو کسی پل بھی قرار نہیں آ رہا تھا اس سے پہلے کہ یہ میری عزت کے ساتھ کھیلواڑ کرے، ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

"لیکن کہاں؟" یہ پہلا سوال تھا جو اس کے دل نے اس سے کیا تھا۔

"ہم کہاں جائیں؟ کون ہے ہمارا؟" اس کے دل کو جیسے زور سے کسی نے مٹھی میں بھر لیا

"کیا کریں ہم؟ میرے مولا میری مدد فرما۔" اس بند کمرے سے باہر نکل کر دیکھو شاید

کوئی راستہ مل جائے، اس کے اندر سے کوئی پکارا۔

دس پندرہ دن کے بچے کو لے کر ہم کہاں جائیں، یہاں سے نکلوں گی تو کیا یہ دنیا جینے دے گی ہمیں، ایک رفیق سے بچ کر نکلوں گی تو کئی رفیق راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے۔

حمیدن خالہ کافی دیر سے اس کا پرشوق چہرہ دیکھ رہی تھیں اور پھر کچھ سوچتی وہ اس کے قریب چلی آئیں۔

"گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو ہر کوئی کٹی پتنگ کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہے، اپنا مال سمجھتا ہے۔" خالہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں ندامت کے مارے پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔

"رفیق بڑا اچھا لڑکا ہے اور بہت چاہتا ہے تمہیں۔"

"خالہ آپ تو عورت ہیں سمجھ سکتی ہیں میرے درد کو۔" مارے ندامت کے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"عورت ہوں اسی لئے کہہ رہی ہوں کہ بہت سے مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بننے سے بہتر ہے ایک مرد کا ہو کر رہنا۔"

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی، میں ایک شادی شدہ لڑکی ہوں۔"

"کہاں ہے تمہارا مرد، سال ہونے کو آیا میں نے تو دیکھا نہیں، یہ کیسا مرد ہے جس نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ اس کی عورت کہاں ہے۔" خالہ کی اس بات کا جواب اس کے پاس نہیں تھا اس لئے وہ خاموش ہی رہی۔

"تو لوگ کیا جانو کہ محبت کیا ہوتی ہے، میں کہیں بھی رہوں میں صرف ان کی ہوں، جس دن مجھے کوئی غیر مرد چھوئے گا وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔" خالہ کو تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اندر سے وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"وہ تم پر اتنا پیسہ کیوں خرچ کر رہا ہے یہ گھر بار صرف تمہیں پانے کے لئے، میں اب بھی کہتی ہوں اسی میں عقل مندی ہے، مان جاؤ اس کی بات۔" خالہ تو بات کر کے چلی گئی تھی مگر وہ بہت سی سوچوں کے شکنجے میں آ پھنسی تھی، اس سے پہلے کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھائے ہم یہاں سے چلی جائیں گے۔

عباس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال خورشید جہاں کا آیا تھا، وہ اس کی ہمراز ہے وہ ضرور جانتی ہوگی کہ وہ کہاں ہے دل کے اندر جیسے خوشی کی رمق جاگی۔

☆☆☆

"آپ نے لکھنو کیا چھوڑا سلطنت کی زندگی میں تو قیامت ہی آ گئی، کیا کیا نہیں ہوا اس کے ساتھ۔" خورشید کے سامنے بیٹھا وہ وقت کے گھیراؤ میں آ گیا تھا جو جانے کتنے موڑ مڑتا اسے پھر واپس اسی جگہ لے آیا تھا، جہاں اس کی زندگی نے صحیح معنوں میں جینا سیکھا تھا یہ وہی گھر تھا جہاں سلطنت کی چاہتوں کے بادل اس پر ٹوٹ کے برسے تھے، اسے چھو کر زندگی بہار بن گئی تھی اس وقت، وقت نے کیسا موڑ مڑا تھا اور آج کیسا موڑ کاٹ رہا تھا، اس نے تاسف سے سوچتے ہوئے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔

وقت کے گرداب میں زندگی پھنس کے رہ گئی تھی، وہ کیا کرے، کہاں ائے اسے ڈھونڈنے، کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

"دراصل وقت کی سفاکی میرے علم میں نہیں تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنے بڑے بڑے دھوکے بھی دے سکتا ہے، ورنہ میں اپنی سلطنت کو ایک لمحے کے لئے بھی خود سے دور نہ

کرتا۔" عباس کی دردناک آواز سارے کمرے کے ماحول کو نم ناک کر گئی۔

گرمی کا زور اپنے جوبن پر تھا، عباس نے اپنی شرٹ کی بازو اوپر کو فولڈ کر رکھی تھیں لیکن اسے گرمی سے زیادہ سلطنت کی ٹینشن تھی جو جانے کس حال میں ہو گی، وہ خورشید سے اسی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔

اور پھر اس کے پوچھنے پر خورشید نے اس کا آگرہ سے آیا ہوا خط پکڑا دیا۔

خط پڑھتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ پل پل بدل رہا تھا اور پھر یہ جملہ پڑھتے ہوئے "کہ عباس لکھنو آئے کہ نہیں" اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر دوسرے ہی لمحے عباس کی آنکھیں ستاروں کی مانند لو دینے لگی تھیں ایسا کیا پڑھ لیا تھا اس نے کہ پل میں اس کا رنگ بدل کر حقیقی رنگ میں بدل گیا۔

"بچہ۔" فرط جذبات میں عباس کے لبوں سے بے اختیار یہ لفظ ادا ہو گیا۔

"میرا بچہ۔" خورشید کی طرف اٹھی اس کی نگاہوں میں ہلکے ہلکے خوشی کے ستارے جھلملا رہے تھے، عجیب سی مسرت تھی جس نے پل بھر کے لئے اس کے ذہن پر چھائے سارے غموں کو زائل کر دیا۔

"میرا اور سلطنت کا بچہ۔" خوشی و انبساط کی کیفیت میں اس نے وہ خط اپنے لبوں سے لگا لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا، خورشید کی آنکھوں میں بھی ستارے سے جھلملا رہے تھے وہ دونوں اس کے لئے کتنے اہم تھے یہ وہی جانتی تھی اس کی عزیز از جان سہیلی۔

وہ خط آگرہ سے آیا تھا اس نے مزید کوئی بھی بات خورشید سے نہیں ہوئی تھی اسی وقت وہ واپس ہو گیا، وہ جلد از جلد آگرہ پہنچا چاہتا تھا جہاں اس کی بیوی اور بچہ جانے کس حال میں ہوں گے اب تو وہ دنیا میں آچکا ہو گا، خط کی تاریخ پڑھتے ہوئے اس نے اندازہ لگایا، میرا معصوم بچہ، اس کی آنکھوں میں پانی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ایسا کندھا تلاش کر رہا تھا جہاں وہ سر رکھ کر جی بھر کر رو سکے۔

☆☆☆

"پھر تم نے کیا سوچا ہے بٹیا۔" حمیدن خالہ ننھے محمد کو ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے تھیں کتنی مجبور تھی وہ جسے اپنی بوا کے قاتلوں کے ساتھ رہنا پڑ رہا تھا، آخر وہ اس ظالم دنیا سے بچ کر کہاں جائے۔

"خالہ آپ کو نبی کا واسطہ آپ اس موضوع پر ہم سے بات مت کیا کریں، ہم پہلے ہی کسی گناہ کی سزا بھگت رہی ہوں آپ کوئی اور گناہ نہ کروائیں ہم سے۔" اس نے تو باقاعدہ خالہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"ہمارے شوہر سلامت ہیں وہ ضرور آئیں گے ہمیں لینے کے لئے ہم دونوں اک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں، عباس کے علاوہ ہر مرد ہمارے اوپر حرام ہے۔" بات وہ خالہ سے کر رہی تھی لیکن خالہ کے ساتھ ساتھ اس کی باتیں کوئی اور بھی سن رہا تھا۔

"اب چاہے حرام سمجھو یا حلال میں تو جو میرے دل میں ہے وہ کر کے چھوڑوں گا۔" رفیق نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا اور وہ جو اپنے دھیان میں خالہ سے باتیں کر رہی تھی اس اچانک پڑنے والی افتادہ پر بوکھلا گئی۔

"چھوڑو۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کی گرفت سے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کی، تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"چھوڑو خالہ۔" اس نے مدد کے لئے خالہ کو پکارا۔

"اس کی بات نہیں مانو گی تو یہ کچھ تو ہو گا۔" خالہ کی بات سن کر وہ پریشان و حیران نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ خالہ اسی کی سپورٹر ہے وہ تو بس اسے چھڑانے کے لئے مدد مانگ رہی تھی۔

"یہ تمہارے باپ کی حویلی نہیں جہاں تم جو چاہو گی ہو گا، یہاں جو رفیق چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔" بال چھوڑنے کے بعد وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر انہیں جھنجھوڑتا ہوا وحشت زدہ کرنے والے انداز میں بولا، رفیق کی باتوں کی بجائے اس کے برتاؤ نے اسے رلا دیا تھا آج پہلی دفعہ کسی نے ایسے لہجے اور ایسے برے طریقے کے ساتھ اس سے بات کی تھی، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ زور زور سے رو رہی تھی ننھے محمد کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھیں اپنی ماں کا غم شاید اس سے بھی سہا نہیں جا رہا تھا۔

"عباس۔" اس کے دل نے بڑے غضب ناک انداز میں عباس کو آواز دی تھی، اپنے پیار کو پانے نکلے تھے ہم اور کہاں آ گئے۔

"تمہیں پانے کے لئے جانے کتنے پاپڑ بیلنا پڑے ہیں مجھے۔" اس نے ہنستے ہوئے حمیدن خالہ کو آنکھ کا اشارہ کیا وہ بھی مسکرا دی۔

"اب ذرا بھی چوں چوں کی تو تمہاری بوا کی طرح تمہیں بھی کسی گندے نالے میں پھنکوا دوں گا۔" بوا کے نام پر سلطنت کی روتی آنسوؤں سے بھری آنکھیں رفیق کی طرف اٹھیں۔

"جو سوچ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے، تمہارے اور میرے درمیان وہ بڑھیا روڑے اٹکانے لگی تھی، تھپڑ مارا تھا اس نے میرے منہ پر، سالی کو ایسی جگہ بھیجا ہے جہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

"تم...... تم نے مارا میری بوا کو۔" وہ دھاڑنے والے انداز میں بولی، پتہ تو تھا اسے۔

"کیوں مارا ہماری بوا کو تم نے، قاتل ہم تمہیں پولیس میں دے دیں گے، سب کو بتائیں گے تم نے مارا ہے انہیں۔" سلطنت کی بات سن کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"لو اور سن لو، جیسے پولیس والے جانتے ہی نہیں کہ کس نے مارا ہے، او بی بی پیسے سے سارے کام ہو جاتے ہیں، لکشمی دیوی کے آگے ہر کوئی جھلک جاتا ہے، جاؤ جس کو بھی بتانا ہے بتاؤ۔" مارے خوف کے سلطنت کے پسینے چھوٹ گئے اتنا ظالم انسان ہے یہ، وہ روتے روتے زمین پر بیٹھ گئی، اس کی ماں جیسی بوا کو اس انسان اتنی اذیت ناک موت دی۔

"تمہیں خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"خالہ آپ نے بھی نہیں روکا اسے۔"

"میں تو پہلے بھی اسی کے دیئے پر زندہ تھی اور اب بھی اسی کے سہارے زندگی گزار رہی ہوں، یہ جو کہتا ہے میرے سر آنکھوں پر ہوتا ہے اسے کیا کہتی ہوں مجھ سے پوچھو، یہ جو ہوا ہے وہ ہم دونوں کے باہم مشورے کے ہی ہوا ہے۔" سلطنت کے حقیقت سن کر آنسو نہیں تھم رہے تھے، دنیا کے بدلتے رنگ، رشتوں پر سے اعتبار اٹھ سا گیا تھا، حمیدن خالہ بوا کی خالہ زاد تھیں وہ کتنے اعتماد سے اسے ان کے پاس لائیں تھیں کہ وہ ضرور ہماری مدد کریں گی، لیکن ان کے اعتبار کا یہ صلہ کہ جان سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔

"خالہ آپ کو تو اپنے رشتے کا مان رکھنا چاہیے تھا، خالہ نے آپ کے ساتھ تو کچھ بھی برا نہیں کیا تھا۔" وہ اٹھی اس نے آگے بڑھ کر خالہ کے ہاتھ سے اپنا بیٹا لے لیا اور پھر واپس نیچے فرش پر بیٹھ گئی، رفیق ابھی بھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ آدمی جو برسوں سے میری کفالت کر رہا ہے میں اس کا مان رکھتی یا اس کا جو برسوں بعد مجھے ملی۔" خالہ نے بڑی سفاکی سے جواب دیا۔

"رشتے تو رشتے ہوتے ہیں۔"

"اب یہ بھاشن دینا بند کرو اور میری بات غور سے سنو، ایک دو روز میں، میں تم سے نکاح کرنے والا ہوں، سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔" رفیق کی بات سن کر اسے جیسے کرنٹ لگ گیا۔

"ہم اپنی جان دے دیں گے، ہم تم سے نکاح نہیں کریں گے۔" سلطنت بڑے حتمی لہجے میں اسے دیکھ کر بے خوف انداز میں بولی آخر کو یہ اس کی زندگی کا معاملہ تھا، کیا کرے گا یہ زیادہ سے زیادہ مار ہی دے گا ناں تو ایسی زندگی سے تو موت ہی اچھی ہے۔

"کیا کہا۔" اس نے آگے بڑھ کر غصے سے اسے جبڑوں سے پکڑ لیا۔

"نہیں مانو گی۔" ان دونوں میں ہونے والی باتیں سنتی خالہ باہر نکل گئیں وہ جانتی تھیں کہ جو وہ کہتا ہے کرتا ضرور ہے۔

"نہیں مانیں گے ہم۔" اس نے اپنے ہاتھ سے مکا بنا کر اس کے ہاتھ پر مارا کر اپنا جبڑا چھڑوایا، ننھا محمد جو اس کی گود میں سو رہا تھا اٹھ کر رونے لگا سلطنت نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم ایسے نہیں مانو گی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ سوچتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عباس پورے نو دس مہینوں کے بعد اپنے ماموں کے ہاں آیا تھا، خورشید کے گھر سے وہ سیدھا ادھر آیا تھا، چھوٹی ممانی رو رو کر اسے ملی تھیں۔

"بڑے بھیا کیا گئے اس گھر اس گھر کی تو رونق ہی چلی گئی، کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے یہ گھر۔" چھوٹے ماموں کی بھی طبیعت خراب تھی اس لئے وہ آج گھر ہی تھے، عباس سیدھا ان کے کمرے میں آیا تھا ماموں کو بستر پر لیٹا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا، پہلے والے ماموں سے اب والے ماموں کتنے مختلف لگ رہے تھے، کمزور، نحیف، نحیف سے، ممانی بتا رہی تھیں کہ بھیا کی جدائی نے آدھا کر دیا ہے انہیں ہر وقت دھیان انہی کی طرف لگا رہتا ہے اور کچھ آغائی بیگم (عباس کی والدہ) کی جدائی نے بیمار کر دیا، جب سے وہ فوت ہوئی ہیں یہ بستر سے جا لگے ہیں۔

عباس نے گھر پر اک نظر ڈالی، ویرانی سی چار سو پھیلی تھی گرمیوں کے دن تھے ہر طرف سناٹے کا راج تھا، ماموں کے دونوں بیٹے اسکول گئے ہوئے تھے بس وہ دونوں میاں بیوی گھر میں رکھی غیر اہم چیزوں کی طرح چپ چاپ ایک کمرے میں بڑے ہوئے تھے، بھائی بھائی کا سہارا ہوتا ہے، اس جملے کی حقیقت اس پر اب آشکار ہوئی تھی، ماموں ممانی سے ملنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا بے کل ویسا ہی کمرہ تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا، ہر چیز کرینے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی تو ابن پتہ نہیں کہاں ہے؟ اس کے ذہن نے ایسے ہی سوچا، اس گھر میں اس کا مقام بھی گھر کے مکیں جیسا ہی تھا اس کی طرف دھیان جانا اچنبھے کی بات نہیں تھی، ممانی اس کے پیچھے ہی چلی آئیں۔

"گھر کے مکینوں کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا، اکثر اکیلی پھرتی میں یہی سوچتی رہتی ہوں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے تنہائی، بڑی بھابھی ہوتی تھیں تو کوئی بات نہیں بھی ہوتی تھی تو ہم بولتی رہتی تھیں گھر کا آدھے سے زیادہ نظام وہ خود

چلاتی تھیں، میرے اوپر کوئی ذمے داری نہیں تھی، لیکن اب ہر کام میری ذمے داری ہے۔" ممانی جان اپنے رونے روئے جا رہی تھیں، عباس ان کی باتیں بھی سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن سلطنت اور اپنے بچے کی سمت دوڑ لگائے ہوئے تھا، پریشانی کے ساتھ ساتھ اک خوش کن احساس اسے گھیرے ہوئے تھا، کاش سلطنت میں اس وقت تمہارے پاس ہوتا، اپنے بچے کو تمہاری بانہوں میں کھیلتے دیکھتا۔

"اور سناؤ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے ناں، اکبری کیسی ہے، ناہید، زینو۔" ممانی جان بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، انہوں نے فرداً فرداً سب کے بارے میں پوچھا تھا۔

"الحمدللہ ہر طرف خیر و عافیت ہے، ہاں میں جب ہندوستان آنے کا قصد کر رہا تھا تب زینو کراچی سے لاہور رہنے آئی تھی۔"

"چلو شکر ہے خدا کا بچیاں اپنے گھروں میں آباد ہیں، بھیا صاحب کیسے ہیں، آغائی بیگم کے بعد تو تنہا ہو گئے ہوں گے، بیوی کا ساتھ ہونا بہت بڑی نعمت ہوتا ہے، بندہ اپنے دکھ سکھ بانٹ لیتا ہے۔" ممانی جان کی بات سن کر اس نے اک ٹھنڈی سی آہ بھری، بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں وہ، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چلنا، بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتا ہے اور میں ابھی تک ان بدنصیب لوگوں میں شمار ہوتا ہوں جن کی محبوب ان کے ساتھ نہیں اور اس میں قصور بھی میرے نصیب کا ہے نا ماں بیمار ہوتی نہ میں اسے چھوڑ کر جاتا اور نہ یہ دوریاں پیدا ہوتیں نا فاصلے حائل ہوتے، لیکن اپنے نصیب کو میں خود ہی بدلوں گا، اس نے بڑے پرعزم انداز میں خود کو جواب دیا۔

ممانی جان اب بھی اس کے سامنے بیٹھی، باتیں پوچھ رہی تھیں۔

"سنا ہے حسن مستقل اعظم گڑھ آ گیا، میرے چچا کا بیٹا ملا تھا مجھے لکھنو آیا تھا وہ پچھلے دنوں، بتا رہا تھا ظہورن بی بڑے ٹھاٹھ سے رہ رہی ہے میاں کو بھی نوکری مل گئی ہے۔" ممانی جان کی بات سن کر عباس کو جیسے اطمینان ہوا تھا کہ چلو بھائی بھابھی سیٹ تو ہیں چاہے کہیں بھی رہیں۔

"میاں یہاں تو بہت گرمی ہے میں تو کہتی ہوں نیچے ہی چلے چلو۔" ممانی کو گرمی کا احساس ہوا تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نہیں ممانی جان، میں جب تک یہاں ہوں زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی بتانا چاہتا ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ جانے لگیں تو جانے آگے جا کر کیا خیال دل میں آیا اور وہ پھر واپس آ گئیں۔

"اکبری کیسی ہے تمہارے ساتھ ٹھیک رہتی ہے ناں۔" اکبری کے ذکر پر وہ چونک گیا کیونکہ فی الحال وہ اس وقت دور دور تک اس کے ذہن میں نہیں تھی۔

"بہت اچھی ہے اور بہت اچھے سے رہ رہی ہے۔" عباس نے ایک جھوٹ بول کر ممانی جان کو مطمئن کر دیا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ بڑی خوش قسمت ہے عباس بہت اچھا لڑکا ہے۔" ممانی جان کی بات پر وہ مسکرا دیا تو وہ دوبارہ زینے کی طرف مڑ گئیں۔

☆☆☆

رات تیسرے پہر کا گجر بجا رہی تھی، تیسرا پہر یعنی کے رات کا آخری پہر، یہ رات کا ایسا پہر ہوتا ہے جب گہری نیند انسان کو اپنی آغوش میں

لے لیتی ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ جانے خواب کے ہمراہ کن کن وادیوں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔

سلطنت اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ اس گھر کے اکلوتے کمرے کے فرش پر تھکی ہاری سو رہی تھی، حمیدن خالہ آنگن میں کھٹیا بچھائے ہوئے تھیں، آگرہ کے کھلے آسمان پر چاند کے ساتھ ساتھ چمکتے ستاروں کا راج تھا، چاندنی ہولے سے آسمان کے زینے سے اترتی نیند کی وادی میں ڈوبے ہوئے، دن بھر کی گرمی سے نڈھال لوگوں پر ٹھنڈک بن کر چھا رہی تھی، ہر طرف پرسکون سی خاموشی چھائی تھی ایسی خاموشی جو ٹوٹے تو دکھ ہوتا ہے۔

لیکن حمیدن خالہ جاگ رہی تھی اسے کسی کا انتظار تھا۔

سرمئی اندھیرے میں ڈوبے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے پروں میں سر دیئے نیند کی مزے لوٹ رہے تھے۔

آگرہ کا آسمان چاند کی سنگت میں اپنے بخت پر نازاں سرمئی اندھیرے کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔

لیکن دھرتی کی آغوش میں بکھرے ہوئے ان موتیوں میں سے ایک موتی ایسا بھی تھا جس کا بخت اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹی میں رولنے والا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، خالہ جو پہلے سے چوکنی ہو کر بیٹھی تھی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا، رفیق نشے میں دھت خالہ کے اوپر ہی آن گرا مگر خالہ پہلے سے ہی اس کی ان عادتوں سے واقف تھی اس لئے بغیر آواز پیدا کیے دروازہ بند کرتی اسے سہارا دے کر آنگن میں لے آئی اور اسے کھٹیا پر بیٹھا دیا، دونوں میں ہمیشہ کی طرح پہلے کوئی بات طے ہو چکی تھی اس لئے وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے رہی تھی۔

سلطنت کے پہلو سے وہ بڑے سلیقے کے ساتھ ننھا محمد اٹھا لائی تھی، بچہ بھی گہری نیند میں تھا ماں کی طرح، ہائے رہی گہری نیند۔

رفیق بھی نشے کے باوجود طے ہوئے پروگرام کے تحت اٹھ کر کھڑا ہو گیا، خالہ نے بچے کو کھٹیا پر سلا دیا اور آنکھوں سے رفیق کو اندر جانے کا اشارہ کیا، وہ نشے سے سرشار کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اندر سے کنڈی لگالی، خالہ اس سے بھی سیانی تھی اس نے پکڑ باہر سے بھی کنڈی لگا دی۔

دروازہ بند ہو گیا، سلطنت قسمت کے ہاتھوں مات کھانے جا رہی تھی وہ قسمت جس نے کبھی اسے پھولوں کی پتیوں پر چلایا تھا دودھ میں نہلایا تھا وہی قسمت آج دو کوڑی کے آدمی کے ہاتھوں اسے برباد ہوتا دیکھ رہی تھی۔

آگرہ کا آسمان پہلے بھی خاموش تھا اور اب بھی خاموش ہے، کیوں وہ اتنے بڑے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہا، کیوں ایسی پیاری لڑکی کو برباد ہوتے دیکھ رہا ہے جو اپنے پیار کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ آئی تھی، کیوں اسے سچی خوشی نہ مل سکی۔

چاند تارے سب اپنے اپنے دائرے میں خاموشی کے ساتھ محو سفر تھے، اس ظلم کے خلاف کوئی سرخ آندھی نہ چلی، نہ تارے ٹوٹے اور نہ بجلی کڑکی۔

چاند شرمندہ سا بادلوں کی اوٹ میں ہو لیا تھا جو جانے کہاں سے آ نکلے تھے، ابھی تو آسمان صاف تھا ہر چیز اپنے توازن کے ساتھ چل رہی تھی، پھر یہ کیسے بادل آئے تھے جو کسی کی شرمندگی

مٹا رہے تھے اور کسی کی بڑھا رہے تھے۔

ہر طرف خاموشی چھائی تھی صرف اس کی فلک شگاف چیخوں کی آوازیں سینہ پھاڑ رہی تھیں، اس کی آواز کمرے کی دیواروں کے ساتھ سر پٹخ رہی تھی کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں تھا، حمیدن خالہ کانوں میں روئی ٹھونسے مزے سے سو رہی تھی، کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں، وہ بھی ہانپ چکنے کے بعد نیند کی وادی میں اتر چکے تھے۔

عباس کے دل کی ملکہ کسی اور کے ہاتھوں برباد ہو رہی تھی، وہ عباس جس کے لئے وہ امن اور پیار کا گہوارہ تھی جس کی خاطر وہ اتنی دور سے آیا تھا جس کی خاطر اس نے اکبری کو نظر انداز کیا، تو کیا یہ اس کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔

تو کیا پیار کرنا گناہ ہے اور پیار کا ہمیشہ کے لئے ہو رہنا یہ بھی گناہ ہے، اگر نہیں تو پھر اس کی اتنی بڑی سزا کیوں؟ کیوں زمانے کے دل میں رحم نہیں آ رہا؟

دھیرے دھیرے اونچی اونچی آوازیں آنا بند ہو گئیں بس سسکنے کی آوازیں دروازے پر دستک دے رہی تھیں کہ کوئی تو کھولو اسے۔

یہ دروازہ اگر کھل بھی جائے تو اب کیا فرق پڑتا ہے، باقی دروازے تو اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے تھے۔

☆☆☆

آگرہ ریلوے اسٹیشن پر اس نے قدم رکھا تو دل خوشی سے سرشار ہو گیا اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی، یہ وہی شہر ہے جہاں اس کے دل کی ملکہ اور اس کا بیٹا سانس لے رہے ہیں اور آج اس کی سانسیں بھی ان کی سانسوں میں شامل ہو گئیں کیسا خوش آئند احساس تھا۔

آگرہ دو پیار کرنے والوں کے ملن کی یادگار یہ شہر جہاں تاج محل بہار کا سمبل بنے آنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے، یہ ممتاز محل کے محبوب شوہر شاہ جہان کا شہر ہے جو اپنے محل کے پہلو میں بہنے والی جمنا کو اپنا ساتھی بنا کر ممتاز تک اپنے دل کی تڑپ پہنچاتا تھا یہ پیار بھی کیسا عجیب رشتہ ہے جو اپنے علاوہ اور کچھ بھی سجھائی نہیں دینے دیتا۔

کسی تانگے والے کے پکارنے پر وہ ادھر کو ہو لیا اور پھر خورشید کے بتائے ہوئے پتے پر چلنے کے لئے کہتا خود بھی تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ میں مختلف تھیلے تھے، سلطنت اور اپنے بیٹے کے لئے وہ لکھنؤ سے کچھ لے کر آیا تھا، آج پہلی دفعہ وہ اپنا بچہ دیکھے گا، سینے کے اندر اک عجیب سی کشش ہچکولے کھا رہی تھی کیسا میٹھا سا احساس تھا جو اسے اندر ہی اندر گدگدا رہا تھا، تانگہ مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں تھا، خاموش سڑکوں پر تانگے کی ٹپ ٹپ کی آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں اور آج تو اسے سب کچھ ہی بہت اچھا لگ رہا تھا خوشی سے چہرے کا رنگ ہی بدل چکا تھا۔

اس نے اک ٹھنڈی سی آہ بھری، پچھلے ایک سال سے میری سلطنت جانے کن حالات سے گزر رہی ہے، میری خاطر اس نے گھر چھوڑا محل چھوڑا، کٹیا بسا لی، نا جانے کیسے نا مساعدہ حالات سے واسطہ پڑا ہوگا۔

سلطنت میں تمہارے پیروں میں چبھنے والے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے نکالوں گا، اپنی محبت سے تمہارے دل پر لگے زخموں پر مرہم رکھوں گا، میرے اور میرے بچے کے لئے تم نے جو بھی جوکھم اٹھائے ہیں میرے سر آنکھوں پر۔

دل ہی دل میں وہ سلطنت سے مخاطب تھا، تانگے نے اک موڑ کاٹا، لمبی سی خالی سڑک پر صرف دھوپ کا راج تھا، گرمی کے مارے سڑک

آگ اگل رہی تھی، تانگے والے نے سڑک کے کنارے کھڑے اکلوتے درخت کے نیچے تانگہ کھڑا کیا وہ گھوڑے کی پیاس کی شدت جان گیا تھا، تانگے کی سیٹ کے نیچے سے اس نے لوہے کا ٹین نکالا اور پھر تھوڑی دیر بعد جانے کہاں سے پانی سے بھرا ٹین لا کر اس نے گھوڑے کے آگے رکھ دیا، پیاس کی شدت نے اسے پاگل کیا ہوا تھا دیکھتے دیکھتے وہ پانی سے بھرا سارا ٹین ختم کر گیا، گھوڑا زور سے ہنہنایا، جیسے اپنی زبان میں اپنے مالک کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

گھوڑے نے ہولے ہولے اپنی منزل کی طرف چلنا شروع کیا اور پھر جیسے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد اپنی جائے منزل پر کھڑا تھا۔

یہ آگرہ کی چند غریب بستیوں میں سے ایک بستی تھی، عباس چند ثانیے تک بڑی عجیب نظروں کے ساتھ اردگرد کے ماحول کو دیکھتا رہا، گندے پانی کے جوہڑ جن میں گائے بھینس بیٹھی تھیں۔

کچی گلیوں میں بچوں کے دوڑنے کے باعث دھول اڑ رہی تھی۔

عباس کو جیسے یقین نہ آیا کہ وہ لکھنو کے نواب رجب علی کی بیٹی سلطنت جو چلے تو دو خادمائیں اس کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتی تھیں وہ یہاں رہ سکتی ہے، وہ بے یقینی کے سے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور تانگے والے سے دوبارہ اس جگہ کی تصدیق کی۔

جگہ وہی تھی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا، تانگے والے کو فارغ کرنے کے بعد وہ پتہ ہاتھ میں پکڑے بستی کے اندر داخل ہوا، اس بستی میں اکثریت ایسے مکانوں کی تھی جن کی دیواریں ٹین کی بڑی بڑی چادروں سے بنائی گئی تھیں اور مٹی سے بنے ہوئے گھر بھی شامل تھے، لوگ اپنے اپنے کاروبار زندگی میں معروف تھے، سائیکلوں والوں اور ریڑھی والوں سے بچتا وہ ایک دکان کے آگے کھڑا ہو گیا اور اسے پتے والی پرچی تھما دی، پتہ پڑھ کر اس نے چند اشارے بتائے اسے۔

وہ اس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق ایک لمبی سی گلی میں داخل ہوا جس کی ایک طرف مکان تھے اور دوسری طرف قبرستان، میری سلطنت یہاں رہتی ہے لحہ لحہ اس کے دل میں اک ٹیس سی اٹھ رہی تھی جتنی خوشی اور سرشاری لئے وہ ایک شہر میں داخل ہوا تھا یہاں آ کر اتنا ہی اداس اور مایوس ہو گیا تھا، کیا سوچا تھا اور کہاں آ گیا وہ۔

گلی میں کافی رش لگ رہا تھا جیسے بہت سارے لوگ جمع ہوں یہاں، اس نے سوچا اور تھیلے ہاتھ میں پکڑے آگے بڑھتا رہا، جوں جوں وہ آگے جا رہا تھا لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ سوچنے لگا کہ ایسا کیا ہو گیا ہے یہاں جو اتنے لوگ جمع ہیں۔

پتے کے مطابق وہ جس گھر کے سامنے کھڑا تھا اسی گھر کے اندر لوگ جمع تھے، گھر تو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لوگوں سے۔

''کیا اسی گھر میں سلطنت رہتی ہے۔'' وہ لوگوں کو پیچھے ہٹاتا اندر داخل ہو گیا اور پھر جو سین اس نے دیکھا اسے دیکھنے سے پہلے اسے موت آ گئی ہوتی تو اچھا تھا، پل بھر کے لئے وہ جیسے بالکل خالی الذہن ہو گیا، اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی، ایسا کیا دیکھ لیا تھا اس نے جس کو اس کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔

ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھیلے زمین پر گر چکے تھے ان میں سے چیزیں باہر نکل کر بکھر گئی تھیں، سلطنت کے کپڑے بچے کے کھلونے اس کے کپڑے اسی کسی چیز کی ہوش نہیں تھی وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی سلطنت کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، لیڈی پولیس کے سامنے وہ سر جھکائے کھڑی تھی، یا کیا ہو گیا تھا اس سے، کیوں اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہیں، پے در پے وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا لیکن اس کے سوالوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا کون تھا جو اسے بتاتا کہ اس کی سلطنت کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا اس سمت بڑھنے لگا، پیر تو جیسے من من کے ہو گئے تھے اٹھ ہی نہیں رہے تھے، سلطنت اب بھی اسی حالت میں کھڑی تھی، خاموش نظریں جھکائے ہوئے بس اس کے قریب کھڑی ایک عورت جیسے اسے کوسنے دے رہی تھی بلکہ ایک دفعہ تو اس نے سلطنت کی کمر پر تھپڑ بھی رسید کیا اور عباس کو لگا جیسے یہ تھپڑ سلطنت کے نہیں اس کے منہ پر مارا ہو۔

وہ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لئے سلطنت کے سامنے کھڑا ہو گیا پولیس والے اسے منع کرتے رہے لیکن وہ کسی کی نہ سنتا آگے بڑھ آیا۔

''کون ہیں آپ اور یہاں کیوں آئے ہیں؟'' لیڈی پولیس نے بڑی ناگواری کا اظہار کیا۔

''میں سید عباس زیدی، سلطنت کا شوہر۔''

اتنا سننا تھا کہ ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے ہاتھوں میں جنبش ہوئی لیکن جھکا ہوا سر اٹھا نہیں، عباس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن سلطنت کا جیسے کندھے کو پیچھے کرتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، عباس اس وقت جس ذہنی کشمکش کا شکار تھا اس نے غور نہیں کیا۔

''آپ یوں میری بیوی کو ہتھکڑیوں میں باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔'' عباس کی بات پر اس نے سر اوپر اٹھایا اور عباس کی سمت دیکھا، سپاٹ آنکھیں، سلے ہوئے ہونٹ، پیلا رنگ، کمزور چہرہ، کیا یہ وہی سلطنت ہے جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

قسمت کے دیئے ہوئے دھوکے کو وہ بڑی سپاٹ نظروں سے دیکھ رہی تھی، آنکھیں خاموش تھیں مگر موتیوں کی طرح ان سے بہتے والا پانی کوئی اور ہی کہانی کہہ رہا تھا، عباس بے چین ہو گیا، تنو کا روتا اس سے کہاں برداشت ہوتا تھا۔

''خون کیا ہے تمہاری بیوی نے۔'' لیڈی پولیس دھاڑنے والے انداز میں بولی، عباس کے سر پر تو جیسے پتھر سا آن گرا مگر سلطنت اسی سپاٹ سے انداز میں آنسو بہا رہی تھی۔

''یہ نہیں ہو سکتا، آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، یہ...... یہ کیسے خون کر سکتی ہے۔'' عباس مان ہی نہیں رہا تھا اور وہ مانتا بھی کیسے اس کی سلطنت ایسی تھی ہی نہیں، وہ تو بڑی نازک پیار کرنے والی لڑکی تھی وہ کسی کا خون بھلا کیسے کر سکتی ہے۔

عباس کے یوں اس کے مددگار کی حیثیت سے بیچ میں آ جاتے ہر لوگ ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔

''ہم سے کیا کہتے ہو اسی سے پوچھ لو۔'' حمیدن خالہ نے سلطنت کو بازو سے پکڑ کر عباس کی سمت دھکا دیا۔

''یہی ہے قاتل رفیق کی، اس نے بھاری پتھر اس کے سر پر مار کر اسے کچل دیا۔'' عباس نے سلطنت کی طرف دیکھا، وہاں اب بھی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، لیکن وہیں کئی شکوے بھی ہچکولے کھا رہے تھے وہ جس کی خاطر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا، اپنے اتنے اہم رشتے گنوائے وہ آیا بھی تو کسی وقت جب اس کے پاس شکوہ

کرنے کے لئے بھی وقت نہیں تھا عباس سامنے تھا تو گزرا وقت اک فلم کی صورت اس کے سامنے سے گزرنے لگا، وہ دن وہ راتیں، کیوں چلا گیا وہ زمانہ، وہ بڑی لاچاری سے عباس کی طرف دیکھ رہی تھی، آنکھوں سے تو جیسے برساتی نالے چھوٹ پڑے تھے، عباس ابھی تک لیڈی پولیس کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔

''مجھ پر یقین نہیں تو اسی سے پوچھ لو۔''

''ہاں ہم نے مارا ہے اس کمینے کو۔'' سلطنت کی آواز پر وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

''کیوں، سلطنت کیوں۔'' وہ دونوں کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا، اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کی سلطنت یہ سب بھی کر سکتی ہے۔

''بولو، سلطنت، خدارا کچھ تو بولو۔'' وہ روتا ہوا دوسری طرف منہ پھیر گیا۔

''آپ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم نے ایسا کیوں کیا اور اگر ہم یہ کہیں کہ جو ہم نے کیا اس کی شروعات آپ سے ہی ہوتی ہے۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی عباس سے شکوہ کر بیٹھی۔

''نہ آپ ہمیں یوں بے آسراؤں کی طرح چھوڑ کر جاتے اور نہ ہم ان حالوں کو پہنچتے ہم نے اپنے کتنے عزیز رشتے کھوئے ہیں، آپ اس اذیت کو محسوس نہیں کر سکتے۔'' عباس منہ پھیرے اس کی باتیں سن رہا تھا، نظریں ملانے کی ہمت نہیں جتا پا رہا تھا وہ، وہ جو بھی کہہ رہی تھی بالکل ٹھیک تھا نا وہ اسے چھوڑ کر جاتا اور نا وہ ہتھکڑیوں میں قید ہوتی۔

وہاں موجود ہجوم میں سے طرح طرح کی آوازیں عباس کے کانوں تک آرہی تھیں کوئی اسے بے قصور کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔

''ہم نے صرف آپ سے محبت کی عباس، آپ کے علاوہ کوئی اور ہمیں چھوئے یہ منظور نہیں۔'' عباس نے اس کی طرف رخ کیا تو سلطنت کے چہرے پر بچی محبت کا رنگ دیکھ اس کا دل چاہا وہ آگے بڑھ کر اس معصوم سی لڑکی کو گلے سے لگا لے اور اس کے سر پر لگے سارے الزام اپنے سر لے لے۔

''اتنا کچھ ہو گیا عباس مگر ہم اب بھی آپ سے محبت کرتے ہیں بے انتہا اور خود کو آپ کا گناہ گار بھی سمجھتے ہیں۔'' عباس اس کے اور قریب گیا اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''نہیں عباس، مت چھوئیں مجھے۔'' اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔

''ہم آپ کی محبت کے قاتل ہیں، ہم لٹ چکے ہیں عباس، گھن آتی ہے ہمیں خود سے، ہمیں مار ڈالیں، ہم آپ کی محبت کی اور خود کی حفاظت نہیں کر سکے۔'' مگر اندر سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی اس سینے کے ساتھ لپٹی رہے ان بانہوں کو پانے کے لئے اس نے اتنے جتن کئے تھے اس نے تو انہی بانہوں میں اپنے روز و شب گزارنے کے لئے یہ سب کیا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے روز و شب جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزریں گے۔

''اب بس کرو، یہ سب۔'' لیڈی پولیس کے ساتھ موجود مرد اہلکار نے عباس کو بازو سے پکڑ کر سلطنت سے الگ کر دیا اور وہ ایسے خاموش کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ہارا ہوا جواری اپنی ساری پونجی لٹانے کے بعد بے آسرا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے بھی سلطنت ہی سب کچھ تھی، زندگی موت، پیار محبت، کیسے سانس لے گا وہ اس کے بغیر۔

سلطنت نے جاتے جاتے عباس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''آپ کی امانت آپ کو لٹانی ہے۔'' عباس کی روتی آنکھوں میں تجسس سا ابھر آیا، اس نے ننھے محمد کو عباس کے ہاتھوں پر ڈال دیا، دل کا بوجھ کم ہو گیا تھا۔

''یہ آپ کا اور ہمارا بیٹا ہے محمد، ہمارے پیار کی نشانی۔'' عباس کے ساتھ ساتھ سلطنت کی آنکھیں ایک دفعہ پھر ساون لٹانے لگیں۔

''میں نے کتنے خواب دیکھے تھے، اپنے بچے کے۔'' وہ بے بسی سے دونوں باپ بیٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم تینوں کا ملن قسمت میں لکھا ہی نہیں ہے، دو ملتے ہیں تو تیسرا جدا ہو جاتا ہے، لیکن ہم پھر بھی خوش ہیں کہ اب یہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اپنے باپ کے پاس، اسے لے کر پاکستان چلے جائیے گا عباس۔'' وہ بات کرتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اور اسے کبھی نہیں بتائیے گا کہ اس کی ماں کون تھی اور کہاں ہے، ہم بہت بد قسمت ہیں عباس، بہت یہاں آ کر ایسے حالات دیکھ وہ تو بھول ہی گیا کہ اس کا بچہ بھی ہے اپنے ہاتھوں میں وہ ننھی سی جان کو اٹھائے بھیگی آنکھوں کے ساتھ چوم رہا تھا۔

''سلطنت۔'' کتنی بے بسی تھی اس کی آواز میں۔

''میں تمہارے آزاد۔''

''نہیں عباس۔'' اس نے عباس کے جملے کو درمیان سے کاٹ دیا۔

''نہیں، میں اس قابل نہیں ہوں کہ کبھی دوبارہ آپ کا سامنا کر سکوں، میں مجرم ہوں آپ کی۔''

''مجھے تم ہر حال میں قبول ہو، میں نے تمہاری روح سے محبت کی ہے، ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے جو کسی تیسرے کے چھونے سے ٹوٹ جائے گا، میں اپنی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا، یہ سرحدیں میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتیں، میں اور میرا بچہ تمہارا انتظار کریں گے۔'' اس نے خود سے دور ہوتی سلطنت کو آواز دی۔

وہ آواز آگرہ نے نہیں پورے ہندوستان نے سنی تھی، وہ آخری سانس تک سلطنت کے لئے لڑے گا، وہ اسے واپس پاکستان لے کر جائے گا، چاہے اس کے لئے اسے کچھ بھی کرنا پڑے، محبتوں کا قرض چکانا تھا، پہلے سلطنت کی باری تھی اور اب اس کی باری۔

وہ اسے اکیلے کیسے چھوڑ سکتا ہے، ایک دفعہ پہلے اس سے غلطی ہوئی تھی مگر اب کی بار وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

☆☆☆

سندس جبیں

چودھویں قسط

اس نے کال ملائی اور بیل جانے کی آواز سننے لگا۔

''لیس۔'' ستارا نے فون اٹھا کر کہا۔

''مس ستارا! آج کی اپائنٹمنٹ کینسل کر دیجئے Im a little bit busy۔'' اس نے اپنے مخصوص سرد اور بے تاثر لہجے میں کہا۔

''اوکے سر، نئی اپائنٹمنٹ؟'' اس نے پوچھا۔

''فی الحال نہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی، فون ہاتھ میں پکڑے وہ کچھ دیر خاموشی سے ایزی چیئر پہ جھولتا رہا پھر اٹھا اور شاور لینے کے لئے باتھ روم کی سمت بڑھ گیا، کچھ دیر بعد وہ ہاتھ گاؤن میں باہر آیا تو اس کی بیوی موجود تھی، وہ تیار ہونے میں اس کی مدد کرنے لگی، وہ یونیفارم پہن رہا تھا، وہ خاموشی سے اس کی شرٹ کے بٹن بند کرنے لگی، پھر کف لنکس لگائے اور شوز اس کے نزدیک لا کر رکھ دیئے، وہ صوفہ پہ بیٹھ کر شوز پہننے لگا، اس سے فارغ ہو کر

ناولٹ

اس نے بیلٹ باندھا اور بال بنانے لگا اور پھر اس کی طرف مڑا جو کہ ایک طرف کھڑی تھی، کمرے میں مکمل خاموشی تھی، وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، اس کی بیوی کا چہرہ، اس کا عزیز تر چہرہ، ان کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے مگر وہ آج بھی پہلے دن جیسی لگی اسے، اسے ان دونوں کا پہلا تعارف یاد آیا تھا۔

''نور کہاں ہے؟'' اس کی بیوی ایک فرماں بردار اور سلیقہ مند عورت تھی جو اس وقت اس کا والٹ اور اس کی ریسٹ واچ اس کی طرف بڑھا کر کہہ رہی تھی۔

''میں نے سسٹر وکٹوریہ سے بات کر لی ہے، تم آج اسے لے جاؤ اور ایڈمیشن کی فارملیٹیز پورا کر لو۔'' اس نے والٹ جیب میں رکھا اور

واچ باندھنے لگا، وہ اپنی بیٹی کو پلے گروپ میں ایڈمٹ کراونا چاہ رہا تھا، وہ تذبذب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی، پھر نظر چرا گئی۔

"پلیز میں ایسا نہیں چاہتی، مجھے فورس نہ کریں۔" وہ نم لہجے میں بول رہی تھی سر جھکا ہوا تھا، پرفیوم اسپرے کرتا اس کا ہاتھ رک گیا، وہ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے اس کے قریب آ گیا۔

"کسی فیصلے کا اختیار تو میرے پاس رہنے دو۔" اس کا لہجہ مدھم تھا۔

"آپ کی اپائمنٹ تھی آج۔" وہ بات بدل گئی، اب اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

"پلیز میں بہت تکلیف میں ہوں مجھے اور اذیت مت دو۔" وہ کربناک آواز میں بولا تھا۔

تولیہ اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے، وہ بے ساختہ مڑی اور اس کو دیکھا، یونیفارم میں ملبوس، اونچا لمبا، خوش پوش و خوبصورت اور اس کے ملائم بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔

"I do not want to hurt you, never a single tome Please trust me okey i will go۔" اس کی آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی اور آواز بھرا گئی تھی، اس نے بمشکل بات پوری کی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"کیا ہے یہ سب؟ کیا ہے بولو۔" مرینہ نے حبا کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا، وہ ابھی ہوش میں آئی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو؟ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی، جواب دو مجھے۔" انہوں نے اس کا شانہ ہلایا، حبا بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی جیسے ان کا مدعا سمجھ نہ پا رہی ہو۔

"تمہارا باپ کہتا ہے، تمہارا کالج دوبارہ شروع کر دوؤں، تم اب یہیں رہو اور تم یہ گل کھلا کے بیٹھی ہو، خیر کوئی بات نہیں اب تیمور کو یاد آ جائے گا کہ تم "شادی شدہ" ہو۔" ان کا لہجہ استہزائیہ و زہریلا تھا۔

"کیا ہوا ہے ماما؟" وہ ان کے تیور دیکھ کر سہم گئی تھی۔

"میں بتاؤں میں......؟ تم نہیں جانتی ہو کیا ہوا ہے؟" انہوں نے غصے سے پاگل ہوتے ہوئے اس کے منہ پہ زوردار تھپڑ مارا تھا، حبا کے منہ سے چیخ نکل گئی، اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"ماں بن رہی ہو تم۔" وہ اسی تنی سے بولتی گئیں۔

"میری تربیت کو ذلیل تو کیا ہی تھا تم نے، تمہارے باپ نے بھی بڑی رعونت سے میرے بیٹے کو گھر سے نکالا، اب مناؤ دونوں مل کر خوشیاں، ایک ڈھول سر پہ رکھ کے ناچو۔" مرینہ کو خود پہ قطعی قابو نہ رہا تھا وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھیں، حبا کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔

"تھک گئی میں پوچھ پوچھ کر، کہ آخر ہوا کیا تھا؟ مگر کچھ نہیں بتایا تم نے مجھے، بس تیمور نے جھٹ سے کہہ دیا "اسے اسید نے مارا ہے" ہوا کیا تھا؟ وجہ کیا تھی یہ نہیں بتایا، اب سناتی ہوں تمہارے باپ کو یہ خوشخبری۔" وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں وہ وہیں بیٹھی رہی خاموش اور گم صم، اس کے اندر پھیلی ویرانی میں ایک بازگشت پھیل رہی تھی اور یہ تلخ سرگوشی اس کا دل کھرچ رہی تھی، اپنے نوکیلے ناخنوں سے، وہ درد سے بے حال ہوتی ہوئی بیڈ پہ اوندھی گر گئی۔

اور یہ پورا دن گزر جانے کے بعد کی بات تھی جب وہ رات کے اندھیرے میں بیک لان کی گھاس پہ بیٹھی تھی، کتنی بار اس کا دل چاہا کہ وہ

سب کچھ بھول کر ماں کے گلے لگ کر انہیں سب کچھ بتا دے، انہیں ایک ایک زخم دکھائے، ایک ایک خراش کی اذیت بتا بتا کر روئے، یوں کہ نڈھال ہو جائے اور پھر وہ مر جائے اس دنیا سے دور چلی جائے، کاش ایسا ممکن ہو پاتا، کاش وہ انہیں بتا پاتی کہ اس نے کیا صلہ پایا، مگر یہ ممکن ہی نہ تھا، مرینہ خانم نے اسے ایک ہی لفظ "میرا بیٹا" کہہ کر باور کروا دیا تھا کہ وہ "اسید مصطفیٰ" کی ماں ہیں۔

اس کا دل چاہا کاش کوئی دروازہ کوئی روزن اسے ایسا نظر آتا جسے وہ اس دنیا سے فرار کا ذریعہ بنا لیتی اور پھر مڑ کر نہ دیکھتی، مگر کاش ایسا ممکن ہو پاتا، کاش وہ اعمال کی اس گھڑی سے چھٹکارا پا سکتی اور پھر زندگی میں واپس جا پاتی، مگر چھٹکارا پانا اتنا آسان کب تھا؟ وہ سن ہوتے اعصاب کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی، بہت دیر بعد اس نے تیمور احمد کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

"کیا ہوا ہے حبا؟ ایسا یہاں کیوں بیٹھی ہو بیٹا؟ اٹھو سردی کتنی بڑھ گئی ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"مجھے واپس بھجوا دیں پاپا۔" حبا کی آواز مستحکم تھی یوں جیسے وہ اندر ہی اندر کوئی فیصلہ لے چکی ہو۔

"کیوں کیوں؟ جانا چاہتی ہو واپس؟" وہ غصے میں آ گئے۔

"کیونکہ میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔"

"حبا!" وہ ششدر سے رہ گئے۔

"ایسا کیوں کہا تم نے؟ بوجھ اللہ تمہارے حال پہ رحم کرے، میری اکلوتی بیٹی ہو، کون سا ڈھیر لگا ہے میرے گھر اولاد کا، کیوں سوچا تم نے ایسا؟ بولو نا، بتاؤ مجھے آخر ایسا کیا ہوا تھا لاہور اسید کے ساتھ کس بات پہ جھگڑا ہوا تمہارا؟" وہ اب

پوچھ رہے تھے، حبا نے دل پر بڑھتے اس بوجھ کو دیکھا جو اس کا سانس گھونٹ دینے کے درپے تھا اور پھر بے ساختہ لرزتے ہاتھ ان کے بازو پہ جما دیئے۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے پاپا، ہم بدصورت لوگ، خوبصورت لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتے، گر جاتے ہیں لڑکھڑا کر یا تھک کر، ابھی میں نے اس بدصورتی کا خراج نہیں بھرا، مجھے اس کے پاس بھجوا دیں، وہ مجھے یہاں رہنے نہیں دے گا۔" وہ سسک اٹھی، وہ کانپ رہی تھی، تیمور سناٹے میں رہ گئے۔

"حباچ میری بچی، مجھے بتاؤ تو سہی ہوا کیا تھا؟" وہ اسے ساتھ لگا کر خود بھی رونے لگے، وہ کچھ نہ بولی بس روتی رہی، پھر بہت دیر بعد بولی تھی۔

"وہاں بہت اندھیرا تھا اور بہت تنہائی اور بھوک، میں نے چار ماہ ایک قتل کے مجرم کی طرح کال کوٹھڑی میں گزارے ہیں پاپا، میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے کھلی ہوا اور آسمان کی شکل یہاں آ کر دیکھی، مجھے سب کچھ بھول گیا ہے، سب کچھ بس ایک بات یاد رہ گئی ہے بس یہ یاد ہے کہ میں اس دنیا کی سب سے بری لڑکی ہوں اور میں نے ایک پاک باز مرد پہ جھوٹا الزام لگایا ہے، وہ کہتا تھا کہ بہتان کے لئے اٹھنے والے ہاتھوں کو کاٹ دینا چاہیے، میں نے آپ سوچ بھی نہیں سکتے میں نے یہ دن وہاں پہ کیسے گزارے ہیں، کاش میں آپ کو بتا سکوں کہ میں نے وہاں کیا کچھ سہا ہے؟ میں دھوکہ کھا گئی پاپا، میں اس کے ظاہر سے دھوکہ کھا گئی، پتا ہے ان مہینوں میں یہی سوچتی رہی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ بہت سوچا، بہت سوچا مگر جواب وہی ملا کہ میں خود غرض ہو گئی تھی، میں نے صرف اپنے بارے میں سوچا، صرف یہ سوچا کہ وہ مجھے مل جائے، کسی بھی طرح مل جائے، اس کے لئے مجھے جو طریقہ سمجھ آیا میں نے اختیار کر لیا، جانتے ہیں کیوں؟" وہ باپ کے بازو پہ سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی، تیمور کے لئے اسے اس حالت میں دیکھنا بڑا کٹھن تھا وہ ان بازوؤں پلی اکلوتی بیٹی تھی جس کے ماتھے پہ بل دیکھ کر انہیں باقی ہر بات بھول جاتی تھی۔

"پتا نہیں کب سے مگر یہ خیال میرے دل میں بڑا پختہ تھا کہ لوگ سیرت کی بجائے صورت سے متاثر ہوتے ہیں اور پاپا میں بدقسمتی سے خوبصورتی کے پیمانے پہ پوری نہیں اترتی تھی، میں لوگوں کو کب تک اپنی صلاحیتوں اور ذہانت سے متاثر کر پاؤں گی، میں نے سوچا کہ اسید تو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے، بس مجھے اسے پانا ہے ہر حال میں اور دیکھیں میری بدبختی کی انتہا، مرے ذہن میں یہ سوچ مضبوط تھی کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے اور یہ سوچ میرے دل میں پختہ کرنے والے آپ تھے، آپ تھے پاپا جنہوں نے مجھے یہ سمجھایا کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے، میں نے ضمیر کی جاگتی حسوں کو سلا دیا، کیا کرتی، چارہ ہی نہ تھا، آپ کو اب کیا جاننا ہے پاپا؟ یہ میری بے حسی کی کہانی ہے، یہ میری ...... میری رزالت اور ذلالت کی داستان ہے یہ میری عزت نفس اور تکریم کا تماشا ہے، مجھ میں یہ بتانے کا حوصلہ نہیں، مجھے مت پوچھیں، کچھ مت پوچھیں، مجھ میں بتانے کا حوصلہ نہیں ہمت نہیں پاپا۔" وہ اب سر دونوں ہاتھوں میں تھامے رو رہی تھی۔

"مجھے کچھ یاد نہیں، میں کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی، تیمور شکست خوردہ قدموں سے اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئے، وہ وہیں بیٹھی رہی، اب وہ بالکل چپ تھی اور یہ چپ بڑی تباہ کن ثابت ہوئی تھی۔

صد شکر کہ میری یادداشت گم ہو چکی ہے
میرے لئے کسی صدا کی بازگشت ممکن نہیں
تحفظ کبھی کبھی خود بخود ہی سو جاتا ہے
تم وہی ہو نا جو مجھے یاد نہیں رہے
سنا ہے!
میری یادداشت گم ہونے سے پہلے مجھے
بس تم ہی یاد رہ گئے تھے!

یہ اس سے اگلی صبح کی بات تھی جب مرینہ اسے جگانے کے لئے آئیں، وہ اٹھی ہوئی تھی اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں اور وہ بیڈ پہ کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔

"حبا! اٹھو بھئی منہ ہاتھ دھو لو، تیمور تمہیں ناشتے کی ٹیبل پہ بلا رہے ہیں۔" رات کی نسبت اب وہ پرسکون تھیں۔

"مجھے کمرے میں ہی بھجوا دیں۔" وہ کہتی ہوئی اٹھی اور جوتا پہن کر واش روم کی سمت بڑھ گئی۔

مرینہ نے اس کے لہجے کو جانچا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گئیں، وہ ان باپ بیٹی کے موڈز کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں، تیمور بھی رات سے بے حد پریشان اور غمگین تھے مرینہ کو چونکہ اپنا غصہ تھا جبھی انہوں نے بھی پوچھا نہیں اور اب حبا کی حالت وہ سر جھٹک کر اس کے لئے ناشتے کی ٹرے سیٹ کروانے لگیں، انہوں نے ٹرے وہاں بھجوائی اور خود تیمور کی طرف بڑھ آئیں مگر وہ حبا کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے وہ بھی پیچھے چلی آئیں، اندر کا منظر اس بار بھی مختلف نہ تھا، وہ بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے آگے ناشتے کی ٹرے پڑی تھی، تیمور کو دیکھ اس کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے، وہ بے پروائی اور سرد مہری جو صبح مرینہ کو نظر آئی تھی اب یکسر غائب ہو چکی تھی، تیمور نے آگے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ بلک اٹھی، اس کا چہرہ یوں بھیچ گیا تھا جیسے ویران اجڑی بنجر زمین، آنسو بڑی برق رفتاری سے اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے، تیمور بمشکل خود پہ قابو پاتے ہوئے اسے سنبھالنے لگے۔

"پاپا! ماما سے کہیں مجھے معاف کر دیں، ساری غلطیاں سارے گناہ تو میرے ہیں، کسی کا کوئی قصور نہیں، نہ آپ کا، نہ ماما کا اور نہ ہی اسید کا۔" وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو پونچھ رہی تھی۔

"ایسی باتیں نہ کرو، تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔" مرینہ نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگا لیا، وہ خود پہ ضبط نہیں کر سکی تھیں، وہ حبا تھی ان کی بیٹی جس کے لئے انہوں نے ہمیشہ اسید کو نظر انداز کیا تھا، وہ بھی انہیں ساری باتیں بھول گئیں۔

تیمور خاموشی سے باہر نکل گئے، احتساب کے دن شروع ہو رہے تھے باوجود اس کے کہ یہ دنیا بدلے کی جگہ نہیں ہے۔

☆☆☆

وقار بڑے زور دار طریقے سے ڈاکٹر سلطان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر پلیز مجھے بتائیں وہ کہاں ہے؟" وہ بے چینی سے پھٹ پڑنے کو تھے، ان کے چہرے سے شدید غم و پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

"ریلیکس وقار! خود کو سنبھالیں پلیز۔" ڈاکٹر سلطان نے انہیں شانوں سے تھام کر کرسی پہ بٹھایا اور پھر پانی گلاس میں ڈال کر انہیں تھمایا، وہ پانی پینے لگے۔

"مجھے بتائیں وہ کیسا ہے؟ وہ ٹھیک ہے نا؟ وہ آپ کے پاس کیسے پہنچا؟" وہ گلاس ایک طرف رکھ کر پھر سے پوچھنے لگے۔

"مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی حوصلہ افزاء بات نہیں بتا سکتا، ڈاکٹرز اسے ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"ٹریٹمنٹ؟ کیسا ٹریٹمنٹ؟ اسے کیا ہوا ہے؟" وہ حواس باختہ ہو گئے۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مگر کیوں، آپ کو کیسے معلوم نہیں، آپ تو اس کے معالج ہیں۔" وقار بلند آواز میں بولے۔

"مگر میں اسے ہینڈل نہیں کر رہا، میں نے آپ سے رابطہ کرنے کے لئے آفس آنا تھا جبھی نہیں کر سکا، مگر پھر بھی میں آپ کو اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے، بہت شدید چوٹیں آئی ہیں اسے۔" ڈاکٹر سلطان نے مختصر ترین الفاظ میں بتایا تھا، وقار کا رنگ فق ہو گیا۔

☆☆☆

حیدر تا حال نہیں لوٹا تھا، جس کی وجہ سے ستارا نے آج کے ڈیے ٹائمنگ کی ساری ملاقاتیں ملتوی کر دی تھیں اور اس وقت بیٹھی پریشان ہو رہی تھی پہلی بات تو یہ کہ وہ اجنبی جانے کس حال میں تھا جسے حیدر اسپتال لے کر گیا تھا اور دوسری پریشان کن بات "مصعب شاہ" تھا، گو کہ بات اتنی آگے نہیں بڑھی تھی، مگر ذہن میں جگہ بنا رہی تھی اور ذہن مسلسل اس کے متعلق سوچے جا رہا تھا، اس نے یہ تو ارادہ کیا ہوا تھا کہ اس نے ایک بار مصعب شاہ سے ضرور ملنا تھا، مگر اس وقت وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے مصعب سے کیا باتیں کرنا ہیں، ایک بات تو صاف تھی کہ وہ اسے نوفل کے بارے میں ضرور بتائے گی، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک دیا، نوفل کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا، وہ اسے کس رشتے سے متعارف کرواتی اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے نوفل یاد آ گیا۔

بو کر زمین دل پہ تیری آرزو کے بیج
بیٹھے ہیں کسی غریب زمیندار کی طرح

اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی، وہ عجیب شخص اب ایک گم گشتہ یاد بنتا جا رہا تھا اور ستارا اسے یاد کر کے نئے سرے سے نڈھال ہو گئی، ایک خفیہ راز کی مانند بن گیا تھا وہ جسے ستارا حل ہی نہ کر پائی اور وہ زندگی کی بھیڑ میں، انسانوں کے جنگل میں کھو گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے ابا کی باتوں سے کوئی اختلاف تھا مگر دل تھا کہ اب کسی کو ساتھی بنانے کا روادار ہی نہ تھا، اس نے سر جھٹک کر سامنے پڑی فائل کھول لی، مگر بہت دیر تک اسے کچھ سمجھ نہ آ سکا۔

"بزدل۔" اس نے زیر لب نفرت سے کہا اور انٹرکام اٹھا کر چائے کا کہنے لگی، چائے پینے کے بعد اس نے دو تین کلائنٹس نمٹائے اور اس وقت وہ لنچ کرنے کا سوچ رہی تھی جب اس نے حیدر کو اندر آتے دیکھا، وہ چونک گئی۔

"سر! آپ بہت دیر لگا دی آتے ہوئے، خیر بہت رہی نا، اب کیسا ہے وہ؟" وہ کھڑی ہو کر تیز تیز بولتی گئی۔

"ایڈمٹ کروا دیا ہے اسے، ٹریٹمنٹ جاری ہے۔" وہ مختصر سا کہہ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔

ستارا نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا، وہ بے حد ڈسٹرب اور افسردہ نظر آ رہا تھا، ستارا کو افسوس نے آن گھیرا، نرم دلی اور حساسیت تو حیدر پہ ختم تھی، اس نے ایک غیر متعلق شخص کی پریشانی اپنی سر پہ سوار کی تھی کہ شکل سے ظاہر تھا، وہ اس کے پیچھے نہیں گئی تھی بلکہ اس کے لئے چائے بھجوا دی، اسی وقت انٹرکام بج اٹھا۔

"چائے کے لئے شکریہ، مس ستارا، پلیز دس منٹ بعد تشریف لایئے گا، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" حیدر کہہ رہا تھا۔

"اوکے سر!" اس نے حامی بھری اور فون بند کر دیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ حیدر کے آفس میں موجود تھی۔

"میں آپ سے مصعب بھائی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" حیدر نے بات شروع کی، ستارا نے سنبھلتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا جس پر از حد سنجیدگی طاری تھی۔

"کیسی بات؟" وہ پوچھنے لگی۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کیونکہ آپ کے بابا نے بھی ممی سے یہی کہا ہے کہ فیصلہ مکمل طور پر آپ کا ہو گا، تو کیا بہتر نہ ہو گا کہ آپ اور بھائی مل بیٹھ کر کوئی فیصلہ لے لیں۔" وہ شائستگی و وقار سے کہنے لگا، ستارا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"ویسے تو یہاں اس آفس میں بھی بات ہو سکتی ہے مگر میرے خیال سے یہ ماحول کوئی اتنا ریزن ایبل نہیں ہے، اگر آپ کو سوٹ ایبل لگے تو کسی بھی جگہ، مائنڈ مت کیجئے گا، میری مراد کسی ڈیٹ سے نہیں میں تو صرف سجیشن دے رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے آپ سے اتفاق ہے۔" ستارا نے کہا۔

"شکریہ، ایسا ہی اتفاق کوئی اگر انڈو پاک کے مذاکرات میں ہوا ہوتا تو آپ یقین کریں اب تک ہمارے بہت سے تجارتی اور سفارتی مسائل حل ہو چکے ہوتے۔" وہ شگفتہ مزاجی سے بولا، ستارا مسکرا دی۔

اور اگلے دن جب اس نے آفس میں قدم رکھا تو مصعب شاہ وہاں پہلے سے تشریف فرما تھے، وہ حیران رہ گئی، بہترین تھری پیس میں وہ کوئی پرفیکٹ بزنس مین نظر آتا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام!" ستارا نے تیزی سے نظر پھیر کر بیگ ٹیبل پہ رکھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ شائستگی سے پوچھ رہا تھا۔

"فائن۔" اس نے اپنے آفس ٹیبل پہ پڑی اشیاء کو خواہ مخواہ دوبارہ درست کر کے رکھنا شروع کر دیا، وہ خود کو یہ باور کروانے میں ناکام تھی کہ اس شخص کی موجودگی سے متاثر نہیں تھی۔

"بات کرنا تھی آپ سے۔" وہ اس کی نظر اندازی کو محسوس کرتا بولا تھا۔

"مجھے بھی۔" ستارا نے بے ساختگی سے کہتے ہوئے اسے دیکھا، وہ ہولے سے مسکرا دیا اور اس پل اس کی سبز آنکھیں جگمگا اٹھی تھیں۔

"مگر یہاں نہیں، کسی پرسکون جگہ پر جہاں کوئی مداخلت نہ ہو۔" اس نے کہا۔

"یہ جگہ بھی پرسکون ہے۔" ستارا کو نا معلوم کیوں برا لگا تھا۔

"مگر میں کمفرٹیبل نہیں ہوں۔" مصعب نے آہستگی سے کہا، ستارا چپ سی ہو گئی۔

"میں سر سے بات کر لوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ضرور...... ویسے میں حیدر سے بات کر چکا ہوں۔" مصعب نے بتایا تو وہ سر ہلاتی ہوئے حیدر کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک پارک میں موجود تھے، جو کہ واکنگ ڈسٹینس پہ تھا، موسم میں خنکی تھی، ستارا نے گرم شال مضبوطی سے لپیٹ لی، وہ دونوں درختوں کے درمیان ٹہل رہے

تھے۔

''آپ میری اس جرأت پر مجھ سے خفا ہیں ستارا؟'' مصعب کا تجزیہ کمال کا تھا، ستارا نے چونک کر اسے دیکھا وہ بالکل سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔

''آپ آفس جا رہے تھے؟'' ستارا نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔

''جی۔'' وہ مختصراً بولا۔

''مجھے آپ کے اس اچانک فیصلے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔'' ستارا نے کہا، اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

''کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ میں آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا، ستارا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''آپ میرے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' وہ اس کے سوال پہ حیران ہوا۔

''سر نے آپ کو یہ تو بتایا ہو گا کہ میں ڈائیورسیڈ ہوں۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولی تھی۔

''مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''کیوں؟'' اس کا لہجہ تند ہوا۔

وہ اسے جواب دینے کی بجائے سامنے دیکھتا رہا، خاموشی کے اس طویل وقفے میں وہ دونوں خشک پتوں پہ چلتے رہے، پھر ستارا تھک کر ایک بینچ پر بیٹھ گئی، مصعب نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

''بہت سی باتوں کے جوابات ضروری نہیں ہوتے۔'' مصعب نے آہستگی سے کہا، خاموشی کا وقفہ ٹوٹ گیا۔

''مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

''اس سوال کا جواب میں آپ کو ابھی نہیں دے سکتا۔'' وہ شگفتہ مزاجی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''اس کا موقع یہ نہیں ہے، تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا آپ کو۔'' وہ اس بار مسکرایا، ستارا جو بڑے دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی یکدم خفیف سی ہو گئی۔

''ستارا! حقیقت یہ ہے کہ میں جو کچھ آپ کے لئے محسوس کرتا ہوں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں، مگر میں آپ کو اپنانا چاہتا ہوں، آپ کو ہم سفر بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا ماضی کیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اچھا۔'' ستارا کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

''کیا اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔'' اس نے مصعب کا رنگ بدلتے دیکھا، وہ دھواں دھواں چہرے سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

کیا ہے جو ایک شخص ہمارا نہیں ہوا
کار جنوں میں کس کا خسارہ نہیں ہوا
اک عمر دسترس میں ہماری رہا ہے وہ
افسوس اس کے دل پہ اجارہ نہیں ہوا

وہ بڑی دیر سے کھڑکی میں کھڑی تھی، اسے اسلام آباد آئے دو ماہ ہو چکے تھے، اب تو اسے تسلسل سے رونا بھی نہ آتا تھا، اتنا رو چکی تھی، اسید نے پلٹ کر کوئی خبر نہ لی تھی، بلکہ اس نے تو شاید شکر کیا تھا، وہ تو جیسے ہی اسے منحوس و مصیبت سمجھتا تھا۔

یہ احساس بہت جان لیوا تھا، اس نے بے

ربط سوچوں کے ساتھ خود کو بیڈ پہ گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں اور اسید ایک بار پھر اس کے پاس تھا وہ بے حد پریشان تھی۔

''تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ تم کہاں تھے؟'' وہ پچھلے چار گھنٹوں سے پاگلوں کی طرح اس کا انتظار کر رہی تھی، اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا، اسید نے تپتی ہوئی ایک نظر اس پہ ڈالی اور آگے بڑھنے لگا۔

''خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ۔'' وہ پھر بے بولی تھی، اسید نے ایک لمحے کے لئے اپنے اندر جمع شدہ غصے اور نفرت کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس پہ جھپٹا۔

''مجھ سے سوال کرتی ہو، ہوتی کون ہو بولو؟ کیا؟'' ایک زبردست دھکے سے وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی اور پھر نیچے گر گئی۔

''میں تمہاری بیوی ہوں، سنا تم نے، حق رکھتی ہوں تم سے پوچھنے کا۔'' وہ بلند آواز میں چلائی تھی، اسید کی آنکھوں میں یک بیک خون اتر آیا۔

''بیوی؟ حق؟'' وہ استہزائیہ ہنسا اور پھر گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے، وہ اذیت سے بلبلا اٹھی۔

''میں تمہارے جیسی عورت کو باندی بھی نہ بناؤں اور تم بیوی بننے چلی ہو اور حق؟'' اس نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے اس کے بالوں کو کھینچا وہ چیخ پڑی، اسید نے اس کے منہ پہ تھوک دیا۔

''یہ حق ہے تمہارا۔'' وہ تذلیل و توہین سے پتھرا سی گئی اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی جوت بجھ گئی تھی۔

''مجھ سے سوال کرنے کی جرأت کیسے ہوئی تمہیں، اپنی اوقات یاد رکھو۔'' اس نے اس بار الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا تھا اسے، حبا نے یکلخت بہت عجیب سی حرکت کی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اسید کا کالر جکڑ لیا، اس کے دونوں ہاتھ لرز رہے تھے۔

''مجھے اپنی اوقات یاد ہے، تم ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لو۔'' وہ بول رہی تھی اور آنسو بے اختیار گالوں پہ بہہ رہے تھے۔

''کیا تم وہ اسید مصطفیٰ ہو جو عالمگیر انسانیت کی بات کرتا تھا، محبت کا علمبردار تھا اور اخلاص و ایثار کا پیکر تھا، میں ذلیل ہوں، گھٹیا ہوں، بے غیرت ہوں، میں منافق ہوں، ہاں ہوں مگر تم کیا ہو؟ کبھی یہ سوچا ہے۔''

اسید نظریں اس پہ جمائے اس کی باتیں سن رہا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات بہت عجیب تھے، یوں جیسے کوئی اجنبی سرزمینوں پہ جا نکلے یا پھر گزری صدیوں کے قصے سنے تو حیرت زدہ رہ جائے، پھر اس کے تاثرات بدل گئے، اس کے چہرے پہ ایک بے روح درندے کی سی تندی چھا گئی، اس نے اپنے گریبان پہ رکھے اس کے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ سے جکڑا اور جھٹکے سے پیچھے ہٹا دیا، شدید ترین نفرت کی لہر نے اس کے ذہن کو مفلوج کر دیا تھا اس نے حبا کو دیکھا، اس حبا کو جس کے پیچھے اس نے اپنی زندگی اجاڑ ڈالی تھی، پھر اس کے بھیگے چہرے کو اور پھر اس کے لرزتے وجود کو اور پھر اس پہ پل پڑا، اس نے حبا کے چہرے پہ روز سے ہاتھ مارا، اس کے ہاتھ کی ضرب حبا کے ناک پہ لگی اور خون بہنے لگا، وہ کرب سے چلائی، وہ بے رحمی سے اسے مارنے لگا۔

''مجھے کچھ یاد نہیں، نہیں یاد کرنا چاہتا میں، اگر تم نے دوبارہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا حشر کر دوں گا۔''

وہ دھاڑ رہا تھا۔

وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر خود کو بچانے کی کوشش کرتی پیچھے کو کھسک رہی تھی، وہ ہاتھ اس پہ اٹھ رہے تھے جن کی چاہ میں اس نے سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا، وہ پیچھے ہوتی ہوئی دیوار سے لگ گئی۔

''بس کرو، خدا کے لئے بس کرو، مجھے مت مارو۔'' وہ بلک رہی تھی مگر وہ خدا نہیں تھا جو معاف کر دیتا، وہ تو بس ایک انسان تھا، کم ظرف انسان جو بدلہ لینے کی تاک میں رہتا ہے۔

''کیوں معاف کر دوں؟ کیسے معاف کر دوں؟ تم نے کیا تھا؟ تمہارے باپ نے کیا تھا؟'' وہ بے قابو ہو رہا تھا۔

''میرا ایک رشتہ تھا وہ بھی تم نے چھین لیا، میری ماں، میرا یقین کھو دیا میں نے، اب بلاؤ اپنے ماں باپ کو، ان سے کہو تم کو بچائیں بلاؤ، میں دیکھتا ہوں یہاں تمہیں کون بچانے آتا ہے؟ کون روکتا ہے میرے ہاتھ؟'' وہ نفرت سے زہریلا ہو رہا تھا، حبا کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

''ماما! پاپا......!'' وہ رو رہی تھی، اذیت سے نڈھال ہو رہی تھی مگر کوئی اسے بچانے نہیں آیا تھا، پھر اس نے بھی خود کو بچانے کی جدوجہد ترک کر کے مکمل طور پر مزاحمت چھوڑ دی۔

''اللہ...... رحم۔'' اس کے ہاتھ کٹے ہوئے ٹہنوں کی مانند نیچے گر گئے، اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''اگر تم نے دوبارہ بکواس کرنے کی کوشش کی نا تو زبان کھینچ لوں گا۔'' وہ وارننگ دے رہا تھا، وہ سسکتی رہی۔

''تم خدا نہیں ہو؟'' وہ بمشکل بول پائی تھی۔

''ٹھیک کہا تم نے۔'' وہ وحشیانہ انداز میں ہنسا۔

''میں خدا نہیں ہوں مگر تمہارے اختیارات میرے پاس ہیں، تم مجبور ہو، بے بس اور بے چارہ بھی۔'' اس نے رعونت سے کہتے ہوئے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری، وہ درد سے چلاتی دہری سی ہو گئی، لوگوں نے عیسیٰ کو صلیب پہ چڑھا دیا تھا وہ تو کسی قطار شمار میں ہی نہ تھی، اس کے آنسو، آہیں، التجائیں سب بیکار تھیں۔

''ماما، پاپا! کہاں ہیں آپ، میرے پاس آئیں مجھے بتائیں میں کیا کروں، مجھے بچائیں، پاپا مجھے بچا لیں پاپا دیکھیں میرا خون بہہ رہا ہے۔'' وہ اپنے خون آلود چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وحشت زدہ ہو کر چلا رہی تھی، اس کی سانس پھول رہی تھی، وہ بے حد خوفزدہ تھی، اس کی تسلسل سے گونجنے والی چیخوں نے ماحول کو یکدم بدل دیا تھا، دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا اور مرینہ خانم، تیمور احمد کے ساتھ اندر آ گئیں۔

تیمور احمد کا دم تو ویسے ہی آج کل حلق میں اٹکا رہتا تھا، اب جو دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو حبا کی حالت بے حد خراب تھی، غالباً اس نے کوئی خوفناک، ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھے اور اسے ساتھ لگا لیا، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ خواب سچ تھا۔

''حبا! کیا ہوا بیٹا؟ دیکھو میں تمہارے پاس ہوں، کوئی برا خواب دیکھا ہے؟'' وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

''پاپا! اس نے مجھے بہت مارا ہے، دیکھیں میرے چہرے سے خون بہہ رہا ہے، اس سے کہیں مجھے معاف کر دے مجھے مت مارے اور کتنی سزا دے گا وہ مجھے، میں مر جاؤں گی پاپا،

اسے کہیں مجھ پہ ترس کھائے، مجھ پہ رحم کرے، بس کرے مجھے اس سے بچالیں، مجھے بچالیں۔''
وہ ان سے لپٹ کر چیخ رہی تھی، مرینہ ساکت سی کھڑی تھیں، حبا کے الفاظ نا قابل یقین تھے۔
''میں آپ کے پاس ہوں حبا میری بچی، کسی نے نہیں مارا آپ کو، اسید یہاں نہیں ہے، دیکھو میں آپ کے پاس ہوں۔'' وہ اسے تسلی دے رہے تھے مگر حبا کی وحشت کسی طور کم نہ ہوئی تھی۔
''وہ یہیں ہے، مجھے پتا ہے وہ ادھر ہی ہے وہ آجائے گا، وہ آپ کو بھی مارے گا، وہ کسی سے نہیں ڈرتا، وہ اللہ سے بھی نہیں ڈرتا، وہ سب کو مار دے گا وہ سب کچھ ختم کر دے گا، پاپا آپ چھپ جائیں، جائیں چلے جائیں، میں اس سے کہوں گی وہ مجھے مار لے، آپ کو کچھ نہ کہے، آپ جائیں یہاں سے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی، مرینہ یوں اسے دیکھ رہی تھیں جیسے آج پہلی بار اس سے متعارف ہوئی ہوں، وہ بڑی عجیب باتیں کر رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی کہ اسید نے اسے مارا، ناممکن یہ بھلا کیسے ہوسکتا تھا، تو کیا تیمور احمد ٹھیک کہتے تھے، ان کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔
''کوئی نہیں یہاں پر، میں کہہ رہا ہوں نا؟'' تیمور احمد اسے جھنجھوڑ کر بولے تھے، مگر حبا اسی طرح روتی جارہی تھی۔
''وہ یہیں ہے، آپ جھوٹ بولتے ہیں مجھے پتا ہے وہ آجائے گا، وہ کہتا ہے میں بدکرادر بدصورت اور......'' وہ ہچکیاں لے رہی تھی اور اس کا سارا جسم لرز رہا تھا اور حبا تیمور پاگل ہوگئی۔
جن ہاتھوں نے کبھی اسے کمپلیکسز کی دلدل سے باہر کھینچا تھا انہیں ہاتھوں نے اسے ذلت کی کھائی میں دھکا دے دیا تھا۔

☆☆☆

''وقار! مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں ہے، ہم نے شاہ بخت کا ٹریٹمنٹ کردیا ہے، مگر اس کی حالت......'' ڈاکٹر سلطان کی بات ادھوری رہ گئی۔
''اسے ہوا کیا ہے؟'' وقار نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔
''دو Ribs ڈیمج ہوئی ہیں، دایاں پیر شدید زخمی تھا، چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ فریکچر ہے اور چھوٹے موٹے ان گنت زخم ہیں مگر چہرے کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی بائیں آنکھ شدید متاثر ہوئی ہے ہو سکتا ہے اس سے اس کی آئی سائیٹ پہ بھی اثر پڑا ہو مگر اس کا صحیح اندازہ زخم بھرنے کے بعد مکمل طبی معائنے سے ہی لگایا جاسکے گا، باقی اس بات کو یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسے بہت پروفیشنل طریقے سے مارا گیا ہے ورنہ کم ازکم چہرے کو نشانہ خاص طور پر نہیں بنایا جاسکتا۔'' ڈاکٹر سلطان خاموش ہو گئے، وقار خالی نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔
''کوئی اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیسے کرسکتا ہے ڈاکٹر، جب کہ ہماری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔'' وہ ذہنی طور پر مکمل خالی ہو چکے تھے، انہیں بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسے ری ایکٹ کریں، شدید اعصابی دھچکے نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل معذور کر دیا تھا، شش و پنج کے اس لمحے میں انہوں نے بے اختیار سوچا کہ کہیں یہ علینہ کو تھپڑ مارنے اور اس کے بعد طارق مغل سے اپنی ذلت آمیز توہین کا ردعمل تو نہیں تھا اور اس سوچ کے ذہن میں آنے کے بعد چند لمحوں کو تک وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ رہے تھے، مگر پھر انہوں نے سر جھٹک دیا، ایسا

ممکن ہی نہ تھا، شاہ بخت خود کو کیسے تکلیف دے سکتا تھا؟ اور پھر بھلا وہ خود کیسے؟

وہ پتھرائے ہوئے سے وہاں سے اٹھے تھے، ڈاکٹرز نے انہیں فی الحال شاہ بخت سے ملنے سے منع کر دیا تھا، وہ کوری ڈور میں تھے جب انہیں ''مغل ہاؤس'' انفارم کرنے کا خیال آیا، انہوں نے تیزی سے سیل فون نکالا اور گھر کا نمبر ڈائل کرنا چاہا مگر اسی وقت کسی نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا، وہ بے ساختہ مڑے اور اپنے سامنے ڈاکٹر حیدر عباس شاہ کو پایا۔

''ارے حیدر! آپ یہاں؟'' وہ حیران ہوئے۔

''جی کیسے ہیں آپ؟'' حیدر ان سے مصافحہ کرنے لگا۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ؟''

''میں ہی شاہ بخت کو یہاں لے کر آیا ہوں۔'' حیدر نے کہا، وقار چونک گئے۔

''آپ؟ کیا مطلب وہ آپ کو کدھر ملا اور یہ کیا کوئی ایکسیڈنٹ تھا؟ مگر ڈاکٹرز تو کہہ رہے تھے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے تو پھر...... یہ کیا؟'' وقار اضطراب میں بولتے گئے۔

''میں خود نہیں جانتا، مجھے وہ سڑک پر اپنی گاڑی میں پڑا ہوا ملا تھا اور تب تک مجھے خود کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ یہ شاہ بخت بھی ہو سکتا ہے، میں اسے یہاں لے آیا یہ اس کا والٹ اور سیل فون۔'' حیدر نے مختصر الفاظ میں بتایا، دونوں چیزیں وقار کے ہاتھ میں تھمائیں اور واپسی کے لئے پر تولے، وقار نے فوراً اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

''پلیز حیدر! رکیں بات سنیں، مجھے آپ سے کچھ جاننا ہے۔'' وقار نے کہا۔

''کیا جاننا ہے آپ کو؟'' حیدر کا لہجہ ناقابل فہم سا تھا۔

''وہ سب جو آپ جانتے ہیں، تفصیلات کے ساتھ۔'' وقار نے فوراً کہا۔

''تفصیلات صرف وہ ہی ہیں جو میں آپ کو بتا چکا ہوں، میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا، چلتا ہوں، میں اپنا کلینک اور بہت اہم ملاقاتیں چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔'' حیدر کے انداز میں محسوس کی جانے والی سرد مہری تھی، وہ وقار کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر ہی آگے بڑھ گیا، وقار چند لمحے اسی طرح کھڑے رہے پھر سر جھٹک کر نظر ہاتھ میں تھامے والٹ اور موبائل پر مرکوز کر دی، والٹ کی تلاشی خاصی تسلی بخش رہی تھی کیونکہ اس میں سب کچھ موجود تھا جبکہ موبائل کو چیک کرتے ہی اس کی اسکرین پہ بیٹری لو کا سگنل آ گیا تھا، انہوں نے اسے تو کیا دیکھنا تھا نظر تو وہ آ گیا جو بہت عجیب تھا، اسکرین پہ پڑی دراڑیں اور ان کے پیچھے جھانکتا چہرہ، وہ نا چاہتے ہوئے بھی حیران رہ گئے تھے، وہ چہرہ علینہ کا تھا۔

اس قدر شدید پریشانی کے عالم میں بھی ان کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی، تو آخر ان کا اندازہ درست نکلا تھا، شاہ بخت کے سیل فون میں علینہ کی تصویر کا مقصد کیا ہو سکتا تھا یہ کوئی مبہم بات نہ تھی جس کے معنی ڈھونڈنے میں انہیں وقت لگتا، سر جھٹک کر انہوں نے دونوں چیزیں پاکٹس میں ٹھونس کر آگے بڑھ گئے، شاہ بخت کو ہوش آنے میں دیر تھی اور وہ اس کی موجودہ کنڈیشن کے حوالے سے ڈاکٹر سلطان سے کچھ ڈسکشن کرنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

''کیوں چونک کیوں گئے مصعب شاہ؟'' ستارا نے بڑی طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا، چند لمحوں کے لئے مصعب کو خود کو سنبھالنا ناممکن لگا تھا مگر پھر اس کی مضبوط قوت ارادی کام آئی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات یک بیک کنٹرول میں آئے تھے، وہ جب بولا تو اس کا لہجہ کمپوزڈ تھا۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کون ہے؟'' مصعب نے آہستگی سے کہا۔

''نہیں اور ویسے بھی یہ بھی آپ کو کیوں بتاؤں؟'' ستارا کے انداز میں تیکھا پن در آیا، مصعب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''ٹھیک تب پھر آپ کی شادی ان سے کیوں نہ ہو سکی؟'' مصعب نے دوسرا سوال کیا تھا۔

''یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔'' ستارا نے دو ٹوک کہا۔

''اور میں آپ کے ذاتی مسائل میں شامل ہونا چاہتا ہوں ستارا!'' مصعب نے سرگوشی میں کہا، ستارا کا رنگ بدل گیا، وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز...... شٹ اپ۔'' اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

''او کے مگر اس شادی سے انکار کی یہ وجہ یقیناً قابل قبول نہیں ہے۔'' مصعب کے انداز میں قطعیت تھی، وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''مگر میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔'' ستارا نے تیزی سے کہا۔

''کون سی وجہ؟ کیا یہ کہ آپ کسی اور سے محبت کرتی ہیں مگر میرے لئے یہ وجہ کافی ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔'' مصعب کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ قطعیت بھرا تھا یوں جیسے وہ ستارا کے بیان کو بالکل غیر اہم سمجھتا ہو، اس طرح کھلے اظہار اور بلند آواز میں کہے گئے الفاظ نے ستارا کا رنگ سرخ کر دیا تھا۔

''مگر میرے لئے یہ اہم نہیں ہے۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔

مصعب نے ہونٹ بھینچ کر اپنے اندر امڈتے ہوئے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی تھی، مگر پھر جیسے پھٹ سا گیا۔

''تو آپ کے لئے کون اہم ہے وہ شخص جو آپ کا ہو ہی نہ سکا، آپ کا ایکس ہزبینڈ؟'' مصعب کا لہجہ اکساتا ہوا تھا۔

''ڈونٹ ٹیل می، مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں آپ، یہ بتا کر کہ آپ ابھی تک، کہ آپ ابھی تک اس......''

''غلط...... بالکل غلط۔'' ستارا نے بے حد غصے میں اس کی بات کاٹی تھی۔

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر، وہ اس قابل ہوتا تو میں یوں ذلیل نہ ہوتی، میری بدقسمتی تو یہ ہے کہ میں اس شخص کی محبت میں مبتلا ہوں جسے میں نے دیکھا تک نہیں۔'' ستارا کا لہجہ بے بسی سے پر تھا، اس نے ایک دم فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسے نوفل صدیق کے بارے میں بتا دے شاید یہی بہتر ہو اور وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

''کیا مطلب؟'' مصعب حیران رہ گیا۔

''ہاں یہی سچ ہے، میں نے اسے دیکھا نہیں مگر میں اس سے محبت کرتی ہوں، یہی سچ ہے کہ میں نوفل صدیق سے محبت کرتی ہوں، اس بات کا احساس کمتری تھا کہ وہ نیگرو ہے اور وہ کبھی میرے سامنے نہیں آیا، مگر کیا یہ بات محبت کے لئے کافی نہیں کہ میں نے اس کا دل دیکھا جو سونے جیسا تھا، ہمارے درمیان صرف آواز کا رشتہ تھا، شاید آپ کو یہ بات بے وقوفانہ لگے مگر یہی سچ ہے، اس کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں، اس نے میری جان بچائی، اس شخص سے جو مجھے ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتا تھا، مگر

وہ میرے سامنے نہیں آیا۔" ستارا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر روتی چلی گئی، معصب ایک لمحے کے لئے کچھ بول نہ سکا۔

"اوہ...... آئم سوری...... میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔" وہ بے حد افسردہ ہوا تھا۔

"اٹس اوکے۔" ستارا نے گال پونچھے۔

"ٹھیک ہے میں مانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر اس کے باوجود بھی آپ اپنے ساتھ غلط کر رہی ہیں، جس کو کبھی آپ نے دیکھا نہیں جو پتا نہیں کہاں ہے اور ہے بھی یا نہیں، کون جانتا ہے؟" معصب کا انداز کڑا تھا۔

"پلیز۔" ستارا نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

"تو اب آپ کیا چاہتی ہیں؟ میں اپنا پرپوزل واپس لے لوں؟" معصب نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ایکسکیوزمی، یہاں کیا لکھا ہے؟" معصب کا اشتعال دوبارہ لوٹ آیا تھا اس نے اپنے ماتھے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ لکھا ہے کہ میں بے وقوف ہوں، یا پاگل نظر آتا ہوں آپ کو؟ مجھے یہ باور کروانا چاہتی ہیں آپ کہ آپ مجھ سے اس لئے شادی نہیں کر سکتیں کیونکہ آپ کسی اور کے ساتھ انوالو ہیں، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا ستارا ماہم، میرے لئے یہ اہم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟" وہ بے حد خودغرض ہو گیا تھا۔

"لیکن آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے جو آپ سے محبت ہی نہیں کرتا۔" وہ بلبلا کر بولی تھی۔

"بالکل گزاری جا سکتی ہے، میں ایک لبرل مرد ہوں، کوئی جاہل اور کم ظرف آدمی نہیں ہوں۔" وہ اس بار طنزیہ بولا تھا۔

"میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں آپ جیسے مردوں کی لبرٹی۔" وہ دوبدو بولی۔

"بہرحال میں اس پرپوزل کو واپس نہیں لے رہا۔" معصب کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"آپ کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"اطلاع کا شکریہ، چلتا ہوں اور امید ہے اب مزید کچھ نیا نہیں ہو گا۔" وہ بہت پرسکون انداز میں کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا، ہٹ دھرمی کی انتہا تھی، ستارا سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

لٹا کر ہر چیز منزل عشق کی راہ میں
ہم ہنس پڑے ہیں آج خود کو برباد دیکھ کر

وہ آئینے کے آگے کھڑی بال بنا رہی تھی، اس نے کندھوں سے نیچے آتے بال درمیان سے مانگ نکال کر اطراف میں ڈال دیئے، چند لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی پھر اس نے کچھ سوچ کر فاؤنڈیشن اٹھا لیا، وہ ہاتھوں کی مدد سے اس نے اپنے سارے چہرے پہ فاؤنڈیشن پھیلایا اور پھر چند لمحے رک کر لپ اسٹک اٹھا لی، یہ ایک شوخ سرخ رنگ کا شیڈ تھا، اس نے لپ اسٹک ہونٹوں پہ پھیری اور پھر کچھ اور ڈھونڈنے لگی، اس بار اس نے کاجل منتخب کیا تھا، اس نے اسے آنکھوں میں لگایا اور پھر جیسے تیاری مکمل سمجھ کر ہاتھ چھوڑ کر سیدھی ہو گئی اور آئینے میں غور سے اپنا جائزہ لیا، اناڑی پن سے پھیلایا گیا فاؤنڈیشن اس کے چہرے کے گہرے حلقوں اور سانولی رنگت کو چھپانے میں ناکام ہو گیا تھا، یوں نظر آتا تھا کہ ڈھیر ساری سفیدی پہ سرخ رنگ لگا دیا گیا ہو۔

"بدصورت۔" اس کے اندر بازگشت ہوئی تھی۔

اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے ہونٹ رگڑ ڈالے، سرخ شیڈ سارے چہرے پہ پھیل گیا، اس نے غور سے ایک بار پھر اپنے سارے وجود کا جائزہ لیا اور پھر اسے اپنے ہیبت بدلتے وجود سے خوف محسوس ہوا تھا، بے پناہ خوف، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی، کیا ہونے والا تھا؟ ایک اور وجود اس دنیا میں آنے والا تھا، اس جیسا......؟ وہ واش بیسن کی طرف بڑھ گئی اوک بھر بھر پانی چہرے پہ ڈالتے ہوئے اس نے وہ ساری دعائیں یاد کرنے کی کوشش کی جو اس ساری سچویشن میں وہ مانگتی رہی تھی۔

اس نے اللہ سے کہا تھا اسے بیٹا چاہیے، بالکل اسید جیسا خوبصورت، اس نے کہا تھا کہ وہ جانتی ہے اللہ مجھ سے محبت نہیں کرتا مگر وہ اسید سے تو پیار کرتا ہے اور اسید کو بھی تو بیٹے کی خواہش ہی ہو گی اور وہ جانتی ہے اللہ اسید کی خواہش ضرور پوری کرے گا اور پتا نہیں کیوں مگر اسے یقین تھا کہ اس کی یہ دعا ضرور پوری ہو گی آخر یہ اسید کا معاملہ تھا، اس نے چہرہ پونچھا اور باہر آ گئی۔

رات سے اسد عمر آیا ہوا تھا، وہ لان کی طرف آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا وہ ہلکی سی خنکی محسوس کر کے وہاں بیٹھ گئی، کچھ دیر بعد اس نے قدموں کی چاپ سنی، وہ اسد تھا، وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

"حبا! پھپھو تمہارے حوالے سے بہت پریشان ہیں۔" وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا، حبا نے اس کے چہرے کو دیکھا اور اسے شبہ ہوا کہ اس میں اسید کی مشابہت تھی، اس کو بے ساختہ خوف محسوس ہوا، وہ وہاں سے چلے جانا چاہتی تھی مگر، اس نے دوبارہ اسد کا چہرہ نہیں دیکھا۔

"کیوں پریشان ہیں؟" اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔

"تم جانتی ہو بہت اچھی طرح، اپنی حالت دیکھو اور روٹین دیکھو، سارا دن تم کمرے میں بند رہتی ہو اور ساری رات جاگتی رہتی ہو۔" اسد پریشانی سے کہہ رہا تھا حبا کا چہرہ بالکل تاثرات سے عاری رہا، اسے اس بات پہ حیرت تھی کہ اسد کو اس کی فکر تھی؟ کیوں تھی بھلا؟ وہ اس کا کیا لگتا تھا؟

"رات کو نیند نہیں آتی۔" حبا نے کہا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"ڈر لگتا ہے۔" وہ بدستور سامنے دیکھ رہی تھی۔

"کس چیز کا ڈر؟"

"آدم زاد کا ڈر۔"

"تم پاگل ہو۔" اسد چلا اٹھا تھا۔

"ہاں۔"

"کس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟"

"جو آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا۔"

"حبا! ایک بات پوچھوں؟ سچ بتانا۔"

"پوچھ لیں۔"

"تمہارا اور اسید کا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"جھگڑا؟ ہماری صلح ہی کب تھی؟"

"کیا مطلب، مجھے مت بتاؤ، کیا میں نہیں جانتا تم دونوں میں کتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور کیسے وہ تمہاری فکر میں مرا جاتا تھا۔"

"ہر انسان اپنی بقا کے لئے دوسرے کو مار سکتا ہے، اسی وجہ سے تو دفاع میں کیا جانے والا قتل بھی معاف ہو جاتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" اسد کے اندر جیسے کوئی گھنٹی سی بجی تھی۔

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ لاہور میں تم دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا؟" اسد نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں جاننا چاہتے ہیں؟" پہلی بار اس کی آواز مرتعش ہوئی تھی۔

"حق رکھتا ہوں جاننے کا، کیوں کہا تم نے کہ اس نے تمہیں مار دیا ہے؟ جانتی ہو تم اسید مصطفیٰ کون ہے؟ کتنا کچھ کیا ہے اس نے تمہارے لئے؟ کتنا سیکری فائز کیا اس نے تمہارے لئے، جانتی ہو تم؟" اسد بلند آواز میں بولا تھا، حبا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"میں جانتی ہوں مجھے پتا ہے اس نے کتنی قربانیاں دی ہیں، جیسے بعض لوگ قربانیاں دینے والے ہوتے ہیں اور بعض ان کا گوشت کھانے والے، میرا شمار بھی دوسری قسم میں ہوتا ہے، مجھے پتا ہے۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"میں نے ساری زندگی بس اس کی قربانیوں کا گوشت کھایا ہے، مگر آپ یہ سوچ کر خود کو ہلکان مت کریں کہ میں نے تاوان نہیں بھرا، قصاص و دیت کے سارے اصول پورے کیے ہیں، کبھی ہاتھ نہیں روکا اس کا، ایک بار بھی نہیں۔" اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور لب لرز رہے تھے۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" اسد ششدر رہ گیا تھا۔

"یہی جاننا چاہتے تھے نا آپ کہ اس نے مجھے کیسے مار دیا، میں آپ کو اس کا جواب ضرور دوں گی پہلے آپ مجھے بتائیں کیا آپ نے کبھی کال کوٹھڑی میں ایک دن بھی گزارا ہے جہاں کوئی روزن کوئی کھڑکی نہ ہو، کیا آپ نے کبھی بھوک کاٹی ہے جب آپ تنہا ہوں اور دو دن سے آپ نے کچھ نہ کھایا ہو؟ کیا کبھی کسی نے آپ کو گالی دی ہے، کیا کبھی آپ نے درد کی اس انتہا کو محسوس کیا ہے جس کے بعد صرف مرنے کی خواہش باقی رہ جاتی ہے؟" وہ اب براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اسد کو اس کی آنکھوں سے خوف میں محسوس ہوا وہ کسی مردہ شخص کی طرح تھیں۔

"یقیناً نہیں کیا ہوگا، کر بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ دس فٹ نیچی چھت والے اس سیلن زدہ کمرے میں چار ماہ میں نے گزارے ہیں، آپ نے نہیں کیا آپ اس ذلت کی انتہا کو محسوس کر سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں کیونکہ آپ کو کبھی گالی نہیں دی گئی میں نے محسوس کیا تھا کیونکہ اس نے مجھے گالیاں دی تھیں، غلیظ گالیاں جن کو سن کر دل چاہتا تھا کاش کوئی پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں ڈال دے کیا کبھی آپ نے اس اذیت و درد کو محسوس کیا ہے جب آپ پر ہاتھ اٹھایا گیا ہو، یقیناً نہیں کیا گیا ہوگا، میں نے کیا ہے، کیا کبھی آپ کو لیدر بیلٹ سے مارا گیا؟ کیا کبھی کسی نے آپ کے جسم کو سگریٹ سے داغا؟ کیا کبھی کسی نے آپ پر تھوکا نہیں، کیونکہ یہ سب میرے ساتھ ہوا ہے، اس لئے آپ میری ذہنی سطح تک آ کر سوچ ہی نہیں سکتے اور کیا جاننا ہے آپ کو؟" وہ منتشر سانسوں کے ساتھ بولی تھی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو، بکواس کرتی ہو، اسید ایسا نہیں کر سکتا۔" اسد چیخا تھا بے یقینی اس کے چہرے پہ ثبت تھی۔

"ماما کہتی ہیں تم بال کیوں نہیں باندھتیں، میں انہیں یہ نہیں دکھانا چاہتی۔" حبا نے کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ دیئے، اس کی نظر اس کی گردن پہ پڑی اور پھسلتی چلی گئی، وہاں مندمل ہو جانے والے زخموں کے نشانات تھے، اسد نے تیزی سے نظر پھیر لی وہ جیسے گونگا ہو گیا تھا، وہ کچھ بول نہیں سکا۔

"آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مجھے نیند کیوں نہیں آتی، مجھے ڈر لگتا ہے، وہ آسیب بن کر چمٹ گیا ہے مجھے، اس کا سایہ میرے پیچھے ہے اور پریشان مت ہوں میں بالکل خود کو اسی قابل سمجھتی ہوں، میں گناہ گار ہوں اس کی اور مجھے سزا ملنی چاہیے، میں اسے ڈیزرو کرتی ہوں۔" وہ خود اذیتی کی انتہا پہ تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا، وہ اتنا کیسے گر سکتا ہے؟ وہ یہ سب کیسے کر سکتا ہے، میں کیا کروں؟ اور تم نے اسے روکا نہیں، کیوں لگتا ہے تمہیں کہ تم یہ ڈیزرو کرتی ہو؟" وہ غصے میں آ گیا۔

"کیونکہ میں بدصورت ہوں۔" وہ جیسے اعتراف کر رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ جھلا گیا۔

"مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں، میں اس کی خود ذمہ دار ہوں۔" وہ بے حسی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی، اسد بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا اور اسی شام اس نے مرینہ سے کہا تھا۔

"پھپھو! مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ نے حبا کے معاملے کو سیریس نہیں لیا، وہ اس قدر مینٹلی ڈسٹرب ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں، آپ کو علم ہی نہیں کہ وہ کس اذیت سے گزر رہی ہے؟ مجھے بتاتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے وہ قریب قریب نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے، اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ اپنے لئے مزید مسائل پیدا کر لے گی اور اوپر سے اس کی کنڈیشن بھی......" اسد لب بھینچ کر خاموش ہو گیا، مرینہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑیں۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا میں کروں تو کیا، ایسا لگتا ہے ہر رستہ بند ہو گیا ہے، اس مشکل سے نکلنے کا کوئی حل سجھائی نہیں دیتا، اسے خود کوئی احساس نہیں، سارا دن پتا نہیں کون سی نمازیں پڑھتی رہتی ہے جب جاؤں جائے نماز پہ بیٹھی ہوتی ہے، اس کے باپ کا حال بھی بس عجیب ہی ہے، سارا دن تو تیمور گھر نہیں ہوتے، رات کو آتے ہیں تو حبا کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔"

"آپ نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کیا باتیں کرتے ہیں؟" اسد نے حیرت سے کہا۔

"کی تھی ایک دن میں بھی ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ انہوں نے مجھے وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ وہ میرے ساتھ حبا کی کوئی بات ڈسکس نہیں کرنا چاہتے، اس کے بعد بہر حال مجھ میں اتنی شرم تو تھی کہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کروں اور ویسے بھی اسد جب سے حبا اس حال میں لاہور سے اسلام آباد واپس لوٹی ہے مجھے پتا نہیں کیوں یہ یقین سا ہو چلا ہے کہ میرا دانہ پانی اس گھر سے اٹھ چکا ہے، کوئی دن جاتا ہے اور تیمور مجھے اس گھر سے نکال باہر کریں گے۔" وہ تلخی سے کہتی ہوئی رونے لگیں۔

"پھپھو! کیا ہو گیا ہے آپ کو، ایسا کچھ نہیں ہے وہم ہے آپ کا، آپ انکل سے دوستانہ ماحول میں بات کریں، ایسے تو نہیں چلے گا، انہیں آپ کا نہیں تو حبا کا خیال تو کرنا پڑے گا۔" اسد غصیلے انداز میں بولا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا ایسا کچھ ہے اور اسد سچ تو یہ ہے کہ اس بیٹی کے پیچھے میں نے اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو لئے ہیں، اب تو بالکل خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔" وہ بے حد مضطرب تھیں۔

اسد جواباً کچھ بھی نہ کہہ سکا، معاملات خطرناک حد تک الجھے ہوئے تھے حبا اپنی بدترین ذہنی کیفیت کے ساتھ یہاں تھی مگر اسید مصطفیٰ

کہاں تھا؟ وہ ابھی تک گم شد تھا۔

☆☆☆

اس کی ذات کے اندر سناٹے اتر آئے تھے، یوں جیسے کس نے یکلخت قوت گویائی سے محروم کر دیا ہو اور اب اسے دنیا یوں لگ رہی تھی جیسے پیر کے نیچے آ جانے والا پتھر جسے کوئی بھی ٹھوکر مار کر دور اڑا دے۔

اس کی ذات یوں مسخ شدہ نظر آتی تھی جیسے دھتکاری ہوئی عذاب شدہ قوم کی اجڑی ہوئی بد حال بستی، سب کچھ گیا تھا بلکہ نہیں سب کچھ ختم ہو گیا تھا، اس کی باوقار اور پر غرور چال میں عجیب سی شکستگی آ گئی تھی۔

اس کا خوبصورت چہرہ اور اس پر بے شمار زخموں کے نشان، اس کی سحر انگیز آنکھیں جو راہ چلتوں کو رستہ بھلا دینے پہ قادر تھیں ان کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی، دوبار آپریٹ ہونے کے باوجود ان پہ گلاسز کا بدنما دھبہ لگ چکا تھا۔

اسے ہاسپٹل سے گھر آئے تین ہفتے ہو چکے تھے، آج پہلی بار وہ اپنے کمرے سے باہر آیا تھا لاؤنج کے صوفہ پہ بیٹھتے ہوئے اسے یاد آیا کہ وہ اپنے گلاسز کمرے میں ہی بھول آیا تھا، اسے عادت ہی نہ ہو پا رہی تھی، اس نے سگریٹ سلگایا اور ٹی وی آن کر لیا، اسے یاد آیا آج جمعہ تھا، یقیناً سب گھر ہی تھے۔

اس نے چینل سرچ کرتے ہوئے کئی سگریٹ پھونک ڈالے، اس کے پیر کے زخم اب بہتر تھا مگر اتنی دیر یوں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے سے درد شروع ہو چکا تھا، اس نے اذیت محسوس کر کے ٹانگیں اٹھا کر میز پہ رکھ لیں اور یہی وقت تھا جب مغل ہاؤس کے سارے مرد جمعہ کی نماز ادا کر کے آئے تھے اور سب سے پہلے یہ حسین نظارہ طارق چاچو کی نظر میں آیا تھا اور ایک لمحے کے لئے ان کا دماغ بالکل آؤٹ ہو گیا تھا۔

''کیا بے ہودگی ہے یہ؟'' وہ اس کے سر پہ کھڑے ہو کر چلائے تھے شاہ بخت نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر بے تاثر نظروں سے سگریٹ ٹیبل پہ پھینک کر ٹانگیں سمیٹ لیں۔

''میں تم سے بات کر رہا ہوں شاہ بخت! یوں بے تاثر نظر آ کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو، اور یہ گھٹیا حرکت یوں سر عام کرنے کا مقصد؟'' وہ بالکل آپے سے باہر ہو گئے۔

''ورنہ کیا کریں گے آپ؟'' وہ مکمل طور پر پرسکون تھا۔

''میں تمہیں اٹھا کر اس گھر سے باہر پھینک دوں گا، یہ علی الاعلان بے حیائی اور بدمعاشی یہاں نہیں چلے گی، سمجھے تم۔'' وہ دھمکانے لگے۔

''میں خود بھی اس قید خانے سے تنگ آ چکا ہوں۔'' وہ دوبدو بولا۔

''نواز کو بھی آزادی چاہیے تھی مگر ہوا کیا لاش واپس آئی تھی اس کی، تمہاری بھی آ جائے گی، پتا نہیں کہاں کہاں دشمنیاں مول لی ہوئی ہیں تم نے جو انہوں نے یہ حال کر کے پھینک دیا تمہارا، اچھا ہوتا تم بھی مر جاتے، تمہاری بھی لاش واپس آتی میں اکٹھا ہی رو لیتا اپنی بدبختی پر۔'' طارق بالکل ہی حواس کھو بیٹھے تھے، شاہ بخت کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

''چاچو! پلیز کیا بول رہے ہیں آپ، غصہ کم کریں کچھ نہیں ہوا اور بخت تم چلو اپنے کمرے میں، اس طرح کے تماشے کیوں کرتے پھرتے ہو۔'' وقار نے ہمیشہ کی طرح مداخلت کی تھی، مگر طارق کے غصے کو مزید ہوا ملی تھی۔

''تم ہمیشہ اس کی ڈھال بن جایا کرو اور دیکھنا جس طرح یہ ہمیں ذلیل کرتا ہے تمہیں بھی کرے گا، وہ دن دور نہیں ہے وقار یہ تمہیں بھی

خوار کر دے گا، تمہیں اس کی حمایت کرنا بہت مہنگا پڑے گا۔'' وہ وقار کو بھی جھڑکنے لگے۔

''میں بھگت لوں گا۔'' وقار نے روکھائی سے کہا اور اسے کھینچ کر لے گئے، اس شام کسی نے بھی چائے نہ پی اور رات کے کھانے پہ بھی سب کا موڈ بہت آف تھا، شاہ بخت تو ٹیبل پہ آیا ہی نہیں تھا، اگرچہ تھا وہ گھر میں ہی اور جب سب اپنے کمروں میں چلے گئے تو وقار سمیت ایاز، رمشہ اور کومل اسے باہر کھینچ لائے تھے، اسے لے کر جب وہ لاؤنج میں آئے تو علینہ سب کے لئے چائے لے کر آ گئی تھی، چائے کے دوران وقار اسے سمجھاتے رہے۔

''خود کو کیوں مشکل میں ڈال رہے ہو بخت؟ میرے بچے خود کو سنبھالو، حادثات زندگی کا حصہ ضرور ہیں مگر زندگی نہیں، اگر اتنی چھوٹی سی بات کو ذہن پر سوار کر لو گے تو زندہ کیسے رہو گے؟'' وقار نے کہا۔

''آپ مجھے بہلا رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ سرد تھا، وقار حیران سے رہ گئے۔

''تو تم کھلونا لے کر بہلو گے؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولے تھے۔

''ہاں مجھے بہلنے کے لئے گڑیا چاہیے۔'' اس نے نظریں اپنے سامنے مرکوز رکھتے ہوئے کہا جہاں علینہ، کومل کے ساتھ بیٹھی تھی پھر اس نے بڑی عجیب حرکت کی اس نے آگے بڑھ کر علینہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''مجھے یہ باربی ڈول چاہیے، میں اس سے کھیلنا چاہتا ہوں، اسے بنائیں گے میرا؟'' اس کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ سب ساکت اسے دیکھتے رہ گئے، جبکہ علینہ کے لب لرزا اٹھے اور آنکھیں جلنے لگیں۔

''آپ کا اور میرا مذاق کا کوئی رشتہ نہیں بنتا۔'' اس نے جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑائے اور دوڑتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

یہ مقامی پولیس اسٹیشن تھا جہاں نئے ڈی ایس پی کی آمد کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، ایسے افسر ہمیشہ ہی ایک مسئلہ بن کر آتے تھے جو مقابلے کے امتحان میں اعلیٰ کارکردگی دکھا کر اس محکمے میں آ تو جاتے تھے مگر ان پر سوار ایمانداری کا خبط ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا تھا، نتیجتاً یا تو بات کسی دور دراز علاقے سے پوسٹنگ پہ ختم ہوتی یا وہ بھی ان کے رنگ میں رنگے جاتے، ماتحت طبقہ ان تمام حربوں سے واقف تھا جن سے وہ ایسے کسی بھی نئے آنے والے افسر کو تگنی کا ناچ نچانے پہ مجبور کر سکتے تھے۔

لیکن اس بار اس نئے آنے والے افسر نے ان کے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا تھا اس نے ان لوگوں کے سارے اعداد و شمار کو غلط کر دیا تھا۔

وہ بے حد تلخ مزاج اور اکھڑ تھا، کسی سے سیدھے منہ بات کرنا تو دور وہ تو کسی کی شکل دیکھنے کا روادار بھی نہ تھا اور اگر بحالت مجبوری کسی کو مخاطب کرنا پڑ جاتا تو اس کی تیوری پہ پڑے بل صاف نظر آتے، اسے صرف حکم دینے کی عادت تھی اور اس کے خلاف ورزی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

اس کے آنے سے اس اسٹیشن کی قسمت ہی پھوٹ گئی تھی، اس کی سفاکیت اور کرخت مزاجی نے اس کے ماتحت طبقے کو ایسی نکیل ڈالی تھی کہ کوئی اس کے سامنے پر بھی نہیں مار سکتا تھا۔

اسے یہاں تعینات ہوئے دوسرا ماہ ختم ہونے کو تھا جب ایک شام اس کے آفس کے نمبر

"سر! آپ کے کزن کا فون ہے۔" اس کے پی اے نے کہا۔
وہ ٹھٹک گیا، کزن؟ اس کے اندر جیسے کوئی چھناکا ہوا تھا۔
"اوکے۔" اس نے فوراً سنبھل کر کہا، اس کے پی اے نے لائن ڈائریکٹ کر دی تھی۔
"کیسے ہیں ڈی ایس پی صاحب؟" اس کے کانوں نے ڈیڑھ سال بعد یہ آواز سنی تھی، چند لمحے وہ بالکل شاکڈ رہ گیا، مگر یہ صرف لمحاتی تغیر تھا۔
"کیوں فون کیا؟" اس نے ایک تھرا دینے والی سفاکیت اور لاپروائی سے پوچھا۔
"مجھے معلوم ہے کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا، بات ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو اپنی ناگوار آواز سنانا پڑ گئی۔" وہ طنزاً بولا تھا۔
"کام کی بات کرو۔" اس نے سرد مہری اور ناگواری سے کہا۔
"سنا تھا اللہ تعالیٰ بے غیرت لوگوں کو بیٹی کی رحمت سے نہیں نوازتا، مگر پتا نہیں آپ کے پیچھے کس کی دعا ہے جو خدا نے یہ رحمت آپ پہ کر دی ہے۔" وہ زہر خند لہجے میں کہہ رہا تھا، ڈی ایس پی چند لمحے کے لئے فریز ہو گیا تھا۔
"کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ دھاڑا تھا۔
"بالکل آپ کو تو یہ بکواس ہی لگے گا، مگر سچ یہی ہے کہ آپ کل شام ایک بیٹی کے باپ بن گئے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

ابا نے ستارا کی مرضی پوچھی تو جواباً وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی یا شاید اس کے پاس سارے جواز کم ہو گئے تھے، اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا تھا، بعض دفعہ خاموشی سارے مسئلے سلجھا دیتی ہے، اس کا کچ مکمل تھا اب امتحان معصب شاہ کا تھا جو خود کو ایک لبرل آدمی کہتا تھا، اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا، وہ شخص خوفناک حد تک خود غرض تھا اور پتا نہیں دو ملاقاتوں میں اسے کیوں اتنا جنونی عشق ہو گیا تھا کہ وہ ہر بات برداشت کرنے کو تیار تھا۔
ابا نے بھی معصب کو فائنل کر دیا تھا، ویسے بھی اس میں ناپسند کرنے والی کوئی بات تھی ہی نہیں، کچھ دن بعد معصب کے والد اور حیدر کی ممی علشبہ کے ساتھ آئیں تھیں اور باقاعدہ منگنی کا اعلان کر گئی تھیں اور جب اگلے روز وہ کلینک آئی تو حیدر بے حد خوش تھا، جب اس نے بڑے احترام اور پیار سے اسے "بھابھی" کہا تو ستارا کی آنکھیں جھلملا سی گئیں تھیں۔
"آپ کو پتا ہے میں کتنا خوش ہوں...... اف...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی اپنی خوشی کا اظہار کروں کیسے، آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے ستارہ آپ یقین کریں آپ کو کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا، آپ کو کبھی افسوس نہیں ہو گا میرا بھائی بہت اچھا ہے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے کہتا گیا، ستارا ہنس پڑی۔
"آپ کے بھائی جو ہیں سر۔" حیدر بھی ہنسا تھا۔
"اب آپ اس سیٹ پہ ہی بیٹھیں گی۔" حیدر نے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"وہ کیوں؟" ستارا حیران ہوئی تھی۔
"اب آپ میری بھابھی ہیں جناب اور وہاں آپ کی جگہ نہیں بنتی بلکہ آپ کو آفس ہی نہیں آنا چاہیے، بس گھر جائیں اور اچھی اچھی شاپنگ

کریں اور خوش رہیں۔" حیدر ہنستے ہوئے کہتا گیا، ستارہ کو اس لمحے اس کے خلوص اور محبت پہ پیار آیا تھا، وہ ہنستے ہوئے سر ہلاتی رہی۔
مگر جھٹکے دار بات تو اگلے دن ہوئی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ معصب شاہ نے منگنی ریجیکٹ کر کے سیدھا نکاح کا آرڈر جاری کر دیا تھا، وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔
"ابا جان! یہ بہت جلدی ہے۔" اس نے احتجاج کیا تھا، جواباً وہ پرسکون انداز میں مسکرا دیئے۔
"یہ احسن کام جتنی جلدی نمٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے۔" وہ خاموش ہی رہ گئی، حیدر کی خوشگوار باتوں نے ذہن کو منفی نہیں ہونے دیا تھا۔
"آپ کو مجھے گھر سے نکالنے کی اتنی جلدی ہے؟" اس نے منہ پھلا کر کہا۔
"چلو ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ خوشدلی سے بولے۔
اسی شام عائشہ آپی اور عینی بھی آ گئی تھیں، سب اس غیر متوقع بات پر بے حد خوش تھے، ایسا ہیرے جیسا لڑکا دوبارہ مل جانا اور وہ بھی بغیر کسی ڈیمانڈ کے یہ کرامت اور معجزے سے کم تو نہ تھا، وہ رات بستر پہ سونے کے لئے آئی تو ذہن میں ایک بھولی بسری یاد کی بازگشت لہرائی تھی۔
"تارا! میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" اس کے لبوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ لہرائی تھی، اب کہاں تھا وہ شخص جو خود بخود جان جاتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے، اب وہ کدھر تھا؟ جو اسے سمجھنے کا دعوے دار تھا، وہ تو شاید بہت دور اپنی دنیا میں گم ہو چکا تھا۔
"جھوٹ صرف جھوٹ بولا تھا تم نے۔" وہ نفرت سے بڑبڑائی، اسی لمحے اس کا سیل جاگ اٹھا۔
"معصب کالنگ۔" جگمگا رہا تھا، چند لمحوں کے لئے وہ بے تاثر نگاہوں سے سیل فون کی جگمگاتی اسکرین کو دیکھے گئی، اسے حیدر نے معصب کا نمبر دیا تھا، مگر معصب نے آج کال پہلی مرتبہ کی تھی، فون بجتا رہا مگر وہ اسے اٹھا نہیں سکی، وہ اٹھانا چاہتی ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

اسے پولیس اسٹیشن آئے صرف دو گھنٹے گزرے تھے جب اسے ایمرجنسی کال موصول ہوئی تھی۔
"سر! آپ کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے جس میں بیگم صاحبہ بے بی کو اسکول لے کر جا رہی تھیں، ڈرائیور تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا ہے جبکہ بیگم صاحبہ کی حالت بے حد نازک ہے اور بے بی معجزانی طور پر محفوظ ہیں۔" اس کے سر پہ جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا، وہ سارے کام چھوڑ کر ہاسپٹل بھاگا، اس کی بیوی آئی سی یو میں تھی، کاری ڈور کے ٹھنڈے فرش کی خنکی اس کے اعصاب متاثر کر رہی تھی اگرچہ وہ بے حد مضبوط اعصاب کا مالک تھا، اس نے فون نکالا اور ایک نمبر ملانے لگا۔
(باقی آئندہ ماہ)

شاہینہ چندا مہتاب

اس کا نام اگر نادر تھا تو دوسری جانب اس کا نام نادرہ تھا نادر اگر پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا تو دوسری جانب وہ بھی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی نادر اگر پانچ بہنوں سے چھوٹا تھا تو وہ بھی پانچ بھائیوں سے چھوٹی تھی نادر اگر چھوٹا ہونے کے ناطے بے حد اتھرا تھا تو نادرہ بھی اکلوتی ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار میں بگڑی بے حد بدتمیز تھی جو ہر معاملے میں اپنی مرضی چلانے کی عادی تھی سیدھی طرح بات نہ مانی جاتی تو رو کر یا شور مچا کر ہر حال میں ہی بات منوا کر رہتی۔

اپنے والدین کا لاڈلہ ہر کوئی ہوتا ہے مگر خاندان بھر میں اکلوتے ہونے کی وجہ سے وہ دونوں دادی کو بے حد عزیز تھے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ دونوں دادی کی آنکھوں کے تارے تھے خاندان میں کسی کو جرت نہ تھی کہ ان دونوں کو کچھ کہہ دے اور اگر بھولے سے کوئی ان

ناولٹ

دونوں کو کچھ کہہ دیتا تو دادی مارنے مرنے پر اتر آتی یہی وجہ ہے خاندان والوں کی کیا خود والدین میں بھی یہ جرأت نہ تھی کہ ان کی بدتمیزی پر ان کو ٹوک سکیں باہر سے تو سب خیر ہی تھی دادی کے لئے اصل مسئلہ ان دونوں کی دشمنی کا تھا وہ دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

یوں تو دشمنی کی وجہ کچھ خاص نہ تھی گھر کے صحن میں ایک درخت تھا، جس میں میٹھی گوند نکلتی تھی نادر شوق سے کھاتا تھا اور نادرہ کو بھی وہ بہت مزیدار لگتی تھی وہ ہمیشہ نادر سے پہلے اٹھتی اور ساری گوند کھا جاتی گو کہ اس کے بعد اس کو نادر کی مار بھی کھانی پڑتی مگر وہ باز نہ آتی، اس کو نادر کو تپانے اور جلانے میں مزہ آتا تھا اس روز روز کی لڑائی سے تنگ آ کر دادی نے دونوں کی باری طے کر دی ایک دن نادر گوند کھائے گا تو دوسرے دن نادرہ اور یوں گھر میں سکون ہو گیا، نادرہ، نادر

کے سگے تائے کی بیٹی تھی دونوں کے والد دین محمد اور فرید محمد اپنے خاندان گھر میں اکٹھے اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے والد کب کے فوت ہو چکے تھے ان کی چار بہنیں تھیں اور چاروں ان سے بڑی تھیں اور اپنے گھروں میں خوش خرم زندگی بسر کر دیں تھیں چند ایکڑ زمین تھی جس سے ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو رہی تھی۔

دین محمد نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے رشتے فرید محمد کی دونوں بڑی بیٹیوں سے طے کر دیئے تھے شادی ہونا ابھی باقی تھی دونوں بھائیوں میں اگر بے حد محبت تھی تو دونوں کی بیویاں بھی ایک دوسرے کی سہیلیاں بن کر رہتی تھیں۔

☆☆☆

باری طے ہونے کے بعد گھر میں امن ہو گیا تھا مگر یہ امن عارضی ثابت ہوا صرف چند ہفتے گھر میں سکون رہا پھر ایک دن جب نادر کی باری اچانک نادرہ کی آنکھ کھلی تو وہ چپکے سے جا کر جتنی گوند نکلی ہوئی تھی مزے سے کھا کر واپس آ کر لیٹی اور پھر سو گئی آنکھ نادر کے اچانک گال پر پڑنے والے تھپڑ سے کھلی تھپڑ ایسا زوردار تھا کہ نادرہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور پھر وہ بھائیوں کو سنانے کے لئے اونچی آوازیں رونے لگی ان دونوں کے قریب سب سے پہلے پہنچے والی دادی تھی۔

"کیا ہوا۔" انہوں نے ڈانٹ کر نادر سے پوچھا مگر چہرے پر غصہ نام کو نہ تھا۔

"آج پھر اس نے میری گوند کھائی ہے۔" نادر نے خونی آنکھوں سے نادرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خود کمینہ ہو گا، دادی میں نے گوند نہیں کھائی ہے۔" وہ صاف مکر گئی نادر ایک اور تھپڑ مارنا چاہتا تھا مگر تب سارے گھر والے نادرہ کے رونے کی آواز سن کر ان کے قریب آ چکے تھے، نادرہ کی ماں کو معلوم تھا غلطی نادرہ کی ہے وہ جب نماز کے لئے اٹھی تو نادرہ کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے خود اس کو گوند کھاتے دیکھا تھا ویسے بھی گھر میں اور کوئی گوند کھانا پسند نہیں کرتا تھا، تاہم تب ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ آج نادر کی باری تھی مگر نادرہ کے تینوں چھوٹے بھائی سخت غصے میں تھے کہ نادرہ کے ہونٹ سے خون نکل رہا تھا مگر دادی کی وجہ وہ تینوں غصہ پینے پر مجبور تھے، صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی دادی نادر کو جلدی سے اپنے کمرے میں لے گئیں، ادھر نادرہ کو ماں کو گلے سے لگا کر پیار کیا مگر تھپڑ زوردار تھا دو بھائی تو بڑے بڑے تھے مگر تینوں چھوٹے بھائی جو نادر سے بہر حال بڑے تھے مل کر فیصلہ کیا کہ وہ اس بار نادر کو ہرگز نہ چھوڑیں گے اور جو انہوں نے سوچا وہی کیا بھی باہر شام کے وقت ڈیرے پر انہوں نے نادر کو پکڑا اور ساری کسر نکال دی نادر خود بھی خوب صحت مند تھا، مگر وہ تین تھے اور پھر بڑے بھی تھے اس لئے مار کھا کر روتا ہوا گھر پہنچا اور سیدھا دادی کے پاس گیا اور گھر میں گویا قیامت آ گئی دادی نادر کو ساتھ لئے اپنے کمرے سے باہر آئیں اور چیخ کر پوچھا۔

"ان تینوں نے جرأت کیسے کی نادر پر ہاتھ اٹھانے کی۔" مارے شدید غصے کے وہ کانپ رہی تھیں کہ نادر میں تو ان کی جان تھی۔

صبح جس طرح نادرہ کی ماں چپ تھی اسی طرح اب نادر کی ماں چپ تھی جانتی تھی وہ اکثر نادرہ کو مارتا رہتا تھا آخر بھائی کب تک صبر سے کام لیتے اچھا ہوا جو آج ٹھکائی کر دی اب سوچ سمجھ کر نادرہ کو ہاتھ لگائے گا تاہم دادی کا پارہ خوب چڑھا ہوا تھا اور وہ بے چینی سے ان تینوں کے گھر آنے کا انتظار کر رہی تھیں اور جب رات کو وہ تینوں چھوٹے گھر آئے تو وہ ان پر برس پڑیں کہ انہوں نے نادر کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے کی وہ تینوں دادی کو جواب دیئے بغیر اپنے روم میں چلے گئے کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تھے ویسے بھی سامنے کھڑی ماں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ان کو خاموش رہنے کا کہا تھا باقی رہی نادرہ تو وہ ادھر ادھر مسکراتی پھر رہی تھی آج اسکا دل بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا اس کو خوشی تھی کہ بھائیوں نے نادر کی ٹھکائی کی اب مجھے ہاتھ لگا کر دیکھے۔

اور پھر یہ اکثر ہونے لگا گھر کے اندر نادر جب بھی نادرہ کو مارتا تو وہ تینوں بھائی گھر کے باہر نادر کو پکڑ کر خوب مارتے کہ نادرہ گوند کھانے سے باز نہ آتی تھی اس زور زور کے جھگڑے سے تنگ آ کر دادی نے گھر سے درخت ہی کٹوا دیا اور گھر میں امن و سکون ہو گیا۔

مگر یہ سکون کبھی کبھی بے سکونی میں بدل جاتا جب نادرہ، نادر کے لئے فریج میں رکھی ملائی کھا جاتی لیکن یہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا یونہی لڑتے جھگڑتے وہ دونوں جوان ہو گئے تب تک دادی فوت ہو چکی تھیں دادی کی شدید ترین خواہش تھی کہ نادر کی شادی نادرہ سے ہو یہ بات جب انہوں نے نادرہ کی ماں سے کی تو انہوں نے جواب دینے کی بجائے خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا کہ یہ قسمت کے فیصلے ہیں ویسے بھی نادر بہت غصے والا تھا اور نادرہ میں بھی ضبط نام کی کوئی چیز نہ تھی اور ایک میدان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں ویسے بھی شادی شدہ زندگی تب ہی کامیاب ہوتی ہے جب ایک سخت ہو تو دوسرا نرم دونوں سخت ہوں تو گھر ٹوٹ جاتے ہیں اور دادی نے یہی بات جب نادر کی ماں سے کہی تو انہوں نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کچھ ناگواری سے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہیں ماں جی نادر کے غصے کو تو آپ جانتی ہیں نادر کی دو بہنیں اور میری دو بیٹیاں نادرہ کی بھابیاں ہیں، مجھے نادر کی شادی نادرہ سے کر کے ان کے گھر نہیں اجاڑنا پھر کبھی ایسی بات نہ کیجئے گا۔" اور دادی نے بڑے پیار سے کہا۔

"ارے ابھی چھوٹا ہے بڑا ہو گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مڈھوں بگڑے کدی نا سدھے۔" نادر کی ماں نے کہا اور کھیتوں سے سبزی لینے چلی گئیں جبکہ دادی اب بھی پوری سنجیدگی سے نادر کی شادی نادرہ سے کرنے کا سوچ رہی تھی کہ یہ ان کی دلی تمنا تھی اور جب یہی بات ایک دن نادر سے کی دادی نے کہ میں اپنے بیٹے کی شادی نادرہ سے کروں گی دادی کی بات سن کر نادر سوچ میں پڑ گیا اور دادی نے اس کو سوچ میں گم دیکھ کر کہا۔

"کیوں بیٹا نادرہ تمہیں اچھی نہیں لگتی بتاؤ مجھے نادرہ سے تمہاری شادی میری خوشی ہے۔"

"اچھی تو وہ خیر ہے ہی نہیں لیکن اگر یہ آپ کی خوشی ہے تو میں نادرہ سے شادی کر لوں گا اور شادی کی پہلی رات ہی میں نادرہ کی زبان میں چھری سے کاٹ دوں گا کیونکہ نادرہ بکواس بہت کرتی ہے سارا وقت بولتی رہتی ہے۔" تبھی نادرہ جو اچانک کمرے میں آئی تھی اور نادر کی بات بھی سن چکی تھی غصے سے اس کو گھورتے ہوئے تنک کر بولی۔

"توں میری زبان کاٹے گا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی کمینہ۔" وہ گالیاں دینے لگی۔

"آیا بڑا میری زبان کاٹنے والا۔" بڑی مشکل سے دادی نے نادر کو قابو میں رکھا اور نادرہ سے کہا وہ فوراً اپنی ماں کے پاس چلی جائے وہ چلی تو گئی مگر جاتے جاتے زبان نکال کر مزید تپا گئی اور پھر وہ دونوں جوان ہو گئے مگر مزاج دونوں کے اب بھی آتش فشاں تھے کہ ناں ہی نادرہ بدلی تھی اور نا ہی نادر۔

سارا گھر سارا خاندان تو کیا وہ سارے گاؤں میں اکھڑ مزاج تھا گھر کے اندر یا باہر ہر بندہ نادر سے جلا ہوا تھا بچے بوڑھے جوان عورتیں سب اس کے منہ لگتے ہوئے ڈرتے تھے کہ نجانے کب نادر کو ان کی بات بری لگ جائے اور ان کی شامت آ جائے گاؤں کی تو جوان لڑکیاں تو نادر کے سائے سے بھی بچ کر چلتیں تھیں غصہ ہر وقت نادر کی ناک پر دھرا رہتا بات بے بات وہ غصے میں آ جاتا اور صرف زبان ہی نہیں بلکہ غصے میں زبان کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی چلتا تھا ہاں اگر کوئی بے خوف تھا تو صرف نادرہ، نادر کے ساتھ اب جھگڑا نہیں ہوتا تھا کہ اپنے والد کی وفات کے فوراً بعد نا صرف زمینوں میں نادر نے اپنا حصہ الگ کر لیا تھا بلکہ گھر بھی الگ لے لیا تھا اور اس کے بعد کم کم ہی چچا کے گھر جاتا تھا حالانکہ اس کی دو بہنیں چچا کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔

رہی نادرہ تو میٹرک کرنے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ چکی تھی کہ آگے پڑھنے کی اجازت نہ ملی تھی اور نادر کے والد چونکہ وفات پا چکے تھے اور وہ تھا بھی اکیلا اسی لئے سارا وقت زمینوں پر ہوتا تھا۔

پڑھائی تو وہ والد کی زندگی میں ہی چار پانچ جماعتیں پڑھنے کے بعد چھوڑ چکا تھا، ادھر گھر کے اندر نادرہ کے شوق اونچی آوازیں ریڈیو سننا چلتے پھرتے اپنی پسند کے گانے گنگنانا سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ کرنا۔

اور پھر ایک انہونی ہو گئی لوگوں کے لئے وہ انہونی تھی کہ نادر نادرہ کی دشمنی دوستی میں بدل گئی تھی، یہ سب کیسے ہوا کوئی کچھ نہ جانتا تھا سوائے نادر اور نادرہ کے اصل میں گاؤں میں ہمیشہ کی طرح ولی بابا کے سالانہ عرس پر میلہ لگا ہوا تھا نادرہ نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر میلہ دیکھنے کا پروگرام بنایا اور نادر کی سب سے چھوٹی بہن جس کی منگنی تو ہو چکی مگر ابھی شادی نہ ہوئی تھی اس کو بھی میلے پر ساتھ چلنے کی دعوت دی بلکہ کہا کہ وہ تیار ہو کر خود اس کو لینے آئے گی اور جب نادرہ اس کو لینے آئی تو رضیہ شاور لے رہی تھی اور تائی امی گھر پر نہیں تھیں، نادرہ رضیہ کے روم میں چلی آئی اور پھر چھوٹا شیشہ پکڑ کر اپنے میک اپ کا جائزہ لینے لگی، جو وہ زندگی میں پہلی بار بڑی محنت سے کر کے آئی تھی بھابیوں سے ان کا میک اپ لے کر خوبصورت تو وہ پہلے بھی تھی مگر آج تو قیامت لگ رہی تھی وہ شیشے میں خود کو دیکھتے ہوئے مارے فخر کے مسکرا رہی تھی کہ۔

اچانک دروازے کا پردہ ہٹا کر نادر اندر داخل ہوا وہ بہن کو پکارتا ہوا اندر داخل ہوا تھا، نادرہ نے مڑ کر دیکھا تو پھر دیکھتی ہی رہ گئی بوسکی کی شرٹ پر گرین پٹی والا ریڈ کلر کا لاچا کاندھے پر سیاہ شال ڈالے وہ کتنا سوہنا لگ رہا تھا شیو بھی تازہ بنی ہوئی تھی وہ بے خودسی اس کو دیکھتی رہ گئی اور دیکھا تو نادر نے بھی اس کو حیراں ہو کر ہی تھا اور شاید جوان ہونے کے بعد آج پہلی بار اتنے قریب اور غور سے دیکھا تھا کالی شلوار پر گلابی شرٹ اور ہم رنگ دوپٹہ لئے وہ خود بھی گلابی گلابی ہو رہی تھی، اچانک وہ چونکا، کاندھے پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی جانب آئی اور کن آنکھیوں سے اس کے لمبے چوڑے وجود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہمیشہ والے رعب سے بولی۔

"یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ہٹو یہاں سے مجھے باہر جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔" نادر نے سنبھل کر بمشکل ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"بتانا کیا ضروری ہے۔" نادرہ نے اپنی خوبصورت پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بے حد ضروری ہے۔" نادرہ نے اب کے تیکھی نظروں سے اس کو دیکھا۔

"یہ نہ سمجھنا کہ ڈر کر بتا رہی ہوں میلہ دیکھنے جا رہی ہوں۔" نادرہ نے ایک نظر خود پر ڈالنے کے بعد نادر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے خوف لہجے میں کہا۔

"میلہ دیکھنے جانے دونگا میں تمہیں اس حلیے میں۔" کہتے ہوئے نادر نے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا نادرہ اس کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے کئی فٹ دور جا پڑی مگر شکر کہ چارپائی پر گری تھی نادرہ کی سمجھ میں نہ آیا اب کیا کرے وہ پہلے والی بچی نہیں تھی کہ مقابلہ کرتی اور مزید مار کھاتی ویسے بھی وہ آج اس کو اچھا لگ رہا تھا۔

"اب بتاؤ جاؤ گی میلہ دیکھنے اب۔" وہ اس کے قریب آ کر سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا، نادرہ کو کچھ اور نہ سوجھا تو لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے پھر روتے ہوئے زور سے چلائی۔

"اب میں چھوٹی بچی نہیں کہ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ مجھے مارو دیکھو مجھے کتنا درد ہو رہا ہے۔" نادر کو اسے روتے دیکھ کر حیرت ہوئی وہ تو سمجھا تھا وہ بچپن کی طرح اس پر جھپٹے گی اس کو مارنے کی کوشش کرے گی مگر وہ رو رہی تھی اور روتے ہوئے وہ نادر کو بے حد پیاری لگ رہی تھی اچانک وہ اس کی بات سن کر چونکا چند پل بغور اس کو دیکھا پھر جھک کر اٹھایا اور بانہوں کے حصار میں لے لیا حیرت کی بات یہ تھی کہ نادرہ نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی چپ چاپ اس کے

سینے سے لگی کھڑی رہی بچپن کی دشمنی پل بھر میں دوستی میں بدل گئی تھی اچانک باہر سے رضیہ کی آواز سن کر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے رضیہ اندر آئی۔

نادر کو دیکھ کر ڈر گئی اب میلے پر جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"نادر تم تو شہر گئے تھے۔" رضیہ نے پوچھا۔

"راستے میں گاڑی خراب ہو گئی اس لئے واپس آ گیا۔" نادر نے خلاف معمول نرم لہجے میں جواب دیا پھر پوچھا۔

"تم لوگوں نے کہیں جانا ہے۔"

"نہیں ہم نے بھلا کہاں جانا ہے۔" رضیہ جانتی تھی میلے پر جانے کا سن کر ہی بھائی کا موڈ خراب ہو جائے گا وہ لڑکیوں کا میلے پر جانا سخت ناپسند کرتا تھا۔ مگر یہ نادرہ تو کہہ رہی تھی تم سب میلا دیکھنے جا رہی ہو۔" نادرہ کے گلابی ہوتے گالوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ جس کو نادر کے ایک ہی لمس نے پتھر سے موم بنا ڈالا تھا۔ وہ جو بغیر کسی ڈر کے قینچی کی طرح زبان چلانے کی عادی تھی۔ اس وقت چپ چاپ نگاہیں جھکائے کھڑی تھی اور سینے کے اندر دل کی جو حالت تھی یہ وہی جانتی وہ جب سے جوان ہوئی تھی تب سے اپنے ہونے والے جیون ساتھی کے بارے میں سوچا کرتی تھی مگر ان سوچوں میں دور دور تک شامل نہیں تھا۔ لیکن یہ اچانک کیا ہوا تھا ابھی چند لمحے جو اس نے نادر کے بازوؤں میں گزارے نادر کے سینے سے لگ کر وہ نادر کو پورے کا پورا بدل گئے تھے۔ اگرچہ منہ سے نہ نادر نے کچھ کہا تھا اور نہ ہی نادرہ نے مگر وہ محسوس کر رہی تھی کہ بغیر کچھ کہے ہی نادر کو اپنا سب کچھ مان چکی تھی اور یہ کہ اب کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

نادرہ نے ایک بار پھر محبت پاش نظروں سے دیکھا پھر رضیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"چلو تم سب آج میلا دیکھ ہی لو مگر سنو بڑی چادریں لے کر جانا۔"

نادر کے جانے کے بعد رضیہ نے بغور نادرہ کو دیکھا پھر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں کیا ہوا جو یوں چپ چاپ کھڑی ہو۔" نادر نے کچھ کہا۔

نہیں نادرہ نے آہستہ سے کہا تو رضیہ جو ابھی تک کچھ نہ سمجھ سکی تھی چونکتے ہوئے بولی۔

"ارے یہ نادر کو کیا ہو گیا ہے میلہ دیکھنے کی خود ہی اجازت دے گیا ہے۔" نادرہ تب بھی چپ رہی اور پھر وہ سب میلہ دیکھنے چلی آئیں تاہم ایک بات سب نے محسوس کی تھی نادرہ کچھ چپ چپ اور شرمائی شرمائی اور گھبرائی سی تھی اور پھر میلے میں نادر بھی مل گیا نا صرف مل گیا۔ رضیہ حیران تھی بھائی کے اس بدلے ہوئے رویے پر مگر خوش بھی تھی پہلی بار بھائی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آج نادر کے ماتھے پر ہمیشہ پڑے رہنے والے بل غائب تھے، تاہم وہ یہ نہ جان سکی کہ محض نادرہ کی کلائیاں چوڑیوں سے بھرنے کے لیے صدقے میں ان سب کو بھی چوڑیاں عطا کی گئی تھیں۔ وہ تو بھائی کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ بات جو رضیہ گھر کے اندر محسوس نہ کر سکی محض اپنی بے وقوفی یا سادگی کی وجہ سے وہ گھر کے باہر سارے خاندان نے کیا سارے گاؤں نے محسوس کر لی کہ بچپن کی جانی دشمنی محبت میں بدل چکی ہے۔ یہ محبت ہی تو تھی جو نادر نادرہ کے تعاقب میں رہنے لگا تھا۔ اس کا غصہ نادرہ کے

لیے نرمی میں بدل چکا تھا صرف نادرہ تھی جو اس کے غصے سے نہ صرف بے خوف ہو چکی تھی اب وہ نادر کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کرتی تھی بلکہ اکثر نادر کو غلط بات پر ٹوک بھی دیا کرتی تھی اور نادر کو نادرہ کی بات پر ٹوک پر غصہ آنے کی بجائے ہمیشہ پیار ہی آتا تھا کچھ لوگوں کے لیے یہ بات خوشی کا باعث تھی کہ دشمنی دوستی میں بدلنے سے نادر تھوڑا نرم ہو گیا۔ اس کے چہرے کی کرختگی نرمی میں بدل گئی۔ ماتھے پر جو ہمیشہ بل پڑے رہتے تھے وہ غائب ہو گئے تھے۔ وہ انسانوں سے انسان بن کر بات کرنے لگا تھا۔

اور کچھ دل ایسے بھی تھے جن میں خوشی کی بجائے تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے۔ نادر کی دونوں بڑی بہنیں یعنی نادرہ کی بھابیاں نادرہ کی والدہ اور نادر کی اپنی والدہ۔

تشویش کی وجہ دشمنی دوستی میں بدلنے کا مطلب تھا نادرہ نادرہ کی محبت کا اسیر ہو چکا تھا .....اور محبت کا مطلب ظاہر ہے وہ نادرہ سے شادی کی خواہش کرے گا اور اگر یہ شادی ہو جاتی ہے تو کل کو ایسی ویسی بات ہونے کی صورت میں نتیجہ نادر کی بہنوں کو بھگتنا ہوگا جو نادرہ کی بھابیاں تھیں اور پانچ پانچ چھ چھ بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

نادرہ کی ماں جانتی تھی شادی سے پہلے مرد کچھ اور ہوتا ہے اور شادی کے بعد عام سا مرد بھی شیر بن جاتا ہے۔ نادر تو تھا ہی شیر وہ نادرہ کی شادی نادر کے ساتھ کرنے کا سوچ بھی نہ سکی تھیں۔ وہ تو اس لیے کہ نادرہ ان کی بے حد نازوں پلی لاڈلی بیٹی تھی۔ دوسرا نادرہ نے میٹرک کر رکھا تھا اور وہ نادرہ کی شادی کسی پڑھے لکھے مرد سے کرنا چاہتی تھیں جبکہ نادر پانچ جماعتیں بھی پوری نہ پڑھ سکا تھا۔ نادرہ کی ماں نادرہ کے لیے رشتہ پہلے ہی اس کے لیے تلاش کر رہی تھی مگر اب اس میں تیزی آئی تھی قبل اس کے نادرہ من مانی کرتی وہ اس کو رخصت کرنا چاہتی تھیں کہ ہر ماں بیٹی کا سکون چاہتی ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر زہر کوئی نہیں کھاتا۔ اب وہی نادر کی ماں تو یہ سچ تھا کہ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے وہ ہر ماں کی طرح ان کو بیٹیوں سے زیادہ عزیز تھا۔ حالانکہ غصے میں وہ ان کو بھی نہیں بخشتا تھا مگر بیٹے کی محبت میں بیٹیوں کی شادی شدہ زندگی تباہ نہیں کر سکتی کہ فی الحال خاموشی کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا ادھر یہ پریشان لوگ تھے۔

دوسری جانب ایک دوسرے کی محبت میں گم سب پریشانیوں اور باتوں سے بے خبر نادر اور نادرہ خاص نادرہ کو تو اب نادر کی محبت کے سوا کسی کا ہوش ہی نہ تھا۔ سب بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور اب نادرہ کی باری تھی اور نادرہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ماں اس کی شادی کی بہت امیر خاندان اور پڑھے لکھے بندے سے کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی جب نادرہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ نادرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ رشتہ مانگنے لازمی جائے گی۔

اور ادھر سے جب نادرہ خود اپنی ماں سے کہتیں کہ مجھے نادر ہی سے شادی کرنی ہے تو کس میں اتنی جرأت تھی کہ انکار کرتی۔ وہ دونوں اپنی محبت میں گم تھے۔ ادھر نادرہ کی ماں رشتے تلاش کر رہی تھی تو ادھر نادر کی ماں بھی بیٹیوں کو تباہی سے بچانے کے لیے نادر کے لیے رشتہ دیکھ رہی تھی مگر نادر سے پہلے نادرہ کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا نیا نیا وکیل بنا تھا۔ ٹھیک ٹھاک کھاتے پیتے لوگ تھے جب نادرہ کی ماں نے کہا۔

"نادرہ پرسوں تمہیں لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں۔" تو وہ کوئی بات کیے اٹھی اور سیدھی

نادر کے پاس ڈیرے جا پہنچی۔ نادر اس کو دیکھتے ہی کھل اٹھا اور نادرہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"پرسوں مجھے لڑکے والے دیکھنے آ رہے ہیں اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"کس کی شامت آئی ہے کہ تمہیں دیکھنے آئے سر کاٹ کر رکھ دوں گا اگر میرے علاوہ تمہیں کوئی بیاہنے آیا۔" نادر نے غصے سے کہا مگر دوسرے ہی لمحے مسکرا کر بولا۔

"تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ ماں آج ہی رات تمہارا ہاتھ مانگنے آئے گی تم لوگوں کی طرف سے انکار نہیں ہونا تم بھی چچی سے بات کر لینا۔" نادر نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی تم فکر مت کرو تائی آئی تو انکار نہیں ہونے دوں گی۔" نادرہ نے کہا۔ پھر بہت دیر نادر کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ پرسکون سی گھر لوٹ آئی اور اسی شام رات کا کھانا کھاتے ہوئے نادر نے ماں سے نادرہ کے ساتھ شادی کی خواہش ظاہر کی۔ باپ تو تھا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو بیٹے ایسی بات ماں ہی سے کرتے ہیں۔

ماں کے لیے یہ حیرانی کی بات نہ تھی مگر وہ اپنی ایک کوشش کرنا چاہتی تھی اس لیے کہا۔

"بیٹا میں نے تمہارے لیے ساتھ والے گاؤں میں ایک بے حد سوہنی کڑی دیکھی ہے چھوڑو نادرہ کو لاڈ پیار میں بگڑی بدتمیز بچی ویسے بھی وہ ہمیشہ تمہاری دشمنی رہی ہے۔"

"وہ دشمن تھی تو میں کون سا دوست تھا وہ بدتمیز ہے تو مجھے کونسی تمیز ہے ماں بات یہ ہے کہ مجھے نادرہ سے پیار ہو چکا ہے اب وہ جیسی بھی ہے مجھے قبول ہے ویسے بھی یہ میری دادی جان کی بھی خواہش تھی کہ میری شادی نادرہ سے ہو تب میں بچہ تھا مگر اب بڑا ہو چکا ہوں اور اپنی دادی جان کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں ماں آپ آج ہی میرے لیے نادرہ کا رشتہ لینے چچا کے پاس جائیں۔" نادر نے زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے بات کی۔

"اپنے چچا کو جانتے ہوئے بھی تم یہ بات کہہ رہے ہو تم بہت اچھی طرح جانتے ہو تمہارا چچا ہی نہیں اس کے بیٹے بھی تمہیں پسند نہیں کرتے وہ صاف انکار کر دیں گے۔" ماں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا وہ اپنے دیور کو اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ نادر جیسے کرخت مزاج کو اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ کبھی نہیں دے گا اور یہ ان کے لیے بہت خوشی کی بات تھی مگر رشتہ مانگنا مجبوری تھی ورنہ نادر ان کا حشر کر دیتا۔ ان کو خوشی تھی کہ ان کی آخری بیٹی بھی پچھلے مہینے بیاہ دی گئی تھی اس کے باوجود وہ تھوڑی مہلت چاہتی تھیں۔ انہوں نے نادر سے کہا۔

"آج ہی جانا کوئی ضروری نہیں پہلے میں تمہاری بڑی بہنوں کو بلا کر ان سے بات کر لوں پھر بعد میں رشتہ لینے جاؤں گی۔" ان کی بات پر نادر کا موڈ آف ہو گیا اور اس نے بدتمیزی سے کہا۔

"بہنیں ان کے گھر ہی تو رہتی ہیں اگر ان سے بات کرنا ضروری ہے تو وہیں ان کے گھر جا کر پہلے ان سے بات کر لینا باقی رہی یہ بات کہ چچا یا وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے غیر ضروری ہے اہم بات یہ ہے کہ نادرہ مجھے پسند کرتی ہے اور اب یہاں بیٹھ کر ٹائم ضائع مت کریں کپڑے بدلو اور فوراً جاؤ۔" اب کے نادر نے حکم دینے والے لہجے میں کہا اور ماں کے پاس نادر کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ چولہے کے سامنے سے اٹھی اور اندر روم میں کپڑے بدلنے چلی گئیں۔ اس کے گھر سے نکلنے تک نادر باہر صحن میں ٹہلتا رہا۔

اور وہ وقت نادر کی ماں کے لیے حیران کن تھا جب ان کے دیور نے رشتہ مانگنے پر بغیر کسی اعتراض کے فوراً ہاں کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ہی بیٹی ہے جب چاہے بیاہ کر لے جاؤ اگر یہی حکم ربی ہے تو میں انکار نہیں کرنے والا کون ہوتا ہوں۔" تاہم اس کے چہرے پر خوشی کی بجائے سنجیدگی تھی۔

یہ تو نادر کی ماں کو بعد میں معلوم ہوا اپنی بیٹیوں سے کہ نادرہ نے خود اپنی ماں سے کہا تھا۔ وہ نادر سے شادی کرنا چاہتی ہے آج تائی نے رشتہ لینے آنا ہے ان کے رشتہ مانگنے پر انکار نہ کیا جائے۔

نادرہ کی ماں نادر اور اس کی دوستی ہونے پر ہی سمجھ چکی تھی کہ اصل معاملہ کیا ہے تاہم پھر بھی انہوں نے بیٹی کو سمجھانے کی پوری کوشش کی اور کہا۔

"بیٹی ایسے مرد سے شادی کرنا اپنے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کرنے کے مترادف ہے یہ پیار محبت شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ختم ہو جائے گا۔ آج وہ تمہاری ہر بات مانتا ہے مگر شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنی بات ہی منوائے گا اور جس قدر غصے دار ہے وہ ہے تم پر ہاتھ بھی اٹھایا کرے گا۔ شادی کے بعد تمہاری یہ خصوصی اہمیت ختم ہو جائے گی اور تم صرف ایک عام بیوی بن کر رہ جاؤ گی تب وہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا نہ تم خود اپنے لیے کچھ کر سکوں گی اور نہ ہی ہم تمہارے لیے کچھ کر سکیں گے۔ ابھی وقت ہے تم سوچ سکتی ہو ویسے بھی تمہارا باپ اور بھائی کبھی اس رشتے پر راضی نہ ہوں گے اور میں خود بھی تمہاری شادی اس ان پڑھ سے نہیں کرنا چاہتی۔" نادرہ نے ماں کی ساری باتیں سکون سے سنی پھر ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔

"وہ غصے دار ہے، ان پڑھ ہے، یہ آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے آپ نے جو کچھ بھی کہا مجھے یقین ہے شادی کے بعد ایسا کچھ نہیں ہو گا اور فرض کریں ایسا ویسا کچھ ہوا بھی تو آپ کے در پر آپ سے مدد مانگنے نہیں آؤں گی۔ باقی رہی باپ بھائیوں کے راضی نہ ہونے کی بات تو ان کو راضی کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ تائی امی کے رشتہ مانگنے پر اگر ادھر سے انکار کیا تو میں چھت کود کر جان دے دوں گی مگر نادر کے سوا کسی اور سے شادی نہ کروں گی۔" نادرہ نے دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے گویا مزید بات چیت کی راہ بند کر دی۔

اس کے باوجود دونوں بڑی بھابیوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کو خود اپنی فکر تھی مگر نادرہ نے ان کی بات سن کر بجائے اثر لینے کے تنک کر کہا۔

"مار تو کبھی کبھار آپ دونوں کو بھی میرے بھائیوں سے پڑ جاتی ہے ویسے بھی میں نے دیکھا خاندان کے اندر بھی اور باہر بھی بہت سارے مرد اچھا ہونے کے باوجود اکثر اپنی عورتوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں میں بھی جانتی ہوں نادر غصے والا ہے مگر آپ یقین رکھیں مار کھانے کے بعد میں آپ کی زندگی خراب کرنے یہاں نہیں آؤں گی یوں بھی اگر وہ میری محبت میں شادی سے پہلے اتنا بدل گیا ہے تو شادی کے بعد میری محبت اس کو سارے کا سارا بدل دے گی۔" نادرہ اپنی بات ختم کرتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گی۔

☆☆☆

نادرہ کی دھمکی کے بعد انکار کی گنجائش نہ رہی تھی ہاں کر دی گئی اور پھر پوری دھوم دھام سے نادر اور نادرہ کی شادی ہو گئی۔ نادر پانچ

بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا تو نادرہ بھی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ دونوں جانب سے دل بھر کر ارمان نکالے گئے۔ لاہور کی مشہور ناچنے والی بھی لائی گئی بعد میں کیا ہونا تھا یا کیا ہوتا یہ بعد کی بات تھی۔

یوں نادر اور نادرہ کی شادی گاؤں ایک ایک یادگار شادی بن گئی۔ دونوں کی جوڑی بھی شاندار تھی اور روپ بھی دونوں پر ٹوٹ کر آیا تھا۔ بعد میں ہونا تھا یا کیا ہوتا ہے یہ سب بھول چکے تھے۔ شادی کی خوشی میں۔ تاہم شادی کے بعد جو ہوا وہ سب کے لیے حیران کن تھا اور خوشی کا باعث بھی تھا۔ یہ نادر کا حیران ششدر کر دینے والا رویہ تھا۔ نادرہ لیے وہ جہاں پیر رکھتی نادر وہاں ہاتھ رکھتا تھا بات نادرہ کے منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی فوراً پوری کر دی جاتی مجال تھا کہ نادرہ کی کسی بات سے بھی انکار کرے سب خاندان والوں کے خدشات غلط نکلے تھے۔

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی محبت میں گم ایک خوشگوار زندگی، زندگی انجوائے کر رہی تھی یا بسر کر رہے تھے نادرہ مارے فخر غرور سب کو دیکھتی اور مسکراتی گویا بے لفظی زبان میں کہہ رہی ہو میں نا کہتی تھی شادی کے بعد میری محبت اس کو پورے کا پورا بدل دے گی۔

نادر کی بڑی دونوں بہنوں نے سکھ کر سانس لیا تھا۔ دونوں کو خوش دیکھ کر باقی خاندان والے ان دونوں سے بھی زیادہ خوش تھے اور اب دونوں جانب سے خاندان والے خوشخبری کے منتظر تھے۔ مگر شادی کو چھ ماہ ہونے کے باوجود نیا جوڑا ابھی تک خوشی کی خبر نہ دے سکا تھا۔

اور کہتے عادت بدلتی نہیں شادی کے چھ ماں بعد نادر کا رویہ بدلنے لگا۔ ایک تو نادرہ کو بہت بدلنے کی عادت تھی دوسرا اونچی آواز میں ریڈیو سننے کی شادی سے پہلے نادر کو نادرہ کا بولنا باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ خود کم ہی بولتا تھا صرف نادرہ کو سنا کرتا تھا تب اس کا دل چاہتا نادرہ بولتی رہے اور وہ سنتا رہے لیکن اب نادرہ کو مسلسل بولتے دیکھ کر وہ اس کو گھورنے لگتا ریڈیو کی آواز کم رکھنے کو کہتا تو نادرہ اس کی بات مان کر آواز آہستہ کر دیتی لیکن اب اگر اس کی پسند کا گانا آرہا ہوتا تو وہ آواز کم کرنے سے انکار کر دیتی یا پھر بھی کبھار نادر کو خود کو گھورنے پر ٹوکتی تو وہ گالیاں دینے لگتا یہ دیکھ کر نادرہ کو بھی غصہ آجاتا وہ بھلا کب کسی کو خاطر میں لاتی تھی۔ سو اس نے بھی آہستہ آہستہ زبان چلانی شروع کر دی اور نادر کہاں ڈرنے والا تھا۔ یوں بھی اب وہ محبوبہ نہیں بیوی تھی نادرہ کی زبان بازی پر نادر کا ہاتھ کبھی کبھی اٹھ جاتا مگر ہوتا ہمیشہ یہ کہ مارنے کے بعد وہ خود ہی رات ہونے پر اس کو منا لیتا کبھی باتوں سے کبھی ہاتھ جوڑ کر اس کو ہاتھ جوڑتے دیکھ کر نادرہ ساری تکلیف بھول کر ہنس پڑتی اور پھر اس کی بانہوں کے حصار میں جاتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

یونہی ہنستے جھگڑتے شادی کو ایک برس بیت گیا۔ اس ایک برس میں گھر کے اندر یا روم کے اندر جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی خاندان والوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ نادرہ سب کے سامنے خاص کر اپنے گھر والوں کے سامنے نادر کی تعریف ہی کرتی تھی اور نادر نے بھی ابھی تک کسی کے سامنے اس کو اف تک بھی نہ کہا تھا۔

البتہ گھر کے اندر نادر کی ماں جانتی تھی کہ نادر بدل رہا ہے نادرہ کی پٹائی کا بھی ان کو پتا تھا مگر وہ اپنا منہ بند ہی رکھتی تھیں کہ ان کی دو بیٹیاں دیور کے گھر تھیں ہاں کفارے کے طور پر یا بیٹیوں کے سکون کے لیے انہوں نے ابھی تک نادرہ کو گھر کے کام پر نہیں لگایا تھا۔ گھر کا کام عورت کرنے آتی تھی یعنی صفائی وغیرہ کھانا وہ خود پکاتی تھی اور برتن وغیرہ بھی خود ہی دھولیا کرتی تھی۔ نادرہ کی وہ پہل والی بے فکر زندگی تھی پکا پکایا مل رہا تھا۔ سارا دن کھاتی پیتی یا پھر ریڈیو سنتی۔

شادی کے دوسرے سال نادر حد سے زیادہ بدل چکا تھا۔ اب وہ نادرہ کے لیے بھی پہلے والا نادر بن چکا تھا۔ نادرہ کی خصوصی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ غصے میں ہر چھوٹی بڑی بات پر نادرہ پر ہاتھ اٹھانا اب معمول بن چکا تھا۔ گو کہ نادرہ خود بھی غصے والی تھی مگر کیا کرتی مرد تو مرد ہی ہوتا ہے اور پھر وہ شوہر بھی تھا۔ وہ اس کو مار تو نہیں سکتی تھی ہاں اس کے خراب رویئے سے تنگ آکر جب پہلی بار نادرہ نے ماں باپ بھائیوں سے شکایت کی تو انہوں نے بے رخی سے صاف جواب دیتے ہوئے کہا یہ تمہاری خواہش تھی اب خود ہی بھگتو ہم اس کے منہ لگ کر بے عزت نہیں ہونا چاہتے۔

اور نادرہ مایوس سی گھر واپس آگئی مگر جتنی غصے والی وہ تھی اب اس کا جواب دینے لگا تھا لیکن جب ماں باپ بھائیوں نے ہی تعاون کرنے کو تیار نہ تھے تو صبر کرنا مجبوری تھی مگر صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کل رات بھی معمولی بات پر نادر نے اس کو بہت بے رحمی سے مارا تھا یہی وجہ ہے صبح نادر کے گھر سے نکلتے تائی سے یہ کہتے گھر سے نکل آئی کہ بہت عزت بنائی اور رکھی میں نے نادر کی لیکن اب یہ بندہ مزید عزت کے قابل نہیں رہا دیکھو کیا مزہ چکھاتی اس کو اپنے بھائیوں سے کیسا سیدھا کرواتی ہوں۔ پھر وہ ماں کے گھر آئی۔ نادرہ سیدھی ان کی جانب آئی اور نادرہ کا سارا غصہ ماں پر نکلتے ہوئے بولی۔

''ماں لیا نادر کے ساتھ میری خواہش یا غلطی تھی لیکن آپ لوگ کیا اس کو بلا کر سمجھا بھی نہیں سکتے آئے دن مجھے مارتا بھی ہے۔'' وہ روتے ہوئے قمیص اٹھا کر ماں کو اپنا نیلا بدن دکھانے لگی پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے چیخ کر بولی۔

''نکال دیں اس کی دونوں بہنوں کو بچے چھین کر اس گھر سے پھر دیکھتی ہوں کیسے سیدھا نہیں ہوتا، عقل ٹھکانے آتی ہے یا نہیں لاوارث ہوں میں مر گیا میرا باپ بھائی وہ جانور سمجھ کر مجھے مارتا ہے۔'' بات ختم کر کے وہ روتی رہی کہ سارا بدن مارے سے نا صرف نیلا پڑ گیا تھا بلکہ شدید درد کر رہا تھا۔ ماں آخر ماں تھی بیٹی کا نیلا بدن دیکھ کر تڑپ اٹھی اور مارے غصے کے نادر کی دونوں بہنوں کو آواز دے کر کہا۔

''ادھر آؤ اور دیکھو ذرا میری لاڈلی بیٹی کا کیا حشر کیا ہے تمہارے بے غیرت بھائی نے۔'' دونوں بہنیں دوڑی دوڑی آئیں نادرہ کا نیلا بدن دیکھ کر پھر چپ سے کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں وہ شروع ہی سے ایسا ہے اس لئے نادرہ کو سمجھاتے تھے نادر سے شادی نہ کرے آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا اس میں ہمارا کیا قصور۔''

''وہ شروع سے ایسا ہے تو اب نہیں رہے گا جب دو دو بہنیں اجڑ کر گھر بیٹھیں گی تو ہوش ٹھکانے آ جائے گا۔'' انہوں نے بہوؤں کو گھورتے ہوئے سفا کی سے کہا، پھر نادرہ کو تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''گھبراؤ مت ابھی تمہاری ماں زندہ ہے آنے دو اپنے باپ اور بھائیوں کو پھر دیکھو میں کیسے اس کا غصہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کرواتی ہوں حیرت ہے تمہاری ساس نے بھی بیٹے کی اس مار کٹائی کا کبھی ذکر نہیں کیا، بہو کو مار پڑتی تھی نہ اس

لئے بیٹی ہوتی تو پتا کیا کرتی بڑی ہوشیار عورت ہے یہ تمہاری ساس بھی۔" انہوں نے زندگی میں پہلی بار جٹھانی کے لئے سخت زبان استعمال کی تب نادرہ نے ساس کی عزت رکھتے ہوئے کہا۔

سب کچھ بند کمرے میں ہوتا تھا تائی کو کچھ پتا نہیں ویسے بھی ان کا کمرہ ہمارے کمرے سے کافی دور ہے اور نہ ہی میں نے ان کو کبھی کچھ بتایا انہوں نے تو ابھی تک مجھے کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیا، خود پکا کر مجھے دیتی ہیں یہ سن کر نادرہ کی ماں خاموش ہوگئی۔

تاہم نادر پر ان کو شدید غصہ آ رہا تھا بلکہ ان کا جی چاہ رہا تھا ابھی خود جائیں اور مار مار کر نادر کا حلیہ بگاڑ دیں مگر وہ شوہر اور بیٹوں کے آنے کا انتظار کرنا چاہتی تھی اب انہوں نے نادر کو سبق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ادھر نادر کی دونوں بہنیں فکر مند اور پریشان تھیں جانتی تھیں بہن کو اس حلیے میں دیکھ کر خود ان کے شوہر نہیں تو بچپن کی طرح چھوٹے تینوں بھائی لازمی غصے میں آئیں گے کہ وہ بہرحال ان کی لاڈلی بہن تھی ان کو اپنی ماں پر بھی غصہ آیا وہ کہاں ہوتی ہیں جب نادر مارتا ہے وہ نادر کو روک نہیں سکتی ہیں تو ظلم کسی عورت کو ایسی بے رحمی سے مارنا مگر وہ کیا کر سکتی تھیں، بھائی کے آنے تک نادرہ ماں کے کمرے میں رہی۔

اور پھر شام ہونے پر باپ بھائی بھی گھر آ گئے ماں نادرہ کو چھوڑ کر باہر بڑے صحن میں آ بیٹھی تھیں جہاں بیٹوں نے شام کو ان کے پاس آ کر بیٹھنا ہوتا تھا اور وہیں پر وہ کھانا بھی کھاتے تھے آج ماں اس لئے باہر آ بیٹھی کے بیویاں شوہروں کے کان نہ بھریں کھانا سب نے سکون سے کھایا بچوں کے بارے میں پہلے ہی بہوؤں کو کہہ چکی تھیں کہ مردوں کے گھر آنے سے پہلے ان کے کمروں میں بھیج دینا کہ وہ بچوں کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی تھیں اور بہوؤں کی کیا مجال تھی جو ان کی بات سے انکار کرتی کھانے کے بعد جب چائے بھی سب پی چکے تو انہوں نے نادرہ کے بارے میں بات کی بلکہ نادر نے اب تک جو کچھ نادرہ سے کہا تھا اور جو مارتا آیا تھا وہ سب بڑھا چڑھا کر بتایا باپ اور بھائیوں کو جوش دلانے کے لئے بتا دیا۔

چند پل تو سب چپ رہے کہ باپ ان کے درمیان فیصلہ کرنے کو موجود تھا اور پھر باپ ہی بولا تھا۔

"اس لئے میں تمہیں کہتا تھا نادرہ کو سمجھاؤ نادر جانور ہے نہ ہی وہ کسی کے کہنے میں ہے جو اس کو سمجھا سکے اہم بات یہ اپنی عزت کے علاوہ وہ کسی کو عزت کے قابل نہیں سمجھتا اب بتاؤ ہم کیا کریں۔"

"بھیجو اس کی دونوں بہنوں کو اس کے گھر پھر دیکھو عقل ٹھکانے آتی ہے یا نہیں۔" نادرہ کی ماں نے غصے سے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو ماں ہم اپنے اپنے بچوں کی ماؤں کو کیسے گھر سے نکال سکتے ہیں۔" باپ کے بولنے سے پہلے ہی بڑے بیٹے نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"تو کیا وہ یونہی میری پھول سی بیٹی کو مارتا رہے گا۔" ماں نے گھور کر اس کو دیکھا۔

"غلطی بھی تو نادرہ کی اپنی ہے۔" بڑے بیٹے نے ہی پھر کہا۔

نادرہ جو اندر بیٹھی ساری بات چیت سن رہی تھی باہر نکل آئی اور ہمیشہ کی طرح بھائیوں کو گھورتے ہوئے پورے رعب سے بولی۔

"غلطی میری ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نادر سے پوچھ کچھ بھی ناں کریں اس کو سمجھائیں بھی نہ اور وہ مجھے جانور سمجھ کر مار مار کر مار ڈالے لاوارث ہوں میں مر گئے ہیں میرے سارے خاندان والے بھائیوں کو اپنی بیویوں کی فکر ہے تو کیا، باپ زندہ ہے ابھی میرا فیصلہ کرنے کو نکال دیں، ابھی اسی وقت دونوں بہنوں کو دیکھو کیسے سیدھا نہیں ہوتا ہے۔" بات ختم کر کے وہ رونے لگی تینوں چھوٹے بھائی تڑپ کر اٹھے بہن کا حلیہ دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھا، باپ نے بھی بیٹی کو دیکھا تو بے چین ہو گیا تب تینوں چھوٹے بھائیوں نے بہن کو گلے لگاتے ہوئے باپ سے کہا۔

"ابا نادر کے مسئلے کا حل آپ کو سوچنا ہو گا اور ابھی فیصلہ کرنا ہو گا، نادرہ لاوارث نہیں کہ وہ جب چاہے اس کو جانور سمجھ کر مارتا رہے گا ہاتھ توڑ دیں گے ہم اس بے غیرت کا۔"

"حل تو یہی ہے کہ نادر کی دونوں بہنوں کو گھر سے نکال دیا جائے۔" ماں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اب کے دونوں بڑے بیٹے چپ رہے اور باپ نے اٹھ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میری بیٹی لاوارث نہیں۔"

"لیکن وہ دونوں بھی میری ہی بیٹیاں ہیں جن کو گھر سے نکالنا ظلم ہے ہاں نادر کو بلا کر سمجھاتے ہیں ابھی ذرا نرمی سے نا سمجھا تو پھر کچھ سختی کرنے کا بھی سوچ لیں گے۔" پھر انہوں نے اپنے بڑے پوتے کو آواز دے کر کہا۔

"جاؤ اپنی نانی کے گھر اور نانی ماموں کو بلا کر لاؤ کہنا دادا بلا رہے ہیں فوراً آؤ۔" اور پوتا دادا جی کی بات سنتے ہی چلا گیا۔

نادر شام کو ذرا دیر سے گھر آیا تھا کہ زمینوں کے کام کے سلسلے میں وہ کل گھر سے نکلتے ہی سیدھا شہر چلا گیا تھا اب گھر آیا تو نادرہ گھر پر موجود نہیں تھی یہ حیرانی کی بات تھی جب سے شادی ہوئی نادرہ ایک رات بھی اپنے میکے نہ رہی تھی اس کی عادت تھی نادر کے کھیتوں پر جانے کے بعد ماں کے گھر جاتی اور نادر کے شام واپس آنے سے پہلے واپس آ جاتی ایک ہی گاؤں میں گھر ہونے کی وجہ سے وہ ہر دوسرے تیسرے دن ماں کے گھر چلی جاتی تھی نادر کو پہلی بار گڑبڑ کا احساس ہوا مگر مزید کچھ سوچنے سے پہلے ماں کو دیکھا جو یوں پریشان بیٹھی تھی۔

"ماں کیا ہوا؟" اس نے کاندھے سے چادر اتار کر تکیے پر رکھتے ہوئے ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کتنی بار منع کیا تھا نادرہ کو مارنا چھوڑ دو مگر تو اپنی حرکت سے باز نہ آیا اب وہی ہوا جس کا پہلے سے ڈر تھا تمہارے جاتے ہی وہ گھر سے چلی گئی تھی اور کہہ گئی تھی دیکھو اب میں نادر کو اپنے بھائیوں سے کیسا سیدھا کرواتی ہوں مزہ چکھاتی ہوں۔" ماں نے ساری بات بتا دی۔

"اس کی یہ مجال۔" نادر نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے پہلے پوری بات تو سن لو۔" ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو پھر بٹھا لیا اور بولی۔

"بیٹا ابھی تمہارے چچا نے تمہیں بلا بھیجا ہے کہ فوراً آؤ سنو بیٹا یہ وقت جوش کا نہیں ہوش میں رہنے کا ہے کہ تمہاری دو بہنیں ان کے گھر میں ہیں۔"

"ماں میری بہنوں کو وہ کچھ کہہ کر دیکھیں گردن کاٹ دوں گا اس کے دونوں بھائیوں کی۔" وہ غرایا تو ماں نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ساری زندگی تم نے اپنی من مانی کی ہے

بس آج میری بات مان لو وہ لوگ جو بھی کہیں چپ کر کے سن لینا بس کسی طرح نادرہ کو گھر لے آؤ پھر میں سب سنبھال لوں گی اس کو سمجھا لوں گی۔" ماں کی بات سن کر نادر دھاڑا۔

"چپ چاپ ان کتوں کی باتیں سن لوں کیوں زبان کاٹ دونگا کسی نے مجھ سے کچھ کہا تو۔"

"بیٹا میرے لئے اپنی بہنوں کے لئے بس آج زبان منہ کے اندر رکھنا۔" ماں نے روتے ہوئے اٹھ کر اس کے پیر پکڑ لئے۔

نادر نے پاؤں پیچھے کرتے ہوئے کہا پھر چادر اٹھا کر کاندھے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"آؤ اب چلیں۔" اور ماں بھی فوراً اٹھ گئی۔

وہ دیور کے گھر آئی تو سب صحن میں بچھی چارپائیوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے نادر ماں کے ساتھ ان سب کو سلام کرتے ہوئے چچا کے پاس ان کی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا سلام کرنے کے لئے بھی ماں نے راستے میں سمجھایا تھا بیٹھنے کے بعد اس نے سب پر ایک نظر ڈالی چچی کے علاوہ گھر کی کوئی اور عورت وہاں موجود نہیں تھی نادرہ کے سارے بھائی موجود تھے اور سب نادر کو گھورنے والے انداز میں دیکھ رہے تھے۔

"حاجرہ بیٹا اپنی تائی اور نادر کے لئے کھانا لاؤ۔" چچا نے ان کے بیٹھتے ہی آواز دی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں۔" نادر نے لہجے کو ہر ممکن طریقے سے نرم رکھنے کی کوشش کی محض ماں کی وجہ سے۔

"دودھ یا چائے۔" چچا نے پھر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں چچا چائے کھانے کے بعد پی کر آیا ہوں اور دودھ رات کو سونے سے پہلے پیتا ہوں۔" نادر نے پہلے والے لہجے میں کہا تو چچا نے بغور اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نادرہ سے شادی تمہاری اور اس کی پسند پر ہوئی تھی اب یہ کیا شروع کر دیا ہے تم نے۔"

"کیا شروع کر دیا ہے میں نے۔" نادر نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

"تم اس پر ہاتھ اٹھاتے ہو تو بے رحمی کی حد کر دیتے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں اتنی جلدی اکتا گئے تم نادرہ سے، انسان ہے وہ جانور نہیں کہ جب جی چاہے مار کٹائی شروع کر دو۔" جواب میں نادر خاموش رہا تو چچا نے کہا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے وہ تمہاری بیوی ہے تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔" نادر تو پھر چپ رہا مگر ماں نے کہا۔

"مجھے تو یہاں آ کر پتہ چلا نادر، نادرہ پر ہاتھ اٹھاتا ہے اب دیکھو گھر جا کر اس کی خبر لیتی ہوں بلاؤ میری بیٹی کو میں ابھی اس کو گھر لے جا کر پوچھتی ہوں اس نے یہ سب مجھے کیوں نا بتایا۔"

"وہ ابھی ادھر ہی رہے گی۔" نادرہ کی ماں نے فوراً کہا۔

"نہیں وہ ادھر نہیں رہے گی میں اس کو ساتھ لے کر جاؤں گا بلائیں اس کو۔" نادر نے کہا اور جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

انکار کی جرأت کسی میں تھی چچا نے بھتیجے کا موڈ دیکھتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"بلاؤ نادرہ کو۔" ماں کے بلانے پر نادرہ آئی تو نادر نے چچا سے جانے کی اجازت چاہی چچا نے اجازت دے دی اور جب وہ جانے لگے تو نادرہ کے تینوں چھوٹے بھائی نادر کے قریب آئے نادرہ کو سر پر پیار دیا پھر نادر سے مخاطب ہوئے۔

"جو ہو چکا سو ہو چکا آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اگر آئندہ تم نے نادرہ پر ہاتھ اٹھایا تو خود تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔" بھائیوں کی بات پر نادرہ نے ہمک کر نادر کو دیکھا۔

نادر نے بمشکل ضبط کیا کہ ماں سے وعدہ کر چکا تھا پھر چچا سے اجازت لے کر جلدی سے باہر نکل آیا جسم میں خون پیٹرول میں بدل گیا تھا پیچھے پیچھے ماں اور نادرہ بھی نکل آئیں نادرہ گو کہ ابھی آنا نہیں چاہتی تھی مگر ماں کے سمجھانے پر آئی تھی راستے میں تینوں میں کوئی بات نہ ہوئی آگے آگے تیز تیز نادر چل رہا تھا اور پیچھے پیچھے وہ دونوں ساس بہو چل کر بھاگتے ہوئے نادر کا ساتھ دے رہیں تھی اور وہ پھر اپنے گھر پہنچ گئے، نادرہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی نادر کو ماں نے روک لیا پھر کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا تمہارا چچا اچھا ہے جس نے تمہیں کچھ نہیں کہا تم بھی اب اپنے چچا کی عزت کا خیال رکھنا اب نادرہ پر ہاتھ مت اٹھانا عورت پر ہاتھ اٹھانا ویسے بھی کوئی اچھی بات نہیں۔" نادر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا ماں کو کوئی جواب نہ دیا تاہم اس کی پیشانی ہمیشہ کی طرح شکن آلود ہو چکی تھی کھانا کھانے کے بعد وہ تب تک وہیں بیٹھا رہا جب تک ماں سونے کے لئے اپنے روم میں نہیں چلی گئی ماں کے جانے کے کافی دیر بعد وہ اٹھا اور پھر اپنے روم میں آ گیا موڈ تباہ کن حد تک خراب تھا۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو نادرہ بستر پر لیٹنے کی بجائے صوفے پر بیٹھی ریڈیو سن رہی تھی یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں نادر نے چادر اتار کر الماری میں رکھی پھر وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"تم اپنی ماں کے گھر کیا لینے گئی تھی۔"

"تم نے جو مجھے مارا تھا اس لئے۔" نادرہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"میں نے تمہیں پہلی بار تو نہیں مارا تھا۔" نادر نے پھر وہیں سے پوچھا۔

"ہاں تم نے مجھے پہلی بار تو نہیں آخری بار مارا تھا اس لئے گئی تمہیں یہ بتانے کہ میں لاوارث نہیں......" نادر کو مارے غرور کے دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا دیکھا پھر اور یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں نے آخری بار مارا تھا۔" اب وہ نادرہ کے سر پر آن کھڑا ہوا تو نادرہ بھی فوراً کھڑی ہو گئی تینوں چھوٹے بھائیوں کے الفاظ یاد تھے جو انہوں نے باہر نکلتے ہوئے نادر سے کہے، اس لئے نادر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے خوفی سے بولی۔

"مجھے ہاتھ نہ لگانا نادر ورنہ میرے بھائی......" بات ادھوری رہی نادر کا پڑنے والا تھپڑ کچھ ایسا ہی تھا کہ نادرہ دوبارہ صوفے پر جا گری اس کے ساتھ ہی نادر غرایا۔

"میں ان کتے کے پتروں سے ڈرتا ہوں جو وہ جیسا کہیں گے ویسا ہی کرونگا۔" وہ غصے میں چچا کو بھی گالی دے گیا، نادرہ اچھل کر دوبارہ اٹھی وہ چلائی۔

"نادر مجھے مارنے کا نتیجہ اس بار بہت برا ہو گا تمہاری دونوں بہنیں روئے۔" "تو میری ماں جیسی بہنوں کا نام لے گی نکالیں وہ ذرا میری بہنوں کو گھر سے تیرا سارا خاندان قتل کر کے بہنوں کے گھر اجاڑ کر نہیں ان کو بیوہ بنا کر اپنے اس گھر میں رکھوں گا۔" اس نے مزید ایک تھپڑ نادرہ کے منہ پر رسید کیا اور وہ بجائے ڈرنے کے غرائی۔

"صبح ہونے دو نادر دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرواتی ہوں۔"

"صبح ہو گی تو تب نہ۔" نادر نے اس کو بالوں سے پکڑا پھر بھول گیا کہ وہ بیوی کو مار رہا ہے یا جانور کو زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کو

دھمکی دی تھی کہ نادرہ کو مارنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے اس نے خوب جی بھر کر نادرہ کو مارا خاموش نادرہ بھی نہ رہی نادر کا ہاتھ چلتا رہا اور نادرہ کی زبان جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو جا کر بستر پر بیٹھ گیا پھر روتی ہوئی نادرہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"اب غور سے سنو صبح تم اپنی ماں کے گھر گئی تو میں نے جو کہا ہے وہی کروں گا نا صرف تمہارے بھائیوں بلکہ ساتھ تمہیں بھی قتل کر دوں گا نادر جو کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے اس لئے کہ نادر ڈرنے والے دن پیدا نہیں ہوا۔" پھر وہ بستر پر لیٹا اور سو بھی گیا مگر نادرہ مارے غصے اور انتقام کے لئے جاگتی رہی روتی رہی۔

اب وہ خود بھی اپنی ماں کے گھر جا کر ان کی موت یا تباہی کا سامان کرنا نہیں چاہتی تھی جانتی تھی نادر نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کرے گا بھی مگر نادر کو بھی اب معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا گو زبان نادرہ نے بھی خوب جی بھر کر چلائی تھی کہ وہ بھی ڈرنے والے دن پیدا ہی نہیں ہوئی تھی مگر مارتے ہوئے بھی نادر نے ظلم کی حد کر دی تھی، مارتے ہوئے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی تھی کہاں کہاں لگ رہی ہے وہ تو سو گیا، مگر نادرہ جاگتی رہی سوچتی رہی۔

وہ کئی ہفتوں ریڈیو پر عورتیں کے حقوق کے حوالے سے ایک پروگرام سن رہی تھی جس پروگرام کے آغاز پر میزبان کہتی۔

"یہ پروگرام عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک عورتوں پر جنسی تشدد عورتوں کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرنے اور عورتوں کے دیگر مسائل پر مشورہ رہنے کے لئے ہوتا تھا اور نامناسب حالات میں مدد حاصل کرنے کے لئے ہوتا تھا۔" اور نامناسب حالات میں پروگرام کے آخر میں دو تین بار ایک پتہ لکھوایا جاتا تھا، فوری طور پر رابطہ کرنے کے لئے فون نمبر بھی بتایا جاتا نادرہ نے نادر کے رویئے سے تنگ آ کر ایک دن یونہی فون نمبر اور پتہ لکھ کر رکھ لیا تھا کہ نادر نے ماں سے ڈرتا تھا اور نہ بڑی بہنوں سے بھائی کوئی تھا نہیں اور باپ فوت ہو چکا تھا نا ہی وہ اب نادر کے رعب میں آتا تھا ماں باپ کے گھر وہ جانا نہیں چاہتی ہوں لیکن اب جا کر بھی نتیجہ دیکھ لیا تھا۔

اب لے دے کر یہی پروگرام والے نادر کو سمجھا سکتے تھے سیدھی راہ پر لا سکتے تھے بہت سوچنے کے بعد نادرہ نے پروگرام کرنے والوں سے مدد حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔

صبح ناشتہ کرنے کے بعد کھیتوں پر جانے سے پہلے نادر کا دل یہ دیکھ کر نرم ہوا مگر کل رات جو اس کے بھائیوں نے کہا تھا وہ بھولا نہیں تھا اس لئے جھک کر اس کا کاندھا پکڑ کر ہلایا نادرہ نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا نادر نے کہا۔

"میں کھیتوں پر جا رہا ہوں ماں کے گھر جانے سے پہلے اپنے اور ان کے انجام پر غور کر لینا اور بہت آرام کر لیا تم اب اٹھو اور گھر کے کام کاج کرو کھانا وغیرہ خود پکانا میری ماں تمہاری نوکر نہیں تمہیں پکا پکا کر کھلاتی رہے۔" بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا اور نادرہ پوری کی پوری ہوش میں آ گئی یعنی اس کو اپنے رات والے رویئے پر ذرا سا بھی افسوس نہیں اب سزا دینا بے حد ضروری تھا وہ فوراً اٹھ بیٹھی اور رات پروگرام طے کیا تھا اسی پر ایک بار پھر غور کرنے لگی۔

اور پھر نادر کے کام پر جاتے ہی وہ اسی حلیے میں چادر اوڑھ کر گھر سے نکل آئی چولہے کے پاس بیٹھی تائی جو رات والی مار سے بے خبر تھی

ناشتے کا پوچھتے ہوئے یہ بھی پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ سنی ان سنی کر کے تیزی سے باہر نکل آئی نادر کو سمجھانا تو دور کی بات انہوں نے مارتے ہوئے نادر کا کبھی ہاتھ بھی نہ پکڑا تھا شروع میں نادرہ نے ایک دو بار نادر کے سخت رویئے کی شکایت کی تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی۔

"دھی تجھے تو اچھی طرح پتا تھا وہ بچپن ہی سے ایسا ہے میں اس کو کچھ بولی تو وہ تمہارے مجھے بھی برا بھلا کہے گا اس لئے مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

اس کے بعد اس نے ماں باپ کے گھر جا کر بھی دیکھ لیا تھا بچہ کوئی تھا نہیں جو دل بہلاتا اس وقت وہ صرف یہ چاہتی تھی جس طرح رات نادر نے اس کو مارا ہے کوئی نادر کو بھی مار مار کر اس کا یہ غصہ ٹھنڈا کر دے اس لئے وہ گھر سے نکل آئی، این جی او کے دفتر جانے کے لئے، نادر سے انتقام لینے کے لئے۔

☆☆☆

نادرہ کا گاؤں شہر کے قریب ہی تھا وہ بس میں بیٹھ کر شہر آئی اور بڑی مشکلوں اور کوشش سے بالآخر اپنی مطلوبہ جگہ آ پہنچی کہ وہ بہر حال ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی یہ ایک پلازہ تھا جس کے سیکنڈ فلور پر ایک بڑے سے روم کے باہر وہ نمبر والے نام لکھا تھا جو پروگرام میں بتایا جاتا تھا۔

نادرہ کچھ دیر کمرے کے باہر کھڑی سوچتی رہی پہلی بار کسی ایسی جگہ آئی تھی وہ بھی بہت مجبور ہو کر گو کہ وہ بہت بہادر تھی مگر اس وقت اندر جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی پھر اس نے سر جھٹک کر سوچا اب جب یہاں تک آ گئی ہوں تو ڈرنا کیسا یہ سوچتے ہی اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

سامنے ہی بڑی سی میز کے پیچھے ایک لڑکی بیٹھی تھی میز پر بہت سارے کاغذات اور فون کا سیٹ رکھا تھا ایک جانب دیوار کے ساتھ صوفہ سیٹ لگا تھا دوسری جانب ٹی وی ٹرالی پر ٹی وی بھی رکھا تھا روم خاصا بڑا تھا اور سارے کمرے میں نہ صرف کارپٹ بچھا تھا بلکہ درمیان میں کارپٹ پر ریڈ قالین کا ایک ٹکڑا بھی پڑا تھا لڑکی کے علاوہ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا یہ دیکھ کر نادرہ کو حوصلہ ہوا۔

کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ ہمت کر کے کمرے میں داخل ہو گئی پھر سیدھی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھی لڑکی کی جانب آئی اور بڑے ادب سے اس کو سلام کیا تھا لڑکی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر نادرہ کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے نادرہ سے اس کی سٹوری پوچھی، نادرہ، نادر سے پٹی ہوئی تھی رات جو مار کھائی تھی وہ بھی چہرے پر نمایاں تھی یہی وجہ ہے نادرہ نے خوب نمک مرچ لگا کر نادر کے ظلم کے قصے بیان کیے اور آخر میں کہا۔

"وہ یہاں مدد کے لئے آئی ہے نادر کو یہاں بلا کر ذرا ٹھیک طریقے سے سمجھایا جائے بلکہ اگر ہو سکے تو ہلکی پھلکی چھینٹی بھی لگائی جائے تا کہ وہ آئندہ مجھ پر ہاتھ نہ اٹھا سکے۔" نادرہ کے خاموش ہوتے ہی سامنے بیٹھی لڑکی نے تیز لہجے میں کہا۔

"ارے اٹھو اٹھو یہاں سے کہاں پھنسے آ گئی ہو میری بہن۔"

"کیا مطلب؟" نادرہ نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا اچھا بیٹھو اور غور سے سنو" لڑکی نے اس کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، کچھ دیر سوچتی رہی

جیسے کوئی فیصلہ کر رہی ہو پھر بولی۔
''بی بی کہاں کی مدد اور کہاں کا مشورہ یہ پروگرام عورتوں کو دھندے پر لگوانے والے دلال لوگ کرواتے ہیں یہاں مدد اور مشورے لینے آنے والی ہر لڑکی باقی کی تمام عمر عزت دار لوگوں میں بیٹھنے کے بھی قابل نہیں رہتی کسی اور کی نہیں مجھ سے میری ہی کہانی سنو۔''
''دو بچے تھے میرے شوہر اچھا تھا مگر بڑی فیملی تھی اور وہ بڑا بیٹا تھا باپ فوت ہو چکا تھا، اس لئے سارے خاندان کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری بھی تنخواہ گو کہ اچھی تھی مگر وہ مجھے برائے نام پاکٹ منی دیتا تھا کہ اسے ماں کو بھی گھر کے خرچ کے لئے پیسے دینے ہوتے تھے اور چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی ضرورت پوری کرنی ہوتی تھی دیکھا جائے تو سب ٹھیک ہی تھا کہ ادھر ہمارے گھر یہاں اکثر گھروں میں ایسا ہی تو ہوتا ہے مگر میری اپنی ہی ماں نے میرے کان بھرے کہ اپنے شوہر سے وہ گھر کے اندر رہ کر ہی سہی تمہیں الگ خرچا ڈال کر دے تم اپنی روٹی الگ پکاؤ گی اور میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایسا ہی کیا اور شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے وہ تھا تو اچھا مگر الگ کھانا پکانے سے انکار کر دیا مگر میں نے تقاضہ نہ چھوڑا۔''
''میں نے اپنے اچھے شوہر کا ہی نہیں اپنے سسرال والوں کا بھی جینا حرام کر دیا، ایسے حالات میں ہی میں جس بیوٹی پارلر وغیرہ پر فیشل وغیرہ کروانے جاتی تھی مجھے ان لوگوں سے مدد اور مشورے کے لئے بھیجا یہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ انہیں دلال لوگوں کی اپنی لڑکی تھی جس نے میرے جیسی بے وقوف لڑکیوں کو پھنسانے کے لئے پارلر کھول رکھا تھا۔''
''اور یہاں آنے کے بعد شوہر تو کیا میرا اپنا خاندان بھی چھوٹ چکا ہے کہ ان لوگوں نے میرے شوہر کو سمجھانے کی بجائے مزید مجھ سے متنفر کر دیا اور وہ جو بہت اچھا تھا اس نے مجھے طلاق دے دی پھر یہ لوگ میرے پیچھے ایسے لگے کہ مجھے کال گرل بنا کر ہی دم لیا اب بچوں کی شکل دیکھنے کو بھی ترستی ہوں اور سوچتی ہوں شوہر بھی اچھا تھا اور اس کے گھر والے بھی بس میں ہی ماں کے کہنے میں آ کر بہکی اور اب نتیجہ کی صورت میں یہاں بیٹھی ہوں جس کی وجہ سے یہ سب ہوا وہ بھی نہ رہی طلاق سے پہلے ہی مر گئی۔'' وہ خاموش ہو کر کچھ دیر خلا میں گھورتی رہی پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی۔
''یاد رکھو عورت کے حقوق گھر کے اندر ہیں گھر کے باہر نہیں شوہر کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لئے دوسروں کے پاس جانے والیاں اپنی عزت بھی کھو دیتی ہیں فوراً اپنے گھر اپنے شوہر کے پاس واپس جاؤ اور بہتر ہے کہ اپنی اس گز بھر کی زبان کنٹرول کرو کہ کوئی بھی مرد زبان دراز عورت کو پسند نہیں کرتا بہتر ہے کہ اپنے گھر اور ادھر ادھر جانے کی بجائے محبت سے اس کو سمجھاؤ، یاد رکھو مرد کتنا بھی کرخت مزاج یا وحشی ہو نرمی اور محبت سے اس کو مات دی جا سکتی ہے کہ عورت مرد کی محبت ہی نہیں ضرورت بھی ہوتی ہے اور سنو عورت کی عزت کا سچا محافظ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے اب تم یہاں آ ہی گئی ہو تو میں تمہیں بتاؤں جتنی بھی این جی او یا اور ادارے خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں ان میں اکثریت ان سادا عورتوں کو گھروں سے نکال کر بازار میں بٹھانے والوں کی ہوتی ہے ذرا خود ہی اپنی عقل سے سوچو یہ لوگ تمہارے کیا لگتے ہیں جو تمہارے حقوق کی بات کریں تم سے ہمدردی کریں ماموں ہیں تمہارے چچا تائے ہیں تمہارے، یہ بھی

درست ہے کہ کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو تھوڑا بہت صحیح کام بھی کرتے ہیں لیکن وہ بھی کبھی کبھار بات سنبھالنے کی بجائے بات بگاڑ دیتے ہیں محض غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے کے لئے عورت محض ایک سانحہ کی وجہ سے اپنے گاؤں میں اپلے تھاپتے تھاپتے فرانس اور امریکہ جا پہنچی اس کا وہاں کیا کام تھا یہ این جی او تھی جو لے گئی اور مختار مائی نے کتاب بھی لکھ ڈالی حالانکہ وہ چٹی ان پڑھ ہے مختار مائی کی شہرت اور دولت دیکھ کر اکثر لڑکیاں سوچتی ہیں کاش ہی سانحہ ان کے ساتھ پیش آتا، تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہارا سامنا مجھ سے ہو گیا میری جگہ کوئی اور ہوتی جو وہ تمہیں گھر واپس نہ جانے دیتے شکر کر یہاں میں ہوں اس لئے تمہاری عزت بچ گئی مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں یہاں آنے والی ہر لڑکی کو بچا لیتی ہوں میں نہیں چاہتی کہ جو میرے ساتھ ہوا ہے اس کے ساتھ بھی ہو کہ گھر گھر ہوتا ہے مگر میں ادھر کم کم ہی آتی ہوں شکر کرو چوکیدار بھی نہیں ہے اب اٹھو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ مڑ کر بھی مت دیکھنا اب اگر اللہ نے تمہاری عزت بچا دی ہے تو بچا کر ہی رکھنا۔" پھر وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اور نادرہ یوں اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کرنٹ لگا ہو پھر مارے خوف اور گھبراہٹ کے وہ بھاگتی ہوئی دفتر سے باہر نکل آئی نادر نے کتنا مارا اور کیسے مارا وہ سب بھول چکی تھی وہ تو اب صرف یہ چاہتی تھی کہ جیسے بھی ہو وہ جلد از جلد اپنے نادر کے پاس واپس چلی جائے کہ وہ ایک شریف خاندان کی شریف بیٹی تھی۔

☆☆☆

شام کے قریب وہ گاؤں والے اسٹاپ پر اتری تو وہاں نادر کو کھڑا دیکھ کر بجائے غصہ کے اس کی جان میں جان آئی ورنہ سارا راستہ وہ ڈرتی ہوئی آئی تھی کہ کہیں وہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے نہ آ رہے ہوں وہ رات والی مار بھول کر خود نادر کی جانب بڑھی تو نادر بھی بے تابی سے اس کی طرف بڑھا پھر اس کا ہاتھ تھام کر پریشان لہجے میں پوچھا۔

"نادرہ کہاں چلی گئی تھی تو کھیتوں پر جا کر مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا میں دوپہر میں تجھے منانے گھر آیا تو ماں نے بتایا تم بغیر کچھ بتائے گھر سے چلی گئی ہو تمہاری تلاش میں نکلا ہی تھا کہ چچا یوسف سے سامنا ہو گیا اس نے بتایا کہ وہ تمہیں اپنے تانگے پر اسٹاپ پر چھوڑ کر آیا تھا تب سے یہاں تمہارے انتظار میں کھڑا ہوں تمہارے لئے کتنا پریشان تھا بتا نہیں سکتا کہاں گئی تھی تم میں تو ڈر گیا تھا یہ سوچ کر کہیں تم اپنے ساتھ کچھ غلط نہ کر بیٹھو۔"

اگرچہ نادرہ نے نادر کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا مگر اپنا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھڑایا تھا، کیونکہ ایسا کر کے اس کو گہرا سکون مل رہا تھا، اللہ نے بڑا اکرم کیا کہ عزت بچ گئی تھی اگر وہ لڑکی نہ ہوتی وہاں تو پھر کیا ہوتا وہی جو اس لڑکی کے ساتھ ہوا تھا شکاری کتے اس کو بھی شکار کر لیتے، نادر اس کو ساتھ لئے تانگے پر بیٹھا اور پھر دونوں گھر کے سامنے آ کر اتر گئے، گھر میں داخل ہوتے روٹیاں پکاتی ہوئی پریشان سی تائی نے پوچھا۔

"کہاں چلی گئی تھی تو بغیر بتائے؟"

نادرہ کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں داخل ہوئی نادر اس کے پیچھے ہی تھا، نادرہ نے چادر اتار کر صوفے پر پھینکی اور خود بستر پر بیٹھ گئی نادر بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کو برا بھلا کہے گی اس نے دل میں طے کر لیا تھا رات جو کچھ بھی اس کے ہاتھوں

ہوا ہے اس کے بعد وہ خاموشی سے اس کی ڈانٹ سن لے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور جو ہوا وہ نادر کے لئے بے حد حیران کن تھا، اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نادرہ نے اس کے سینے لگتے ہوئے بھیگی آواز میں کہا۔

"تمہارے علاوہ کوئی مرد مجھے ہاتھ لگائے اس سے پہلے مجھے موت آ جائے عورت کے حقوق گھر کے اندر ہیں گھر کے باہر تو شکاری کتے سوار لٹیرے ہیں کتنی بڑی غلطی کرنے گئی تھی میں "اللہ نے مجھے بچا لیا۔" کہہ کر اس نے پوری سٹوری نادر کو سنا دی پھر روتے ہوئے کہا۔

"رات تم نے مارا بھی تو بہت بے رحمی سے تھا اور پھر تم نے میرا ریڈیو بھی توڑ دیا تمہیں پتا ہے نہ گانے سننے کا مجھے شوق ہے میں ریڈیو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ ٹھیک ہے کہ نادر غصے والا مزاج رکھتا تھا مگر نادرہ سے اس کو سچی محبت تھی پہلی بار اپنے سخت رویے کا احساس ہوا اور نادر نے دل سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"نادرہ اس بار معاف کر دو پھر تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں تو زندہ ہی نہ رہوں۔" یہ سنتے ہی نادرہ نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو مار لیا کرو کبھی کبھار مگر ہاتھ ہولا رکھا کرو۔" اس کی معصومانہ بات سن کر نادر نے بے ساختہ اس کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اپنے ہاتھ خود ہی توڑ دونگا اگر پھر کبھی تم پر اٹھائے دیا ریڈیو تو وہ کل ہی نیا لا دونگا۔" اچانک باہر سے آتی ماں کی آواز سن کر وہ چپ ہو گیا۔

"پتر نادرہ کو ساتھ لے کر آؤ اور دونوں کھانا کھا لو آج میں نے نادرہ کی پسند کی گوبھی گوشت پکایا ہے۔"

وہ نادرہ کے ساتھ اٹھ کر باہر آیا تو ماں دونوں کے لئے چارپائی پر کھانا رکھ چکی تھی نادرہ نے دیکھا پھر تائی سے مخاطب ہوئی۔

"تائی جی اب کھانا پکانے سے آپ کی چھٹی کل سے میں سب کام خود ہی کیا کروں گی۔" پھر نادر کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر وہ کھانا کھانے لگی جبکہ تائی حیران ہو کر اس کو دیکھ رہی تھی کہ یہ نادرہ نے کیا کہا ہے، میں نہیں جانتی تھی محبت سب کچھ منوا بھی لیتی ہے اور مان بھی لیتی ہے۔

☆☆☆

تم آخری جزیرہ ہو

ام مریم

چھبیسویں قسط کا خلاصہ

پرنیاں کے اندر جمع غصہ معاذ کے سامنے نکلتا ہے اور شدید جھگڑے اور الزام تراشی کے بعد دونوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے در آتے ہیں۔

زینب، تیمور کی وجہ سے بے حد پریشان ہے، جہان اسے حوصلہ دینے کی کوشش میں مصروف ہے مگر تب ژالے پہ ان کے تعلق کی گہرائی اور نوعیت آشکار ہو کر اسے اضطراب کا شکار کر جاتی ہے۔

معاذ اور پرنیاں کے تعلق کی سرد مہری مما پہ بھی آشکار ہوتی ہے، معاذ پرنیاں سے غفلت کی بنا پر سب سے ڈانٹ بار بار سنتا ہے۔

معاذ کی من مانی کا مظاہرہ پرنیاں کو اس سے شدید برگشتہ کرنے کا سبب بنتا ہے، وہ اس سے بیزاری کے ساتھ نفرت بھی محسوس کرتی ہے، اس کے برعکس معاذ بے حد خوش اور مطمئن ہے، مسز آفریدی کی کوشش سے ہی ژالے معاذ کی شادی میں شریک ہونے کو شاہ ہاؤس آتی ہے، تو زینب اسے دیکھ کر بے حد ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

چھبیسویں قسط

اس نے صرف یہیں پر اکتفا نہیں کیا تھا، چھری کے ساتھ دوسرے ہاتھ کی بھی کلائی کاٹنے کی کوشش کرنے لگی، شاید نہیں یقیناً وہ خود کو ہر صورت ختم کر دینے کے در پے تھی، جب تک معاذ متوجہ ہوا اور چونک کر اس تک پہنچا وہ خود کو اچھا خاصا زخمی کر چکی تھی، چھری اس سے چھینتے اس کو سنبھالتے معاذ کے اپنے حواس مختل ہو کر رہ گئے، یہ سچویشن صحیح معنوں میں اسے بوکھلا کے رکھ گئی تھی، اس کے گمان تک میں نہیں تھا پرنیاں اتنا شدید ردعمل بھی دے سکتی ہے، اس کے ہاتھوں سے چھری نکالتے چھینتے معاذ کی ہتھیلیوں پہ اچھے خاصے گہرے کٹ لگ گئے تھے، مگر اس پل اسے اپنی نہیں پرنیاں کی فکر تھی، جس کا خون تیزی سے ضائع ہو رہا تھا مگر اس کی ہسٹریائی کیفیت جوں کی توں تھی، وہ ابھی تک مچل مچل کر اس کی گرفت سے نکل رہی تھی، معاذ نے کچھ کہے بغیر اسے اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے بھینچ لیا۔

''پری...... آئی ایم ساری، آئی ایم ساری پرنیاں، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، مجھے معاف کر دوں۔'' اس کے بکھر جانے والے بالوں کو بار بار ہونٹوں سے چھوتے وہ اس بپھری ہوئی موج کی طرح بے قابو ہوئی پرنیاں پہ جھک کر سرگوشی میں بولا تھا، پرنیاں زار و قطار رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی سسک رہی تھی، وہ اسے ریلیکس کرنے کو اسے ساتھ لگائے تھپکتا رہا، پرنیاں بھی یقیناً حواسوں میں نہیں تھی، دھیرے دھیرے اس کی وحشت قرار پانے لگی تو اسے اپنی پوزیشن کا خیال آیا تھا، معاذ کو خود سے اتنا قریب پا کر وہ تڑپ کر پیچھے ہوئی اور معاذ کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیل دیا، معاذ کچھ خائف کچھ بے بس سا لگ رہا تھا جبکہ پرنیاں کے چہرے پر زردیوں کے ساتھ ہنوز کرب اور لامتناہی درد کے رنگ تھے، تاسف و ملال تھا، سسکی سی بھر کے اس کی بجائے وہ اپنی زخمی کلائی کو دیکھنے لگی تو جیسے معاذ کو اچانک ہوش آیا تھا، پرنیاں کا اب تک بے تحاشا خون ضائع ہو چکا تھا جو خطرے کا سگنل تھا، وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور پرنیاں کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پہ بٹھانا چاہا، ارادہ ٹریٹمنٹ کا ہی تھا مگر پرنیاں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی لہجہ اتنا پھیکا اور یاس زدہ تھا کہ معاذ نے ہونٹوں کو باہم بھینچ لیا۔

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے پرنیاں، بلڈنگ بہت ہو رہی ہے۔'' میڈیکل باکس کھولتے ہوئے وہ یکسر بدلتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''ایسی زندگی پہ میں موت کو ترجیح دینا چاہتی ہوں، مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ پھر رو پڑی، معاذ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کا زخمی ہاتھ زبردستی اپنے ہاتھ میں لے کر دوا لگانے لگا، پرنیاں پر نقاہت طاری ہو رہی تھی، وہ بے دم سی ہو کر یوں لیٹ گئی جیسے ساری طاقت سلب ہو گئی ہو، جبکہ معاذ تیزی سے اپنے کام میں مشغول تھا۔

☆☆☆

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے بیٹے؟''

پپا خود چل کر اس کے کمرے میں آئے تھے، معاذ نے محتاط سی نگاہ پرنیاں پہ ڈالی، خون آلود لباس تبدیل ہو چکا تھا، کلائیوں کی ڈریسنگ چھپانے کی غرض سے ہی اس نے فل آستین کی فیسنی جرسی پہن رکھی تھی جس کی آستین اس کی آدھی ہتھیلیوں تک کو ڈھانپے ہوئے تھیں، وہ ناراض ضرور تھی مگر اس نے اس تازہ ترین حادثے کو گھر والوں سے مخفی رکھنے کی اپنی سی بھرپور کوشش کی تھی، معاذ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔

''میں بہتر ہوں پپا! آپ سے مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' وہ ہرگز بھی معاذ کی سمت متوجہ نہیں تھی، پپا مسکرائے اور اس کا سر پیار سے تھپکا۔

''جی ضرور بیٹے، بولیے؟'' وہ ہمہ تن گوش تھے۔

''میں کچھ دن نواب شاہ اپنی حویلی میں گزارنا چاہتی ہوں، پلیز آپ منع نہیں کیجئے گا۔'' وہ مدہم مگر یاس زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میں منع نہیں کر رہا بیٹے، مگر پہلے آپ لوگ لندن جائیں گے، ٹیکٹس آپ کی کنفرم ہو چکی ہیں، تفریح آپ کی صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔'' پپا کی بات پہ پرنیاں ایک دم نروس سی ہو گئی۔

''ہم...... مگر پپا......''

''بیٹے میں ایک ہفتہ بعد کا کہہ رہا تھا مگر معاذ کہہ رہے تھے ابھی ان کے پاس ٹائم ہے سو یہ کام اس وجہ سے بھی عجلت میں ہو رہا ہے۔''

پپا کی وضاحت پہ پرنیاں کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ سکا تھا، اس نے بے اختیار معاذ کو دیکھا، اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی، یقیناً وہ پپا کے سامنے بھرم رکھ رہا تھا، پرنیاں جھلس کر رہ گئی اور فی الفور نگاہ کا زاویہ بدلا تھا۔

''آپ آرام کرو بیٹے، میں آپ کی تیاری کا اسما سے یا آپ کی مما سے کہہ دیتا ہوں۔'' پپا اس کا تر تھپکتے باہر نکل گئے تھے، پرنیاں نے جلتی ہوئی آنکھوں سے معاذ کو دیکھا، وہ بے نیازی کا تاثر دیتا اپنے سیل پہ مصروف تھا۔

''میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتی، براہ کرم اس سلسلے کو یہیں روک دیں۔'' وہ غصے میں ہانپ کر رہ گئی تھی۔

''کچھ کام مجبوری میں بھی کیے جاتے ہیں محترمہ، اسے آپ میری مجبوری سمجھ لیں، میں اپنے گھر والوں کو مزید ہرٹ نہیں کر سکتا، آپ مجھ سے وابستہ ہیں تو آپ کو وہ کرنا پڑے گا، جو میں چاہتا ہوں، چاہے وہ امر آپ کے لئے کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔'' وہ نخوت سے بولا تھا، اس کا یہ استحقاق لب و لہجہ پھر سے اپنی اہمیت اور رشتے کا گھمنڈ جتلا رہا تھا، اس درجہ سنگ دلی اور اپنی بے بسی کے احساس سے پرنیاں کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں، جنہیں معاذ سے چھپانے کو وہ رخ پھیر گئی تھی۔

☆☆☆

''میں آپ کو بہت مس کروں گی مما!'' وہ ان کے گلے لگتی لگتی بولی، انداز ایسا تھا جیسے الگ ہونا نہ چاہتی ہو، مما نے مسکرا کر اس کی پیشانی کو بے حد محبت سے چوما تھا پھر اسے شانوں سے تھام کر بلیک ٹو پیس میں ملبوس نکھرے ستھرے سے معاذ کے برابر کھڑا کرتے ہوئے مسکرا کر بولی تھیں۔

''میرا بیٹا آپ کو میری یاد نہیں آنے دے گا ہے نا معاذ؟''

ان کی تائیدی نگاہیں معاذ کی سمت نہیں تھیں وہ جو بے نیازی کا تاثر دینے کو سیل پہ مصروف تھا، خفیف سا چونکا پھر سرد سانس کھینچ کر کاندھے اچکا دیئے تھے، کچھ کہنے سے مکمل گریز کیے، اب جانے یہ اس کی اپنائی گئی وہ ہی احتیاط تھی یا پھر اسے نے مما کی بات سنی ہی نہیں تھی، پرنیاں کچھ صحیح سے قیاس نہیں کر

سکی تھی، اس نے جھکے سر کو کچھ اور جھکا لیا، ممانے بغور اسے دیکھا تھا، سیاہ پیروں کو چھوتے فراک میں وہ گلاب کی منہ بند کلی کی مانند تھی، شگفتہ دلفریب اور نوخیز، فراک کے گلے اور بازوؤں پہ شوخ رنگوں کے چھوٹے پھولوں کی خوشنما لیس لگی ہوئی تھی، معاذ کے پہلو میں کھڑی باری باری سب سے الوداعی انداز میں گلے ملتی وہ انہیں حسب سابق ملول اور افسردہ لگی تو ان کا اپنا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر بھینچنے لگا۔ جہان انہیں ائیر پورٹ ڈراپ کرنے جا رہا تھا، ہلکے بادامی کھدر کے سوٹ میں ہاتھ میں سن گلاسز پکڑے وہ اسی وقت وہاں آیا تو اس کے سنورے ہوئے بالوں کی نمی اس کے تازہ غسل کی گواہ تھی وہ بہت نفیس طبیعت کا مالک تھا، علی الصبح ہاتھ اس کی روٹین تھی، چاہے کیسا ہی شدید موسم ہو ایسے میں اگر کہیں خصوصی طور پہ تیار ہو کر جانا پڑتا تو وہ پھر سے باتھ لیا کرتا تھا، مما جان تو اس کے یوں بار بار نہانے پہ اکثر چڑا کرتیں۔

"اتنا نہ نہایا کرو، مجھے ڈر ہے گھل نہ جاؤ۔"

"جتنی ان کی باڈی ہے گھلنے میں بھی وقت لگے گا۔" زیاد لازمی رشک کیا کرتا، پھر بات کو مذاق میں ڈال دیا جاتا۔

"ویسے جہان بھائی صابن کی ٹکیہ تھوڑی ہیں جو پانی کے استعمال سے گھل جائیں گے۔" وہ کمی کمی کیے جاتا۔

"تم پیچھے بیٹھ جاؤ، پرنیاں بھابھی کے ساتھ۔" معاذ کو پراڈو کا فرنٹ ڈور اوپن کرتے دیکھ کر جہان نے ٹوکا تھا، جسے معاذ نے سن کر بھی نظر انداز کر دیا، تو جہان کسی قدر جھنجلایا تھا۔

"یار سنا نہیں تمہیں؟"

"جہان تم لوگ ہیں جس جگہ بھیج رہے ہو، وہاں تنہائی اور رومینس کے لاتعداد مواقع ہیں ابھی سے مجھے عاجز مت کرو۔" معاذ نے تنفر سے جواب دیا اور سیٹ سنبھال کر دروازہ زور سے بند کیا تھا، جہان کو اسی قدر برا لگا۔

"معاذ......!" اس نے صرف گھورنے پہ اکتفا نہیں کیا تھا، معاذ نے جھلاہٹ زدہ انداز میں نظریں اٹھائیں۔

"جے اگر اب تم کچھ بولے تو گھر والوں کی خاطر جو خود پہ جبر کر رہا ہوں نا اس لحاظ مروت کو بھی بالائے طاق رکھ دوں گا، سمجھے تم۔"

وہ پھٹ پڑا تھا، سرخ چہرا دہکتی ہوئی آنکھیں، جہان تو ششدر ہو کر رہ گیا، پرنیاں اسی پل گاڑی کی سمت آئی تھی، نم پلکوں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتی ملول اور دل گرفتہ سی ممانے خود دروازہ کھولا اسے بیٹھنے میں مدد دی پھر اس کے لباس سمیٹ کر دروازہ بند کیا تھا، ایک بار پھر الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا، ممانے ایک بار پھر کھڑکی کے کھلے شیشے سے اندر ہاتھ داخل کر کے پیار بھرے انداز میں اس کا سر اور گال تھپک کر پیار کیا تھا، جہان بیک ویو مرر سے سب دیکھ رہا تھا معاً اچانک اس کی نگاہ ٹھٹک گئی تھی، سرکتی شال کا پہلو سنبھالتے پرنیاں کی دونوں کلائیوں سے آستین سرک گئی تھی اور ڈریسنگ پہ محض ایک نگاہ ہی پڑ سکتی تھی جو جہان کو گم صم کر کے رکھ گئی تھی۔

"اونہہ اتنی فکر مندی ہے بداعتادی ہے مجھ پہ تو میرے ساتھ اپنی لاڈلی کو تنہا بھیجنے کی ضرورت کیا تھی۔" معاذ بھی یقیناً مما کی بے تابی بے قراری کو نوٹس کر چکا تھا، پرنیاں کو بار بار پیار کرنا گلے لگانا اسے بری طرح سلگا چکا تھا جبھی وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا، جہان نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا، اس کی سرخ و سفید رنگت اس پل غصے کی زیادتی سے دہک رہی تھی۔

"اتنا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے تمہارا؟" ائیر پورٹ پر جب جہان نے الوداعی انداز میں معاذ کو گلے لگایا تو نرمی سے سوال کیا تھا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔" وہ جواب میں تڑخا تو جہان نے مسکراہٹ دبالی۔

"یہ کوئی نئی خبر تھوڑی ہے میں عرصے سے جانتا ہوں۔" معاذ نے اس بات کے جواب میں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر اسے زور سے پرے دھکیل دیا۔

"دفع ہو جاؤ، تم بھی باقیوں سے الگ تھوڑی ہو۔" اب کے جہان نہ ہنسا نہ مسکرایا اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیا اور زبردستی خود سے لپٹا لیا۔

"کیوں اپ سیٹ ہو یار ہنی مون پریڈ پہ جا رہے ہو، وہ بھی اپنی مرضی سے۔" معاذ نے اس کے ہاتھ پھر سے ہٹا دیئے پھر زور سے سر جھٹکا تھا، عجیب تنفر بھرا انداز تھا۔

"کچھ کام فارمیلٹیز کے لئے کیے جاتے ہیں۔"

"لیکن تم تو فارمیلٹیز نہیں نبھایا کرتے تھے، اتنے خالص کھرے انسان کا یہ روپ کچھ بھا نہیں رہا۔" جہان نے جیسے اسے تاسف سے دیکھا تھا، معاذ کے چہرے پہ عجیب سا تاثر پھیل گیا، اس نے ہونٹوں کو باہم سختی سے بھینچ کر کچھ فاصلے پہ موجود پرنیاں کو دیکھا، وہ ڈیپارچر لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھی، گھیر دار فراک پیروں میں ڈھیر تھا، گود میں میگزین، وہ ان سے یکسر غافل تھی۔

صبح وہ ذرا جلدی گھر واپس آ گیا تھا، تیز قدموں سے اپنے کمرے کی جانب آتے اس کے قدم یکلخت ٹھٹک گئے تھے تو وجہ ادھ کھلے دروازے سے سسکیوں کے ہمراہ باہر آتی پرنیاں کی آواز تھی۔

"مجھے یہ خفت اور ذلت کا احساس ہر لحظہ کچوکے لگاتا ہے مما کہ آپ کے فورس کرنے پہ میں نے انہیں منایا تھا، مگر انہوں نے اتنے برے طریقے سے مجھے جھٹکا اتنی تذلیل کی کہ میں خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی، میں کبھی اس بات پہ خود کو معاف نہیں کروں گی کہ میں نے اپنے وقار اور اپنے پندار کو داؤ پہ لگا دیا، محض انہیں منانے کی خاطر......" اس کی سسکیاں ہر لحظہ تیز ہو رہی تھیں، مما اسے چپ کرانے کی کوشش میں مصروف تھیں، معاذ کو لگا تھا اس کا پورا وجود برزخ میں جا پڑا ہو، بدگمانی اور غصہ تجسس کا کوئی انت نہیں تھا وہ وہیں سے پلٹ گیا تھا، اسے لگا تھا اگر وہ اس پل پرنیاں کا سامنا کر لیتا تو شاید خود کو کسی طرح بھی کنٹرول نہ کر سکتا، ایک طوفان تھا جو اس کے اندر اتھل پتھل جاری کیے ہوئے تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا، پرنیاں کا گلا دبا کر کام تمام کر دے، جہاں نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تب وہ چونکا تھا۔

"مجھے بھی کچھ نہیں بتاؤ گے؟" جہان کی آنکھوں میں مخصوص قسم کی اپنائیت تھی، محبت اور احساس کے تمام پر خلوص رنگ۔

"تم ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہو؟ کب تک یوں مخالف رخ پہ بھاگتے رہو گے؟ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو تم نہادانا میں الجھ کر؟" جہان متاسفانہ انداز میں سوال کر رہا تھا، معاذ کے ہونٹوں پہ زہر خند پھیل گیا۔

''انا نہیں نفرت ہے یہ، میرے ساتھ رہنا اسے اتنا ناگوار گزرتا ہے کہ وہ خودکشی کرنے پہ مجبور ہو گئی، میری بات کا یقین نہیں تو جا کر اس کی کٹی ہوئی کلائیاں دیکھ لو۔'' وہ ضبط کھو کر زور سے پھنکارا جہان بے طرح خائف ہوا تھا۔

''تم شدید بدگمانی کا شکار ہو معاذ! پرنیاں کو میں جانتا ہوں وہ ایسی——''

''تو تمہارا خیال ہے میں اب تک جھوٹ اور بکواس کرتا رہا ہوں؟ او کے فائن پھر تو مما کی طرح تمہیں بھی مجھ سے نہیں اس سے ہمدردی کرنی چاہیے جا کے جاؤ۔'' جتنا اس کا موڈ خراب ہوا تھا وہ اسی شدت سے غرایا تھا، آنکھیں یکدم یوں سرخ ہو گئیں جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا، جہان بری طرح سے عاجز ہوا تھا۔

''معاذ کیا ہو گیا ہے یار۔''

''تم جا سکتے ہو بے جتم نے ثابت کر دیا کہ تم میرے دوست نہیں اس فضول لڑکی کے بھائی ہو بس۔'' معاذ نے رخ پھیرا اور کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا، جہان کے چہرے سے بہت واضح بے بسی جھلکنے لگی۔

''اب اس طرح مجھے پریشان کر کے جاؤ گے تو نہ ڈھنگ سے کام کر سکوں گا نہ کھا پی۔'' جہان نے گویا اسے جذباتی کرنا چاہا تھا، مگر وہ اتنے غصے میں تھا کہ گویا پوری طرح دھیان سے بات بھی نہیں سنی، گہرے کش لیتے دھواں بکھیرتا رہا۔

''چلو میں مان لیتا ہوں میرے باپ کہ غلطی تمہاری نہیں پرنیاں کی ہے، اب تو موڈ ٹھیک کر لو۔'' جہان نے کسی قدر جھنجلا کر کہا اور اس کے لبوں سے سگریٹ کھینچ کر جوتے سے مسل دیا، معاذ اسے جواباً غصہ بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا، جہان نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

''اس طرح اینٹھا ہوا تو بالکل کسی محبوبہ بیوی کی طرح لگ رہا ہے قسم سے۔'' اس کے شانے پہ اپنے ہاتھوں کا مکہ مار کر کہتا وہ آخر میں ہنسا تھا۔

''واپسی پہ اگر محترمہ میرے ساتھ نہ ہوں تو خود سمجھ لینا اس کی کسی بدتمیزی کے جواب میں، میں اسے وہیں کسی پہاڑ سے دھکا دے کر مار آیا ہوں۔'' پرنیاں کے لاتعلق وجود پہ ایک پھنکارتی نگاہ ڈال کر وہ اتنی تلخی سے بولا تھا کہ جہان ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

''تم کبھی سدھرو گے بھی معاذ اب میرے دل نے امید رکھنی بھی چھوڑ دی۔'' وہ جس مایوسی سے بولا تھا اس نے معاذ کے لبوں پہ دل جلاتی مسکان بکھیر دی تھی۔

☆☆☆

تیرے اور میرے درمیاں
بعد کیسا فاصلہ باقی کہاں
لے ذرا مٹی کی اک چکنی ڈلی
ڈال پانی گوندھ اس کو زور سے
اور بنا دو بت حسین ولا جواب
اک بت کی شکل ہو تیری طرح۔

دوسرا بت ہو مرا
بت شکن بن کر انہیں اب توڑ دے
ڈال پانی گوندھ ان کو پھر ذرا
اب بنا پھر دونوں بت
ایک اپنا، اک مرا
اب میرے بت میں کچھ تیرا وجود
اور تیرے بت میں ہے کچھ بکھرا مرا
زندگی کی کون سی طاقت بتا
تجھ کو کر سکتی ہے اب، مجھ سے جدا

اپنے گرد لپٹی بے حد اسٹائلش سی شال کے کونے کو اس نے زمین پہ اپنے پیچھے جھاڑ دیتے محسوس کیا تو گہرا سانس بھر کے پلو سمیٹا تھا، پچھلی رات کے طوفان نے بہت تباہی مچائی تھی، لان میں پودوں کا ناس ہو رہا تھا، جنہیں مالی تندہی سے پھر سے سنبھالنے سنوارنے اور کاٹ چھانٹ کرنے میں مصروف تھا، پھولوں کے پودوں کی کئی شاخیں درمیان سے ٹوٹ گئی تھیں جنہیں وہ باندھ رہا تھا تا کہ پھر سے توانائی حاصل کر سکیں، پتہ نہیں ایک بار اپنی جگہ چھوڑ دینے والا انسان ہو یا پودے کی شاخ پھر اپنے مرکز پہ ٹھہر پاتی ہے یا نہیں۔

اس نے تاسف بھرا سانس کھینچا اور سر اونچا کر کے آسمان کی سمت دیکھا بادل ابھی بھی موجود تھے، معاً چند لمحوں کے اندر تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پھر بارشیں شروع ہو گئی اور پوکلپٹس کے جوڑے پتوں پر تڑاتڑ برستی بارش کی آواز ماحول میں خنکی کا احساس پیدا کرنے لگی، شیڈ کے نیچے ہو کر اس نے ہاتھ پھیلا کر بوندوں کو اپنی گلابی ہتھیلی پہ سمیٹنا چاہا مگر یہ ایک سعی لاحاصل تھی، اس کا دل اس احساس کے ساتھ ملول ہونے لگا تھا، بوندوں کی بجائے اسے لگا تھا وہ خوشی کو سمیٹنے کی کوشش میں ناکام ہے، خوشی جو جہان کی ذات اس کے وجود سے منسوب تھی، وہ اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں ہو سکا تھا بات اگر اسی زیاں تک رہتی تو بھی غنیمت تھا وہ یہ کرب سہہ لیتی معاملہ بہت آگے تک بڑھا ہوا تھا، آگاہی اضطراب کے در ہی وا کیا کرتی ہے شاید...... زینب وہ گلاب کی پنکھڑی سے بھی نازک تر وجود رکھنے والی صبح نوخیز جیسی اجلی لڑکی، وہ تو جہان کی کل کائنات...... وہ نہ سمجھ پاتی، وہ جس نے محبت میں سب کچھ ہار دیا تھا، ہر احساس کو خود پہ پوری شدتوں سے محسوس کیا تھا اور بری طرح سے ٹوٹ کر بکھر گئی، مسز آفریدی سمجھتی تھیں وہ جیت گئیں ہیں، وہ کیا جانیں انہیں کیسی مات ہوئی تھی، ژالے کا دل رونے لگا تھا، کیسی لٹی پٹی گھر لوٹی تھی وہ اور مسز آفریدی اس کے چہرے کے اضمحلال کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔

''اب میں بہت جلد تمہاری رخصتی کر دوں گی، اب مزید دیر مناسب نہیں، میں جانتی ہوں تم اس سے الگ رہ کر اب خوش نہیں رہ سکتی ہو۔'' ژالے کے چہرے پہ اس بات کے جواب میں کرب پھیل گیا تھا۔

(جب دل میں فاصلے اور دوریاں ہوں تو پھر جسموں کا تعلق اور قربت بھی بے معنی ثابت ہوا کرتی ہے، مگر آپ کیا جانیں جو جسموں کی تسخیر کو ہی فتح گردانتی ہیں)۔

"مجھے رخصتی کی کوئی جلدی نہیں ہے ممی آپ ان سے ایسی کوئی بات نہیں کہیں گی۔" ژالے کی بات پہ مسز آفریدی بھڑک اٹھی تھیں۔
"تمہارا دماغ درست ہے ژالے، آج کل کی لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں تم میں، شوہر ہے جہانگیر تمہارا مگر تم اس کے باوجود اسے ہاتھوں میں نہیں لے سکیں، لڑکیاں پہلی ملاقات میں ہی لڑکوں پہ ڈورے ڈال لیا کرتی ہیں، فون پہ اپنے رشتے ناطے طے کرتی پھرتی ہیں۔" وہ سخت خفا سی ہو چکی تھیں، ژالے کو اسی حساب سے غصہ آیا۔
"میرا شمار ایسی فضول لڑکیوں میں نہ کریں جنہیں اپنی نسوانیت کی پرواہ ہے نہ اپنے وقار کی۔" اسے لگا تھا یہ بات وہ مسز آفریدی کو نہیں جہاں کو کہہ رہی ہے، جہاں جس کی آنکھوں میں اس نے بدگمانی نفرت اور شک کے لاتعداد رنگ دیکھے تھے اور اندر تک شکستگی کا شکار ہو گئی تھی، جبھی بولی تو اس کی آواز بھرا سی گئی تھی۔
"پتہ ہے مجھے، یہ تو میرا ہی دم غنیمت تھا کہ جہانگیر اس وقت تمہارا شوہر ہے ورنہ تم......" انہوں نے دانت کچکچائے تھے اور ژالے ضبط کھو گئی تھی جبھی چیخ پڑی۔
"کاش اے کاش آپ نے مجھ پہ یہ احسان نہ کیا ہوتا۔ مجھے اتنا مہنگا سودہ منظور نہیں تھا، عزت انا وقار کی قربانی دے کر محبت کو پانا، اس سے بہتر تھا میں اسی نارسائی کے احساس میں سسک سسک کر ختم ہو جاتی۔" وہ روتے ہوئے اپنے کمرے میں بھاگ گئی تھی، مسز آفریدی سوائے جھلانے کے اس کی عقل پہ ماتم کرنے کے اور کیا کر سکتی تھیں۔
"چھوٹی بی بی آپ کا فون ہے۔" خیالات کے تسلسل کو ملازمہ کی آواز نے توڑا تھا، جو اس کا سیل فون بڑھاتے کھڑی تھی، ژالے نے چونک کر دیکھا اور بے دلی سے سیل لے لیا، جس کی اسکرین تو روشن تھی مگر رنگ ٹون بند ہو چکی تھی، ملازمہ بارش میں بھیگتی واپس اندرونی حصے کی جانب جا رہی تھی، وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی، تبھی ایک بار پھر سیل مدھر سروں میں گنگنانے لگا، اس نے اسکرین پہ اسپارک کرتے نمبر کو دیکھا پھر جانے کس خیال میں گم کال ریسیو کر لی تھی۔
"ہیلو جنی! ہاؤ آر یو؟" دوسری سمت نیلما تھی، بغیر کسی گلے شکوے کے انتہائی محبت سے بولی، ژالے کے چہرے پہ بے زاری سی چھا گئی۔
"کیوں کال کی ہے؟" اس کا لہجہ ہر قسم کے احساس سے عاری تھا۔
"مجھے تم سے ملنا ہے جان! ترس گئی ہوں تمہاری صورت دیکھنے کو، اب تو تمہاری تصویریں بھی جی کے بہلاوے کا سامان کرنے سے قاصر ہیں۔" اس کے لہجے و انداز میں عجب سی شکستگی تھی، مگر ژالے کا دماغ تو تصویروں والی بات پہ ہی الٹ سا گیا تھا۔
"میری تصویریں کیوں رکھی ہوئی ہیں آپ نے؟ اور ملی کہاں سے تھیں، براہ کرم انہیں آگ لگا دیں۔" وہ پھنکار کر بولی تو دوسری جانب نیلما یکلخت خاموش ہو گئی تھی۔
"تمہارے حوالے سے یہ واحد اور عارضی خوشی ہے، میرے پاس جنی، کیا تم اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو؟" جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں عجیب سی بے بسی اور اضطراب تھا۔
"مجھے آپ کی خوشی سے غرض نہیں ہے محترمہ، آپ نے یہ سوچا آپ کے پاس میری تصویر کا ہونا

میرے لئے کسی بھی گمبھیر مسئلے کا باعث بن سکتا ہے۔" وہ زہر خند سے بولتی چلی گئی تھی، اس بات کو سوچے اور خیال کیے بغیر کہ اس کے الفاظ نیلما کی روح پہ کیسے گھاؤ ڈال سکتے ہیں وہ کہہ گئی تھی، اس کے لہجے میں جو حقارت اور تنگی تھی اس کا شاید اسے خود بھی پوری طرح سے اندازہ نہیں تھا۔
دوسری سمت یکلخت سناٹا چھا گیا تھا، ژالے نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا، وہ نازک احساسات کی حامل لڑکی بھی یہاں اس مقام پہ آ کر اس درجہ کٹھور بے حس اور سنگدلی کا مظاہرہ کر جاتی تھی، اسے کبھی خود بھی اندازہ نہ ہو پایا تھا شاید کہ وہ نیلما کو معاف کرنے اس سے درگزر کرنے میں خود کو اتنا کم ظرف کیوں پاتی تھی۔
(میں دنیا کے لئے جیسی بھی ہوں ژالے مگر تمہارے لئے میں ہمیشہ سراپا محبت رہی ہوں، ایک ایسے سوالی کی طرح جو دل کا کاسہ پھیلائے تمہاری توجہ نرمی اور محبت کی خیرات کا طلب گار بنا رہتا ہے، مگر ژالے تم جو ساری دنیا کے لئے دوست اور غم گسار ہو میرے لئے پتہ نہیں کیوں ہمیشہ پتھر ثابت ہوئیں، میں تھک گئی ہوں تمہارے اس پتھر وجود سے سر ٹکراتے، اب میں ایسا نہیں کروں گی تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا نیلما ہار گئی، نیلما نے عرصہ ہوا شکست کھانی چھوڑ دی ہے، اسے ہار سے شدید نفرت ہے، میں تمہیں بھی حاصل کروں گی، محبت سے نہ سہی زور زبردستی سے سہی، اب تم تک پہنچنے کا میرا طریقہ کار کچھ اور ہو گا، یاد رکھنا)۔
نیلما کا میسج اگلے چند لمحوں میں اسے موصول ہو چکا تھا، جسے اس نے پڑھا تھا اور بغیر کسی تاثر کے اسی سپاٹ انداز میں ضائع کر دیا تھا۔

☆☆☆

طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچا، فلائیٹ سے نکل کر وہ اس کے ہمراہ ائیر پورٹ کی پرشکوہ عمارت سے باہر آ رہی تھی تو اس نے نگاہ بھر کے یاسیت آمیز انداز میں اپنے بے پرواہ ہم سفر کو دیکھا تھا، جو اس سے اتنا بیگانہ نظر آ رہا تھا جیسے اس پلین میں سفر کرنے والے اور اتنے لاتعداد اجنبی مسافر، کیا فرق تھا اس میں اور ان میں، اس کا دل جانے کسی احساس کے سنگ رویا اور ذہن کے گوشوں میں جانے کب کی "امجد اسلام امجد" کی اندیشہ سرسرانے لگی۔

ضروری نہیں ہے
جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر ہاتھ میں ہاتھ دے کر
سفر اور تلاطم کے حصے سنائے
جزیرے ہواؤں اور ان دیکھے موسم
اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پر بکھرے
منظروں، ڈاکوؤں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان وارداتوں سے گزرا بھی ہو
گر کہے آؤ ہم ان پریشان موجوں کا پیچھا کریں
جو تیرے میرے پاؤں کو چومتی ہیں
تلاطم کی بے نام منزلوں سے گزریں

یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں
تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں ان ان دیکھے رستوں کی خبر سنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو
کہیں یہ نہ ہو تم سمندر میں اس کو
ڈھونڈو تو وہ
ساحلوں پر کھڑا مسکراتا رہے

اسے لگا اس کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، وہ اسی سانحہ عظیم سے دوچار ہے، معاذ تلاطم خیز موجوں کے سمندر میں اس کے ہمراہ نہیں آیا تھا، وہ ساحل پہ کھڑا تھا محفوظ اور اس کی بے بسی لاچاری اور کرب سے بے نیاز، اس کی آنکھیں بھر بھر آنے لگیں، بے بسی سی بے بسی تھی وہ، اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا، اس کے ساتھ ہو کر اس کے ساتھ نہیں تھا، ائیر پورٹ سے باہر آ کر معاذ نے گاڑی ہائر کی تھی اور ان کا سفر نئے سرے سے شروع ہو گیا تھا، پرنیاں نے ایک نظر پھر اسے دیکھا، وہ سگریٹ کے کش لیتا اپنے سیل پہ کوئی ای میل چیک کر رہا تھا، بری طرح مصروف اس سے بے طرح بے نیاز، ان کا سارا ہنی مون ٹرپ یقیناً اس کی اسی سرد مہری اور لاتعلقی کا شکار ہونے والا تھا، پرنیاں نے اپنے دل کے بوجھ سے دانستہ دھیان ہٹانے کو کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا تھا، رات کے اندھیرے میں مدغم لندن اس پل نہ صرف روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، بلکہ بارش میں بھی بھیگ رہا تھا، کیب ناریل کے جھومتے درختوں کے نیچے تارکول کو چمکتی سڑک پہ رواں جنوب کی سمت بڑھ رہی تھی، کچرے کے ایک ڈرم کے پاس ایک بوڑھا فقیر بیٹھا ہوا تھا، جو اس سردی میں ٹھٹھرتا تھا، یہاں سڑکیں صاف ستھری اور بلند و بالا عمارتیں تھیں، گرد سے بالکل صاف تھی، گاڑی کے اندر ہیٹر کی حدت کے باعث ماحول خوشگوار تھا، گاڑی کا یہ سفر آدھا گھنٹہ مزید جاری رہا، پھر ایک رہائشی بلڈنگ کے سامنے جا کر اختتام پذیر ہوا تھا، یہ شفاف اور پوش علاقہ تھا، غیر آلودہ فضا کے باعث ہر شے نکھری ہوئی تھی، چمکیلی سڑکوں کے کنارے سر بلند عمارتیں چمکتی تھیں جن کی اکثر کھڑکیاں روشن اور زندگی کے احساس سے مزین تھیں سامنے ایک ہوٹل بھی تھا، پکوانوں میں باربی کیو اور زیتون کے تیل کی خوشبو کا احساس تھا، سائن بورڈ پہ غور کرنے پہ وہ جان پائی یہ پاکستانی ہوٹل تھا، معاذ سامان اٹھائے آگے بڑھ گیا تھا، پرنیاں نے بوکھلا کر اس کی تقلید کی تھی، لفٹ کے ذریعے وہ لوگ ایک شفاف راہداری عبور کر کے جس اپارٹمنٹ کے دروازے پہ رکے وہ لاکڈ تھا، راہداری سنسان تھی اور دروازے کی نیم پلیٹ پہ احسان شاہ کے نام کے الفاظ جگمگاتے تھے، دروازے کے دونوں اطراف خوبصورت پلانٹس کے گملے تھے، معاذ نے کوٹ کی جیب سے چابی نکال کر دروازہ ان لاکڈ کیا تھا، پرنیاں نے اس کے بعد اندر قدم رکھا تھا، فرنشڈ اپارٹمنٹ تھا جس کی آرائش بے حد نفیس ذوق کی حامل تھی، دیواروں پہ آف وائیٹ پینٹ تھا، بلیو مخملیں صوفے اور بلیو ہی پردے تھے، معاذ لاؤنج میں ہی ٹھہر گیا تھا، آج کے دن کی ساری نمازیں قضا ہو چکی تھیں، پرنیاں بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔

بھوک کا احساس بھی تھا مگر اس نے نماز کا ارادہ باندھا تھا، شال اور دوپٹہ اتار کر رکھنے کے بعد اس نے جوتوں سے پیروں کو آزاد کیا تھا، واش روم جا کے وضو کیا اور جائے نماز ڈھونڈنے کی کوشش کیے بغیر

قبلے رخ جائے نماز بچھا کر نمازوں کی ادائیگی میں مشغول ہو گئی، تقریباً ایک گھنٹے بعد بیڈ روم سے باہر آئی تو معاذ لاؤنج کے صوفے پہ نیم دراز فون پہ گفتگو میں مصروف تھا، دوسری جانب یقیناً جہان تھا، پرنیاں رکے بغیر آگے بڑھ کر کچن کے دروازے پہ آ گئی، وہاں موجود چھوٹی ٹیبل پہ کھانے کے برتن پڑے تھے، یقیناً معاذ کھانا کھا چکا تھا اور یہ کھانا بھی اس نے ہوٹل سے منگوایا تھا، ٹیبل پہ موجود برتنوں میں ابھی بھی اس کی ضرورت سے زائد کھانا موجود تھا جس کا واضح مطلب تھا کہ معاذ نے اس کے لئے بھی کھانا منگوایا تھا مگر اس کا یوں اپنا نظر انداز کرنا رونہاسا کر گیا تھا، پتہ نہیں وہ حساس زیادہ ہو رہی تھی یا اس کی جانب سے اب کسی پیش رفت کی متمنی تھی کہ اس کا رویہ تکلیف دہ حد تک اذیت دے رہا تھا، شدید بھوک کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا تھا، برتن دھونے کھانا سمیٹ کر فریج میں رکھتے اس نے چپکے چپکے کتنے آنسو بہا دیئے تھے، وہ بوجھل دل کے ساتھ کچن سے باہر آئی تو معاذ لاؤنج میں موجود نہیں تھا، آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور ٹیبل پہ کافی کا خالی مگ پڑا تھا جس کی سطح پہ بچی ہوئی کافی نے جمنا شروع کر دیا تھا، ایش ٹرے میں ادھ جلے سگریٹ کے ٹوٹے اور راکھ پڑی تھی، اس نے آگے بڑھ کر کشنز کی ترتیب درست کی، ایش ٹرے کو ڈسٹ بن میں خالی کیا، کافی کا مگ دھو کر اس کی جگہ پہ رکھا اور معاذ کا صوفے پہ پڑا ہوا سیل اٹھا کر بیڈ روم کی جانب آ گئی، جس پل اس نے اندر قدم رکھا تھا اسی لمحے معاذ بھی نائٹ ڈریس میں واش روم سے باہر آیا تھا، انگلیوں سے گیلے بال سہلاتے ہوئے اس پہ نگاہ پڑی تو اس کی صبیح پیشانی پہ ایک شکن نمودار ہوئی تھی۔

"تمہیں اپنی ضرورت کا جو بھی سامان یہاں سے چاہیے اٹھا لو۔" پرنیاں صوفے پہ بیٹھ چکی تھی جب معاذ کی سرد آواز پہ اس نے چونک کر سر اونچا کیا اور ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

"ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں محترمہ کہ یہ فارمیلٹی مجبوری میں نبھانا ضروری ہے، جب کوئی مجبوری نہیں ہے تو میرا تمہیں برداشت کرنا بھی ضروری نہیں۔" معاذ کے لہجے میں ہرگز کوئی گنجائش تو تھی ہی نہیں جو تذلیل اور تضحیک کا عنصر تھا اس نے پرنیاں کو اتنی بے دردی سے کانٹوں پہ گھسیٹا تھا کہ وہ لمحوں میں لہولہان ہو گئی تھی، ذلت اور خفت کا وہ عالم کہ وہ فوری طور پہ کوئی ری ایکشن دینے کے قابل بھی نہ رہ پائی، بس دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ ساکن بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"سنا نہیں ہے تم نے؟ اس اپارٹمنٹ میں اس کے علاوہ بھی کمرے ہیں، کہیں بھی ٹھکانا کر لو اپنا۔" وہ پھر پھنکارا تھا، پرنیاں جیسے اس لمحاتی سکتے کی کیفیت سے باہر آ گئی، وہ ایکدم جھٹکا کھا کر اٹھی تھی اور ایک لفظ کہے بغیر بیڈ روم کا دروازہ بھاگتے ہوئے پار کر لیا تھا، اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، معاذ سے اسے اس درجہ اہانت کی ہرگز توقع نہیں تھی، ہتک کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اپارٹمنٹ کا بیرونی درواز کھول کر باہر آ گئی، دل و دماغ حواسوں میں تھے نہ قابو میں، رات کا سنسان پہر اور طویل راہداری جس میں سناٹا بولتا تھا، زار و قطار بہتی آنکھوں کے ساتھ وہ پاگلوں کی طرح اس ویران راہداری میں دوڑتی چلی گئی، تیز اور تیز...... انسلٹ کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ پھر سے معاذ کو اپنی شکل نہیں دکھانا چاہتی تھی، ایسی ہیجانی کیفیت میں اس شدید غلطی کا احساس کہاں رہا تھا کہ وہ انجان جگہ پہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہے، بس اس پل تو ایک ہی خواہش تھی کہ معاذ سے اتنی دور چلی جائے کہ پھر وہ اس کی شکل تک نہ دے سکے، معاً اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرنے سے بامشکل بچی تھی، اس نے سنبھل کر دیکھا

تو ٹھوکر لگنے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی، نشے میں دھت وہ گرانڈیل وجود کا کوئی آدمی تھا جو سیڑھیوں کے آغاز پہ یوں پھیل کر لیٹا ہوا تھا جیسے اپنے بیڈ پہ محو استراحت ہو، پرنیاں بدک کر اس سے فاصلے پہ ہوئی مگر یہ فاصلہ بڑھا نہیں پائی تھی، وہ شرابی اسے دیکھ چکا تھا اور اب بدمست بیل کی طرح سے ہی اٹھ کر اس پر جھپٹا تھا، ساتھ میں وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا، اس کے منہ سے اٹھتے تیز بو کے بھبکے، پرنیاں کے حواس معطل کر کے رکھ گئے، اسے اپنی فاش غلطی کا احساس یکلخت جاگا تو لہو رگوں میں منجمد ہونے لگا تھا، وہ زور سے چیخی اور اپنا آنچل اس سے چھڑا کر الٹے قدموں دوڑی، چند قدم کے فاصلے کو طے کر کے ہی اس کی گردن میں کوئی پھندا سا پڑ گیا تھا، اس نے تھرا کر پلٹ کر دیکھا، اس کے دوپٹے کا ایک سرا اس عفریت کے ہاتھوں میں تھا اور وہ قہقہے لگاتا اٹھ کر اس کی جانب آ رہا تھا، پرنیاں نے ایک جھٹکے سے دوپٹہ اپنی گردن سے الگ کیا تھا اور اگلے لمحے پھر سرپٹ بھاگی تھی، بار بار پیچھے کو مڑ کر دیکھتی ہوئی وہ شکار ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر زخمی ناگ کی مانند پھنکارتا اس کے پیچھے لپکا تھا پرنیاں کے قدموں کی رفتار میں ہی نہیں دل کی دھڑکن کی رفتار میں بھی تیزی آئی تھی، تبھی وہ اپنی جھونک میں دوڑتے کسی سے بہت زور سے ٹکرائی یارے خوف کے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی، تڑپ کر پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں کو اٹھایا، چہرے پہ غصے اور برہمی کے سب آثار لئے، معاذ حسن اس کے روبرو تھا، اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر وہ اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا واپس لایا تھا اور دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اسے بے دردی سے پیچھے دھکیلا اور خود دروازہ لاکڈ کرنے لگا۔

"تمہیں میں نے بیڈ روم سے نکالا تھا، اس گھر اور اپنی زندگی سے نہیں مگر تمہیں شاید میرے گھر اور میری زندگی میں بھی رہنا گوارا نہیں ہے، پابندی سے نفرت ہے نا تمہیں، ویسی ہی نفرت جیسی مجھ سے کرتی ہو ہے نا۔" وہ سرخ دہکتی آنکھوں کو اس پہ ٹکا کر پھنکارا، پرنیاں اس قابل بھی نہیں تھی کہ جواب دے سکی، آنسو اسی رفتار سے بہہ رہے تھے اور جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے خزاں رسیدہ پتہ، ان طعنوں سے یہ ہوا کہ اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی، معاذ کا غصہ کچھ اور بڑھا۔

"دوپٹہ کہاں ہے تمہارا؟" اس کا لہجہ ہی نہیں نظریں بھی کاٹ دار تھیں، پرنیاں جیسے زمین میں گڑھ کر رہ گئی تھی، اب وہ رونا بھی بھول گئی تھی گویا، معاذ کچھ دیر انہی خون ریز نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا، پھر تنفر زدہ انداز میں پلٹ کر اندر چلا گیا، پرنیاں وہیں پڑی سلگتی کڑھتی اور سسکتی رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ اتنی تاخیر سے کھلی تھی کہ نماز قضا ہو چکی تھی، پرنیاں نے ٹائم دیکھا تھا اور بے دلی سے وہیں پڑی رہی، کروٹ بدلی تو اپنے جسم پہ کمبل کی موجودگی اسے قدرے حیران کر گئی تھی، یقیناً یہ معاذ کی کرم فرمائی تھی۔

(یقیناً سوچتے ہوں گے میں ٹھنڈ سے اکڑ کر مر نہ جاؤں، پھر آپ مشق ستم کس پہ توڑیں گے اور کیا ہو سکتی ہے اس نوازش کی وجہ)۔

اسی کے ہونٹوں پہ زخمی مسکان بکھر گئی تھی، رات جانے کتنی دیر تک وہ جاگتی اور روتی رہی تھی، اس کا شمار ان لوگوں میں ہوا تھا، جو ہمیشہ آزمائے جاتے ہیں، وہ بھی ہمیشہ تشنہ اور مضطرب رہنے کو دنیا میں بھیجی گئی تھی شاید...... اس کے ہونٹوں پر اضمحلال سا آ کر ٹھہر گیا، پتہ نہیں وہ اس سب سے سمجھوتہ نہ کر سکی تھی،

اس نے اٹھتے ہوئے کھلے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی تو اپنی آنکھوں کی جلن کا احساس ہوا تھا، پیروں میں سلیپر اٹھا کر وہ واش روم میں آئی تھی، منہ ہاتھ دھو کر وہیں کھڑے کھڑے بالوں کو بھی سلجھا کر کیچر لگا لیا، پھر کچن کا رخ کیا تھا، وہ کل سے بھوکی تھی اب پیٹ کی وہ حالت تھی گویا اندر آگ لگی ہو، فریج کھول کر اس نے بریڈ مکھن اور دودھ کا پیکٹ نکال لیا تھا، چائے کا پانی رکھ کر اس نے بریڈ کا پیکٹ کھول کر سلائس پہ بٹرنگ کرنا شروع کی، اس دوران پانی کھول اٹھا تھا، دودھ ڈال کر جوش دیا پھر چائے چھان کر مگ میں نکالی اور خود ٹیبل کے پاس آ گئی، ناشتے کے دوران وہ اپنے سیل پہ بھی میسج چیک کرتی رہی تھی، جس وقت وہ کچن سمیٹ کر نکل رہی تھی معاذ بھی کمرے سے باہر آیا تھا، شرٹ سے بے نیاز گلے میں تولیہ لٹکا ہوا، سیل فون کان سے لگائے وہ ہنستے ہوئے باتوں میں مصروف تھا، پرنیاں واپس کچن میں آ گئی، اس کے لئے ناشتہ تیار کرتے وہ دوپہر کے کھانے کا مینو سوچنے لگی تھی، معاذ ناشتے میں پراٹھا اور آملیٹ بھی لیتا تھا، شاہ ہاؤس میں ناشتے میں اتنی ورائٹی ہوا کرتی تھی، وہ تھوڑا تھوڑا سبھی کچھ ضرور چکھتا، اس وقت پرنیاں نے اس کے لئے فریش جوس کے ساتھ چائے بوائل انڈے اور سلائس تیار کیے تھے، پراٹھے اور آملیٹ کے جھنجھٹ میں وہ پڑنا نہیں چاہتی تھی، وہ ٹرے اٹھائے باہر آئی تو معاذ ٹک سک سے تیار ہو چکا تھا، پرنیاں نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی، جسے نظر انداز کیے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"دروازہ بند کر لو، جب تک میں تمہیں کال کر کے دروازہ کھولنے کا نہ کہوں کھولنا نہیں ہے، سیل تو لائی ہو نا ساتھ......؟" وہ کتنے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا، جیسے رات کی کسی تلخی کو یاد رکھے ہی نہ ہو۔

"جی! آپ ناشتہ تو کر لیں۔" پرنیاں نے بھی خود کو سنبھال کر اور کسی قدر جبر کر کے کہا تھا۔

"میں باہر جا رہا ہوں، کچھ کام ہے۔" اس کی بات کا جواب دیئے بغیر وہ اپنی کہہ رہا تھا، پرنیاں نے جواب میں کچھ نہیں کہا، وہ اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے چلی آئی تھی۔

"اکیلی باہر نکلنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ یہ پاکستان نہیں ہے، یہاں راہ گیر کسی کو مشکل میں دیکھ کر بھی رکنا پسند نہیں کرتے۔" اس کا لہجہ زہر خند تھا، پرنیاں کی پلکیں جھکی تھیں اور چہرے پہ خفت سی چھا گئی، معاذ کے جانے کے بعد اس نے دروازہ لاکڈ کیا تھا اور تھکے ہوئے قدموں سے واپس آ گئی، اس کے سیل پہ زینب کی کال آ رہی تھی، پرنیاں نے بوجھل دل کے ساتھ فون ریسو کیا تھا۔

"السلام علیکم!۔"

"وعلیکم السلام! کیا حال ہے جناب، سنا ہے آپ اس وقت لندن کی سیاحت پہ نکلی ہوئی ہو، لالے کا کیا حال ہے؟"

"الحمد للہ، سب ٹھیک ہے۔" اس کا لہجہ و انداز رسانیت سے پر تھا۔

"کہاں ہیں لالہ؟ بات کرواؤ نا ان سے۔"

"ابھی باہر نکلے ہیں، آئیں گے تو خود کال کر لیں گے تمہیں۔"

"وہ اکیلے کہاں چلے گئے بھئی؟ اکیلے گھومنے تھوڑی آئے ہیں وہ، تمہیں ساتھ جانا چاہیے تھا۔" زینب کا انداز ناصحانہ تھا، پرنیاں کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"سنو تمام اچھی جگہوں پہ جا کر اسنیپس ضرور بنوانا، تمہارے بچے بڑے ہو کر دیکھیں گے ان کے ابا اتنے رومینٹک تھے، انہیں خود احساس ہو جائے گا۔" زینب ہنس رہی تھی، پرنیاں اس کا ساتھ نہ دے سکی،

چند مزید باتوں کے بعد زینب نے فون بند کیا تو پرنیاں نے دکھی انداز میں سیل سائیڈ پہ ڈال دیا تھا، جانے کیوں اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگی تھیں، وہ نہیں جانتی تھی معاذ کو کس وقت گھر پہ آنا تھا، اس کے باوجود اس نے پہلے بیڈروم میں آ کر وہاں ڈسٹنگ کی تھی پھر کچن میں آ کر دوپہر کے لئے کھانے کی تیاری کرنے لگی، چکن اور چاول موجود تھے معاذ نے یہاں آنے کے بعد ہی کل ضرورت کی تمام چیزیں لا کر کچن میں رکھ دی تھیں، پرنیاں نے بریانی پکانے کا ارادہ کیا تھا، ساتھ میں رشین سیلڈ اور میٹھے میں کھیر، وہ جانتی تھی معاذ کو دیسی فوڈ پسند تھا، ڈیڑھ گھنٹہ کچن میں مسلسل مصروف رہنے کے بعد وہ باہر آ گئی تھی، بیگ کھول کر اپنا ایک سوٹ نکالا اور باتھ لے کر پہن لیا، کرنے کو کچھ نہیں تھا اب اور اس سے وقت کا شمار دشوار ہو رہا تھا، کچھ نہ سوجھا تو ٹی وی آن کر لیا، مگر مطلب کا ایک بھی پروگرام نہیں تھا جبھی بہت جلد اکتا گئی، اسی دوران سارا دن گزرا تھا، وہ دوپہر کو تو کیا شام کو بھی نہیں آیا تھا، پرنیاں کو اس کے انتظار کی جگہ جھنجھلاہٹ اور پھر غصہ آنے لگا تھا، رات کا اندھیرا خنک لنڈن کی فضاؤں میں پر پھیلانے لگا تھا جب وہ اس کی ہدایت کو فراموش کیے دروازے تک آئی اور بالٹ گرا کر باہر جھانکا راہداری ہنوز سنسان تھی، پتہ نہیں اس فلور میں صرف معاذ کا ہی اپارٹمنٹ آباد ہوا تھا، اس نے گہرا سانس بھر کے دروازہ بند کر دیا، کسی خیال کے تحت وہ اندر آئی اور سیل پہ معاذ کا نمبر ڈائل کیا تھا، بیل جاتی رہی مگر وہ کال پک نہیں کر رہا تھا، پرنیاں عجیب سے احساسات کا شکار ہو کر رہ گئی، اس نے دوبارہ اس کا نمبر ڈائل کیا مگر صورتحال وہی تھی، وہ ہاتھ میں سیل لئے بیٹھی سیل فون کی اسکرین کو گھورتی رہی، تب ہی موبائل خود سے گنگنا اٹھا تھا، نمبر کوئی انجان تھا اس نے بے دلی سے کال ریسو کی تھی۔

''کیا حال ہے بیٹے؟'' دوسری جانب مما تھیں، پرنیاں کا دل ایکدم بھرا سا گیا۔

''انہیں آپ نے فورس کیا تھا مما کہ وہ مجھے یہاں لے کر آئیں؟''

''کیا ہوا بیٹے خیریت؟'' مما فطری طور پر اس سوال سے پریشان ہو اٹھی تھیں۔

''ایسی کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مما کم از کم وہاں آپ کے پاس میں تنہائی کا شکار تو نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی لاچاری اور اضطراب تھا کہ مما دوسری جانب سن سی ہو کر رہ گئیں۔

''کہاں ہے معاذ؟''

''وہ صبح سے نکلے ہوئے ہیں، شاید انہیں میری صورت دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہے۔'' وہ کسی طرح بھی خود پہ قابو نہیں رکھ سکی تھی اور رو پڑی، پتہ نہیں مما سے وہ کیوں اتنی اپنائیت محسوس کرتی تھی کہ اپنا دکھ ان سے چھپا کے رکھ ہی نہیں سکتی تھی، اس سے قبل کہ مما کوئی جواب دیتیں کسی نے سیل فون اس سے جھپٹ لیا تھا، پرنیاں نے سراسیمگی سے پلٹ کر دیکھا اور معاذ کو غیض و غضب کی تصویر بنے اپنے روبرو پا کے دم اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

''میری ماں کو اس طرح پریشان کرتے اور میری شکایتیں لگاتے شرم بہرحال تمہیں نہیں آتی ہو گی۔'' وہ پھنکار کر کہہ رہا تھا، پرنیاں ساکن بیٹھی رہ گئی، خفت کے احساس نے اسے سرخ کر ڈالا، جو بھی تھا بہرحال اس کی پوزیشن واقعی آکورڈ تھی، سر جھکائے وہ ہونٹ کچلتی رہی، معاذ کچھ دیر اسے سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر سیل فون صوفے پہ پٹخ کر تنفر زدہ انداز میں پلٹ کر چلا گیا تھا، پرنیاں بے دم سی وہیں لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

میں نے تم سے
تمہیں مانگا
تو تم مسکرا دیئے
تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے
میری جان!
اپنی چیزیں بھی بھلا مانگی جاتی ہیں

اس نے ایک تھکا ماندا سانس کھینچا اور کتاب بند کر کے سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا لی، اسے کچھ کتابیں درکار تھیں پچھلے کئی دن سے ہر روز مسز آفریدی سے کہتی مگر ان کے پاس تو ایسا ویسا ہی ٹائم نکلتا تھا۔

''تم خود چلی جاؤ ناجنی۔'' انہوں نے کل اسے کہا تھا، وہ چلی جاتی اگر جہان اسے بالخصوص منع نہ کر چکا ہوتا، اب درمیانی راستہ اس نے یہ نکالا کہ شوفر کے ساتھ آ گئی تھی، کتابیں اس کی بنیادی ضرورت تھیں اگر نہ پڑھتی تو شاید سوچیں اسے پاگل کر دیتیں، مارکیٹ میں گھوم پھر کے مطلوبہ بکس خریدنے کے بعد وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو کتاب کی ورق گردانی کرتی ہوئی، وہ ایک جگہ تھم سی گئی تھی، پھر جیسے تھکن کا احساس اندر تک سرائیت کر گیا تھا، گاڑی جھٹکے لگا کر رکی تب وہ چونکی تھی، ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گاڑی سے اتر رہا تھا۔

''کیا ہوا خان چاچا؟'' اس نے الجھ کر ڈرائیور سے سوال کیا تھا۔

''ام کو لگتا ہے بی بی صاحب گاڑی کے انجن میں خرابی پیدا ہو گیا ہے، خیر ام دیکھتا ہے۔'' ڈرائیور دروازہ کھلا چھوڑ کر ڈگی کھول کر جھک گیا کچھ دیر بعد وہ پھر اس کے روبرو تھا۔

''بی بی صاحب ام آپ کو ٹیکسی کرا دیں آپ گھر چلی جاؤ، گاڑی ورکشاپ لے جانا پڑے گا۔'' ڈرائیور کی اطلاع پہ ژالے ٹھنڈا سانس بھر کے گاڑی سے اتر آئی۔

''آپ گاڑی میں بیٹھو بی بی صاحبہ ام ٹیکسی لے کر پھر......''

''آپ پریشان نہ ہوں چاچا میں ٹیکسی کر لیتی ہوں۔'' ڈرائیور کو مطمئن کر کے سڑک کے دوسری سمت آ گئی، ادھر ٹیکسی کے ملنے کا زیادہ امکان تھا مگر ٹیکسی مل کے نہیں دے رہی تھی، وہ دس منٹ کے انتظار کے بعد پریشان ہونے لگی تھی، یہ پریشانی اس وقت سراسیمگی میں بدل گئی جب دن دھاڑے اسے باقاعدہ اغواء کرنے کی کوشش کی گئی، وہ نہیں جانتی تھی وہ غنڈے کون تھے اور کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے تھے، اس کی جان تو ہوا وہاں غیر متوقع طور پہ جہان کو پا کر ہوئی تھی، اس کی مزاحمت اور چیخ و پکار کے نتیجے میں وائیٹ مرسڈیز تیزی سے بھاگتے ہوئے رکی تھی اور جہان بہت عجلت میں نکل کر ان غنڈوں سے بھڑ گیا تھا، پھر ایک گھمسان کا رن پڑا تھا، ژالے فاصلے پہ کھڑی اس یکا یک بدل جانے والی صورتحال پہ ہراساں کانپتی اور روتی رہی تھی، وہ تین غنڈے تھے، جن کا جہان نے مار مار کر حشر بگاڑ دیا تھا، ارد گرد ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا، جو بھی لڑنے والوں کو زبانی کلامی روکتا کبھی فساد کی اصل جڑ ژالے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر سرگوشیوں میں کچھ کہتا تھا، ژالے تو ہر لمحہ زمین میں گڑتی جا رہی تھی، بالآخر یہ جھگڑا

تمام ہوا تھا، جہان غصے میں بھرا ہوا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ ایک طرح سے اسے پٹخ دیا تھا، ژالے خوف اور بے بسی سے کانپتی خائف نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جہان کی اپنی حالت خراب ہو چکی تھی، قیمتی سوٹ صرف گرد آلود ہی نہیں ہو رہا تھا ایک دو جگہ سے رگڑ لگنے کے باعث پھٹ بھی چکا تھا، اس کا داہنا ہاتھ زخمی ہوا تھا اور ماتھے پہ بھی چوٹ کا نشان تھا، ژالے اس کا بہتا خون دیکھ کر جیسے سب کچھ بھول گئی۔

''شاہ آپ کے زخم سے بلیڈنگ ہو رہی ہے۔'' فکرمندی اس کے لہجے سے عیاں تھی، اس نے بے حد تشویش میں گھر کر جہان کے زخم کو چھونا چاہا تھا، جہان نے نہایت تلخی بھرے انداز میں اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔

''اس ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ زور سے پھنکارا، ژالے کی نگاہ اس کے چہرے کے تاثرات پہ پڑی تو ایک دم خائف نظر آنے لگی تھی۔

''مم...... میں اکیلی نہیں آئی تھی ڈرائیور......''

''جسٹ شٹ اپ، میں نے ہرگز آپ سے کوئی وضاحت نہیں مانگی، مجھے بہت اچھی طرح سے اندازہ ہے آپ کس نیچر کی مالک ہیں۔'' جہان کے آگ برساتے لہجے میں کاٹ دار طنز کی تلخی اور سرد مہری تھی، ژالے اپنی جگہ پہ کٹ کر رہ گئی تھی۔

جہان بہت ریش ڈرائیو کرتا ہوا گھر پہنچا تھا، گیٹ کھول کر وہ گاڑی پورٹیکو میں لے آیا، ژالے ہنوز سر جھکائے مضمحل سی بیٹھی تھی، جہان اس پہ توجہ دیئے بنا گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بعد اتر کر چلا گیا، ژالے بھی بددلی سے اس کے پیچھے آئی تھی، جہان سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا وہ جانتی تھی کہ وہ اپنا حلیہ درست کرنا چاہتا ہوگا، ژالے وہیں لاؤنج کے صوفے پہ ٹک گئی، لاؤنج کے ایک کونے میں ہی گھومتا ہوا زینہ اوپر جہان کے بیڈروم میں جاتا تھا، وہ گویا اسی کی منتظر تھی، پندرہ منٹ بعد جہان دوسرے لباس میں نیچے آتا نظر آیا تھا، ژالے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''چلیں؟'' وہ مضطرب نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جہان نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''کچھ دیر رکیں میں کچھ کھا لوں، بھوک لگی ہوئی ہے مجھے۔'' وہ مارے بندھے جواب دیتا پچھلے دروازے سے نکل گیا، ژالے وہیں بیٹھی رہ گئی پھر کچھ خیال آنے پہ اس کے پیچھے کچن میں آئی تو جہان فریج کا دروازہ کھولے کھڑا تھا، شکل پہ عجیب سی جھنجھلاہٹ سوار تھی، ژالے کو سمجھنے میں محض ایک لمحہ لگا تھا اسے کھانے کو کچھ میسر نہیں آیا تھا۔

''آپ بیٹھیں میں کچھ بنا دیتی ہوں آپ کے لئے۔'' وہ کسی طرح بھی اپنی خدمات پیش کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی، جہان نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا پھر چہرے پہ نو لفٹ کا بورڈ سجا لیا۔

''اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے آپ چلیں میں چھوڑ کر آؤں آپ کو۔'' باسکٹ سے ایک سرخ سیب اٹھا کر بائٹ لیتا ہوا وہ باہر آ گیا، ژالے نے ان سنی کر دی تھی، فریج کے بعد اس نے کیبنٹ کھول کر دیکھے، ضرورت کی تقریباً ہر شے موجود تھی، اس نے جہان کے منع کرنے کے باوجود خود کو کام میں مصروف کر لیا تھا، اگلے آدھے گھنٹے بعد وہ قورمے مٹن کے ساتھ رائتہ پھلکے اور سلاد سجا کے ٹرے اس کے سامنے رکھ رہی تھی، جہان جو ٹی وی لاؤنج میں صوفے پہ نیم دراز تھا ٹرے پہ نگاہ ڈالتے ہی واضح حیرانی اس کی

دلکش آنکھوں میں اُمڈ آئی تھی۔

''کھائیں آپ، میں پیپسی لے کر آتی ہوں۔''

''میں پیپسی نہیں پیتا، پانی لایئے گا۔'' جہان نے خود کو سنبھال کر اسے ٹوکا تھا ژالے سر ہلاتی پلٹ گئی تھی، جہان نے نوالہ توڑا سالن بے حد ذائقہ دار تھا، وہ دل ہی دل میں اچھا خاصا حیران ہوا تھا، وہ پانی لے کر آئی تو جہان نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی تھی، جسے ژالے نے مسکرا کر ٹال دیا تھا، جب تک وہ کھانے میں مصروف رہا تھا، ژالے نے محض خود کو اس کی وجاہت اور خوبروئی کے سحر سے بچانے اور اپنی دھڑکنوں کو اعتدال میں رکھنے کی خاطر بکھرا ہوا لاؤنج سمیٹ دیا تھا، کشن کی ترتیب درست کی، کافی اور چائے کے مگ اٹھا کر دھو کر کچن میں رکھے، میگزین سمیٹ کر ٹیبل پہ رکھے، فرنیچر سے گرد صاف کی۔

''آپ چائے پئیں گے یا کافی؟'' جہان کے آگے سے خالی برتنوں کی ٹرے اٹھائے وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے، اب چلیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔''

جہان نیپکن سے ہاتھ پونچھنے کے بعد ہونٹوں کو دبا کر خشک کر رہا تھا، ژالے نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا، جبھی وہ اسے دیکھے گئی تھی۔

''یہ زحمت نہیں ہے شاہ! آپ صرف پانچ منٹ ویٹ کریں میں لاتی ہوں۔'' جہان اب کے کسی قدر جھنجھلایا تھا مگر کچھ بولا نہیں تھا، وہ ہوا کے جھونکے کی مانند باہر نکل گئی پھر جہان نے کافی کے ایک مگ کو کچھ اچنبھے سے دیکھا تھا۔

''آپ کو کافی نہیں پینی تھی تو چائے بنا لیتی۔''

''میں چائے بھی نہیں پیتی۔'' وہ مسکرائی جہان کچھ لمحے اسے دیکھے گیا، گلابی پھولوں جیسی بے حد حسین لڑکی، جس کے شادابی اور جاذبیت کو چھو کر محسوس کرنے کی خواہش خوامخواہ ہی دل میں اترنے لگتی تھی، ژالے نے اس کی نگاہوں کا اٹھنا اور ٹھہرنا محسوس کیا تو دل معمول سے ہٹ کر دھڑکا اور پلکوں پہ جیسے منوں بوجھ آ گرا۔

''آئی ایم ساری، آج میری وجہ سے......''

''اس کی ضرورت نہیں، آپ کی جگہ اگر وہاں کوئی اور بھی لڑکی ہوتی تو میں یقیناً اسی طرح سے اس کی مدد کرتا، یہ میرا اخلاقی فریضہ تھا، کوئی احسان نہیں کیا آپ پہ۔'' وہ ایک بار پھر خشک اور سرد سا ہو گیا تھا، ژالے کا رنگ لمحوں میں پھیکا پڑ گیا، وہ جیسے کسی اذیت کی اتھاہ میں ڈوب کر ابھری، وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی، جہان نے خالی مگ رکھتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا، وہ پتھر کے مجسمے کی مانند ساکن نظر آتی تھی۔

''اب چلنا چاہیے، ایسا نہ ہو آپ کی مما آپ کی تلاش میں یہاں چھاپہ ماریں اور مجھ پہ فرد جرم کی ایک طویل فہرست تیار کر لیں۔''

ژالے نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی، وہ گم صم سی اس کے ساتھ چلتی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

(مجھے لگتا ہے شاہ میں ساری عمر اپنی ساری توانائیاں بھی لگا دوں تو آپ کا دل نہیں جیت سکتی اور اس سے بڑھ کر میرے لئے اذیت انگیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی)۔

جہان کے اسٹیرنگ پہ جمے ہاتھوں پہ نظریں جمائے وہ مایوس و دل گرفتہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

بے مقصد سڑکوں پہ پھرتے اسے صبح سے شام ہونے کو آئی تھی، ایک بار پھر وہ آوارہ گردی پہ نکلا ہوا تھا اور جیسے خود سے پرنیاں سے بھاگتے بھی تھک گیا تھا، موسم سرد تھا، خنک ہوا میں اب برف کے اکا دکا ستارہ نما گالے شامل ہو چکے تھے، اس نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا، پھر بھی سردی اس کی ہڈیوں میں موجود گودے کو بھی جمانے پہ کمر بستہ تھی، اس نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے وہ چلتا ہوا خنک گھاس کے ایک ویران قطع کی جانب آیا جہاں لکڑی کا ایک خوبصورت سفید بنچ پڑا ہوا تھا، ہوا میں سفید گالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی، وہ بنچ پہ گری برف جھاڑ کر وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا، برف باری اب باقاعدہ شروع ہو چکی تھی، کچھ ہی دیر میں برف نے تمام پارک کو ڈھک لیا، وہ بے دل سا وہیں بیٹھا اطراف میں نظریں دوڑتا رہا، درختوں کی ٹہنیاں برف کے بوجھ سے بھاری ہو کر جھک رہی تھیں، برف گرنے کے مخصوص آواز ماحول کا حصہ تھی، آسمان سرخ انگارہ ہو رہا تھا، اس کی رتجگوں کی مظہر آنکھوں کی طرح، کل رات اس کا ایک بار پھر پرنیاں سے شدید جھگڑا ہوا تھا، لزا سے اس کا ٹکراؤ بالکل اتفاقی تھا، معاذ اپنی ضرورت کی اشیاء خرید کر واپس اپارٹمنٹ آ رہا تھا جب لزا اس سے ٹکرا گئی تھی، وہ شاید نشے میں تھی، مگر اس سے اس نے اسے لمحوں میں پہچان لیا تھا اور بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کیا تم مجھے سہارا دو گے؟ ایکچوئیلی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اسے اپنی مجبوری بہت بے بس سے انداز میں بتا رہی تھی، معاذ نے خود بھی دیکھا تھا اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"تمہیں ڈرنک نہیں کرنی چاہیے تھی لزا۔" معاذ نے اسے ٹوکا تھا، جواب میں وہ ہنس پڑی تھی۔

"میں نے ڈرنک نہیں کی شائی بوائے رئیلی، تم اگر مجھے سہارا نہیں دینا چاہتے تو منع کر دو، میں برا نہیں مانوں گی مگر مجھ پہ کم از کم الزام تو نہ لگاؤ۔" معاذ کھسیا گیا تھا، پھر اسی خفت کو مٹانے کی خاطر وہ نا چاہتے ہوئے بھی لزا کو اس کے کمرے تک پہنچانے کی حامی بھر لی تھی، شومئی قسمت کہ اس کے انتظار میں پریشان ہوتی پرنیاں نے بالکونی سے انہیں دیکھ لیا تھا، نظر تو معاذ کی بھی اس پہ پڑ گئی تھی، وہ جتنا بھی جز بز ہوا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ اب وہ لزا کو اس وجہ سے نہیں چھوڑ سکا تھا کہ پرنیاں کیا سوچے گی، وہ جو بھی سوچتی اسے پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، پرنیاں کے ششدر ساکن وجود پہ نگاہ غلط انداز ڈالے بنا وہ لزا کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا تھا۔

"ابھی مت جاؤ نا پلیز، اتنے عرصے بعد ملے ہو کچھ دیر تو بیٹھو۔" معاذ جیسے ہی واپسی کو پلٹا تھا، لزا نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"نہیں رات بہت ہو گئی ہے، میں چلتا ہوں۔"

"تم اب بھی اتنے ہی پرہیزگار ہو حسن۔" وہ اسے پیاسی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، معاذ نے ہونٹ بھینچ لئے اور کچھ کہے بغیر پلٹ آیا تھا، اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پہ رک کر اس نے دروازہ ناک کیا تھا، ایک بار دو بار تین بار مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا، معاذ نے جھنجھلا کر پرنیاں کے سیل پہ کال کی تھی، مگر وہ کال بھی ریسو نہیں کر رہی تھی، معاذ کا طیش آسمان کو چھونے لگا تھا اس پل جب پرنیاں کا ٹیکسٹ اس نے وصول کیا تھا۔

(اسی حرافہ کے پاس جائیں واپس، میں دروازہ نہیں کھولوں گی سمجھے آپ)۔

معاذ کا دماغ گھوم کر رہ گیا، اس نے مشتعل ہو کر ایک زوردار ٹھوکر بند دروازے کو رسید کی تھی، معاً اسے یاد آیا، اس کے پاس ڈپلی کیٹ کی موجود ہے، اپنی یادداشت کو کوستا ہوا وہ دروازہ ان لاکڈ کر کے اندر آیا تو اس کا دماغ غصے کی زیادتی سے دہک رہا تھا۔

"دماغ ٹھیک تھا تمہارا؟ کیا بکواس کر رہی تھیں تم ابھی۔" پرنیاں ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی، اسے اپنے سر پہ سوار دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر بھڑک اٹھی تھی۔

"آپ اندر کیسے آئے؟"

"واٹ نان سنس؟" وہ چیخ پڑا۔

"مجھے ہاتھ مت لگائیں، ڈرنک کی ہوئی ہے نا آپ نے۔" وہ ناک پہ دوپٹہ رکھ کے بدک کر پیچھے ہوئی، معاذ توہین اور طیش سے بپھر اٹھا تھا، اسکا ہاتھ نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ گیا تھا، اس کے طمانچے کے بعد پرنیاں لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو بہت پارسا؟" وہ حلق کے بل غرایا تھا، پرنیاں گال پہ ہاتھ رکھے ششدر کھڑی تھی۔

"آج کے بعد میرے متعلق کوئی ایسی فضول بات کی تو جان سے مار دوں گا سمجھیں؟" وہ پھنکارا پرنیاں کا سکتہ ٹوٹ گیا، ٹپ ٹپ کئی آنسو اس کی آنکھوں سے برسے تھے، کیا نہ تھا اس کی نظروں میں، تاسف، رنج، غیر یقینی، ملال، معاذ نے زور سے سر جھٹکا اسی متنفر انداز میں پلٹ کر بیڈروم میں آ گیا، غصے بھرے انداز میں کوٹ اتارتے وہ اچانک چونک گیا، سگریٹ، پرفیوم کی مہک کے ساتھ اس کے کوٹ میں اک اور بھی مہک آئی تھی، ام الخبائث کی مہک، یہ یقیناً لزا کی قربت کا شاخسانہ تھا کہ اس کے بھیگے لباس کی مہک، اس کے کپڑوں میں بس گئی تھی، پتہ نہیں وہ کس عیاشی کے بعد لوٹی تھی اور پرنیاں کی حساس قوت شامہ نے اس ناگوار بو کو بہت سرعت سے محسوس کیا تھا، معاذ کے اندر ایک عجیب سا تاسف اور خجالت بیک وقت اتری تھی، شاید نہیں یقیناً وہ پرنیاں کے ساتھ زیادتی کر چکا تھا، یہ وہ لڑکی تھی جسے اس نے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ چاہا تھا، جسے دکھ دینے کا تصور بھی اس کے آس پاس نہیں تھا کبھی مگر پھر حالات کچھ ایسی تیزی سے تبدیل ہوئے کہ سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ گیا، اس میں پرنیاں کے نازک مزاج کا جتنا بھی ہاتھ ہو مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس پل معاذ کا چین رخصت ہو چکا تھا، یہ احساس ندامت ہی تھا کہ ہاتھ لینے اور چینج کرنے کے بعد وہ کمرے سے باہر آ گیا تھا، لاؤنج تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اس نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی، وہ صوفے پہ سکڑی سمٹی لیٹی تھی، لرزتا ہوا وجود اس کی گریہ وزاری کا گواہ تھا، معاذ کے دل پہ گرا بوجھ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا، وہ آگے بڑھ آیا تھا پھر ہاتھ پھیلا کر اس کے چہرے سے کمبل سرکایا، اس کا اندازہ بالکل درست تھا، وہ ہنوز رو رہی تھی، بھیگی پلکیں، سرخ ہو کر حشر برپا کرتیں آنکھیں، معاذ اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹا سکا، پرنیاں نے اپنے دوپٹے سے بے دردی سے آنسوؤں کو پونچھا۔

"مجھے بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو ہے کچھ؟" اسے کہنا کچھ اور تھا مگر زبان سے کچھ اور پھسل گیا تھا، پرنیاں کچھ دیر ساکن بیٹھی رہی پھر اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی، معاذ بد دل سا وہیں اسی کی

جگہ پہ بیٹھ گیا، وہ لایعنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اس کی واپسی کا علم نہیں ہو سکا۔

"بات سنو۔" وہ ٹرے رکھ کر باہر جانے کو پلٹی تو معاذ نے بے اختیار پکار لیا تھا، پرنیاں تھم گئی تھی مگر اس کی جانب پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تم کھانا نہیں کھاؤ گی؟" وہ کس قدر مدہم ہو کر بولا تھا۔

"نہیں۔" پرنیاں نے تلخی سے کہا تھا اور کمرے سے نکل گئی، معاذ کچھ لمحوں کو ساکن بیٹھا رہ گیا، پھر اٹھا تھا اور اس کے پیچھے کچن میں آ گیا۔

"برتن اٹھا لو مجھے کھانا نہیں کھانا۔" وہ کافی کا پانی رکھتے ہوئے بولا تھا، پرنیاں نے بغیر کسی ردوکد کے ٹرے اٹھا لی تھی اور خود جا کر پھر سے صوفے پہ لیٹ گئی، معاذ کے اندر یکلخت عجیب سا سناٹا اتر آیا، اسے پرنیاں کی یہ لاتعلقی توڑ کے رکھ گئی تھی، وہ یہ بھول گیا تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل وہ خود اس کے ساتھ بھی زیادتی کر چکا ہے۔

"اسے میری پرواہ ہی نہیں ہے۔" اس نے سخت طیش میں آ کر ہاتھ میں موجود کافی کا جار اور مگ دونوں ماربل کے پختہ فرش پہ پٹخ دیئے تھے، زوردار آواز گونجی اور دونوں ہی شیشے کے برتن ٹوٹ کر بکھر گئے، پرنیاں حیرانی کے عالم میں پھر سے بھاگی آئی تھی، معاذ کو سرخ چہرے کے ساتھ کچن سے نکلتے دیکھ کر وہ گہرا سانس بھر کے یہ نیا پھیلاوہ سمیٹنے میں جت گئی۔

اس کا سیل فون گنگنانے لگا تب وہ چونکا تھا، کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل نکالا، پاکستان سے مما کی کال تھی۔

"جی مما!" وہ بولا تو اس کے منہ سے بھاپ کے بگولے سے نکلنے لگے، برف باری میں شدت آ گئی تھی، سڑک پہ دونوں اطراف اونچے درخت ایستادہ تھے جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے دیکھنے پہ سفید لباس میں ملبوس بوڑھوں کی طرح نظر آتے تھے، نہر کے پانی کی سطح پہ شفاف برف کی نرم تہہ جمی ہوئی تھی۔

"پرنیاں فون کیوں نہیں اٹھا رہی بیٹے؟" مما آواز سے ہی پریشان لگتی تھیں، معاذ نے گہرا سانس کھینچا، پتہ انہیں ہر وقت پرنیاں کی ہڑک کیوں لگی رہتی تھی۔

"تم خود کہاں ہو؟ وہ گھر پہ اکیلی ہے کیا؟"

"میں گھر پہ ہی ہوں، پرنیاں واش روم میں ہے، باہر آتی ہے تو آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔" اس نے محض ان پریشانی کو دور کرنے کی خاطر جھوٹ بولا تھا، چند مزید باتوں کے بعد اس نے فون بند کیا اور گھر کی سمت ہو لیا تھا، وہ یقیناً جان بوجھ کر فون نہیں اٹھاتی تھی۔

راستے بھر وہ یہی سوچ کر تلملاتا رہا تھا، دروازہ ان لاک کر کے وہ اندر آیا تو پرنیاں صوفے پہ اسی طرح کمبل میں لپٹی پڑی تھی، معاذ نے آگے بڑھ کر نہایت خراب موڈ میں اس کے اوپر سے کمبل کھینچا، پرنیاں نیند میں تھی یونہی پڑی رہی، معاذ کو تشویش نے گھیر لیا، وہ بے اختیار آگے بڑھ آیا تھا، اس کا سینے پہ دھرا ہاتھ پکڑ کر نبض کی رفتار محسوس کر رہا تھا، جب پرنیاں کی آنکھ کھلی، اسے یوں اندھیرے میں اپنے اوپر جھکے پا کر وہ قدرے بدحواس ہو کر چیخی تھی، کچھ اندھیرا تھا کچھ وہ ابھی تک نیند کے خمار میں تھی، معاذ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور کسی قدر جھنجلا گیا۔

"سیل کہاں ہے تمہارا؟ سونے کے علاوہ بھی کوئی کام ہے تمہیں؟" وہ جانے کیوں بھڑک گیا تھا، شاید پرنیاں کے نظر انداز کرنے کو اپنی توہین گردانا تھا کہ اسے کروٹ بدلتے دیکھ کر پھنکارا۔

"سونا بہر حال ان تھرڈ کلاس کاموں سے بہتر ہے جو لوگ کرتے پھرتے ہیں یہاں۔" وہ گو کہ منہ میں بڑبڑائی تھی مگر معاذ کی سماعت نے بہت خوبی سے اس کا فقرہ کیچ کیا تھا، اسے ہونٹ بھینچ کر خود پہ ضبط کرنا پڑا تھا۔

"مما کو کال بیک کر لو، پریشان ہیں تمہاری وجہ سے۔" معاذ کوٹ اتار چکا تھا، اطلاع دے کر دروازے سے نکل گیا، پرنیاں کو اپنے سیل کی تلاش کرنی پڑی، معاذ کھانا ٹرے میں لے کر وہاں آیا تو پرنیاں صوفے پہ دونوں ٹانگیں چڑھائے بیٹھی کمبل میں چھپی مما سے بات کر رہی تھی۔

"یہاں سردی بہت ہے مما! مجھے ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا یہاں کی سردی کی اتنی خطرناک ہے ورنہ اچھی طرح انتظام کر کے آتی۔" معاذ نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا، اس کی چھوٹی سی ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی۔

"انتظام تو آپ کے پاس موجود ہے، میرے بستر میں آ جاؤ، سردی کی شدت دم دبا کر بھاگ جائے گی۔" وہ فون پہ بات کر کے فارغ ہوئی تو معاذ نے ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے اس کی جانب فقرہ اچھالا تھا، پرنیاں اپنے دھیان میں تھی مگر اس کی بات پہ پہلے غیر یقین سے اسے دیکھا تھا پھر اس کا چہرا جانے کس جذبے کے تحت سرخ پڑ گیا تھا، کچھ کہے بغیر کمبل ہٹا کر وہ ایکدم سے اٹھی، معاذ جو اسی صوفے پہ براجمان تھا ایکدم اس کی کلائی تھام لی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" پرنیاں کو جھٹکا لگا تھا۔

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔" اس کا لہجہ بھینچا ہوا مگر سرد تھا۔

"اگر نہ چھوڑوں تو......؟" معاذ نے اسے تپا کر حظ لینا چاہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہے تو میں بتا دوں، یہ میں ہوں پرنیاں، آپ کی یہاں کی نیبر نہ وہ فرنگن ہوں نہ ہی پاکستان میں آپ پہ دل و جان لٹانے والی سستے جذبات رکھنے والی کوئی......" اس کا تند خیز لہجہ بے حد شدید اور تنفر سے بھرپور تھا، وہ ہانپ سی گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" معاذ نے مسکراہٹ ضبط کی اور اسے دیکھا تھا۔

"آپ نشے میں ہیں پھر، ڈرنک کی آپ نے پھر؟" وہ نا صرف مشکوک ہوئی بلکہ ایک دم سراسیمہ بھی ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ پہ معاذ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی یعنی وہ اس حد تک بدگمان تھی اس سے۔

"تم میرے بارے میں اتنا غلط کیوں سوچتی ہو ہمیشہ۔" بے تحاشا امڈتے طیش کو دبا کر اس نے تھکن زدہ انداز میں سوال کیا تھا، مگر پرنیاں کے لبوں پہ زہر خند پھیل گیا تھا۔

"میں سوچتی نہیں ہوں، مجھے یقین ہے، حیرت بس اس بات پہ ہے کہ آپ مجھے کیوں ساتھ لے کر آئے؟ آپ نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں آپ کے بھیدوں سے واقف ہو جاؤں گی، یا پھر آپ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ میں کچھ بھی جان لوں آپ کو فرق نہیں پڑتا؟" اس کا لہجہ بوجھل تھا، پتہ نہیں طنز یا دکھ سے معاذ سمجھنے سے قاصر رہا، اسے تو اس کے الفاظ نے آگ لگا دی تھی۔

"ہاں یہی حقیقت ہے کہ میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتا، ویسے ہی جیسے تمہیں مجھ سے نہ محبت ہے نہ

کبھی ہوگی، کیوں نفرت کرتی ہو مجھ سے، میں نے بھی تو تم سے وجہ نہیں پوچھی، تم بھی اسی چیز سے سمجھوتہ کر لو تو بہتر ہوگا۔" وہ حلق کے بل چنگھاڑ رہا تھا، پھر تن فن کرتا اپنے کمرے میں جا گھسا، پرنیاں کتنی دیر ساکت رہی پھر اس کے ہونٹوں پہ اضمحلال بکھرنے لگا تھا، اس ساری رات وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پہ کروٹیں بدلتے اور جاگتے رہے تھے، پرنیاں تو بار بار برستے آسمان کی طرح نیر بھی بہاتی رہی تھی مگر معاذ صرف سلگا تھا، جہان کی مغز ماری تو محض ایک بہانہ تھی اس کی جانب پیش رفت کا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی جانب پیش رفت کر چکا تھا، وہ اپنی زندگی کو ایک بے بنیاد بات کے پیچھے برباد نہیں کرنا چاہتا تھا مگر محض اس کے اچھے جذبے ہی تو اہم نہیں تھے، فریق ثانی کا رویہ بھی اہم کردار ادا کرتا تھا اور وہ پھر ثابت کر چکی تھی کہ اس کے دل میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

☆☆☆

جب وہ سو کر اٹھا تو پرنیاں کو وہیں کمرے میں ہی موجود پایا تھا، وہ وارڈ روب کھولے کھڑی تھی اسے اٹھتے دیکھ کر یوں کھنکاری جیسے متوجہ کرنا چاہتی ہو، معاذ پھر بھی نظر انداز کیے واش روم میں گھس گیا، باتھ لے کر نکلا تو وہ کمرے میں نہیں تھی، معاذ بے دلی سے تیار ہوا تھا، معاذ ٹی وی کے آگے آ کر بیٹھ گیا، یہ ان کا ہنی مون تھا، ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ میں مقید وہ دونوں ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلوں پہ موجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے پہ مجبور تھے، معاذ قنوطیت کا شکار ہوتا چینل سرچنگ میں مصروف تھا جب پرنیاں نے ناشتے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے رکھی معاذ نے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

"ہم واپس کب جا رہے ہیں۔" معاذ ناشتے کی سمت متوجہ ہوا تو پرنیاں نے سوال کیا تھا، نوالہ معاذ کے حلق میں اٹک گیا، انہیں یہاں آئے آج پانچواں دن تھا، پپا کی خواہش تھی وہ کم از کم پندرہ دن تک یہاں رہیں اور وہ اس سے محض چار دن میں اکتا گئی تھی۔

"میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" معاذ کی خاموشی اور لاتعلقی پہ وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولی تھی۔

"میں جانتا ہوں تمہیں یہاں میرے ساتھ رہنا پسند نہیں مگر اتنی جلدی واپس جا کے ہم اپنے گھر والوں کو مشکوک کر دیں گے، جتنا بھی کڑا سہی مگر تمہیں یہ وقت برداشت تو کرنا پڑے گا۔" ٹرے ہاتھ سے پرے سرکا کر وہ کسی قدر تلخی سے بولا تو پرنیاں کو اس الزام تراشی پہ تپ چڑھ گئی تھی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ صرف میں آپ کو برداشت کرنے سے قاصر ہوں؟ آپ کی جو حرکتیں ہیں ان پہ بھی غور فرمائیں۔"

"کیا حرکتیں ہیں میری بتاؤ مجھے؟"

"آپ کو تو جیسے کچھ پتہ نہیں، اتنے معصوم نہ بنیں۔" وہ سلگ سلگ گئی۔

"چلو اس بحث کو چھوڑو، یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایتیں ہیں؟" معاذ نے الفاظ کے ہیر پھیر سے اسے گھیرنا چاہا۔

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" پرنیاں کو صاف لگا تھا وہ اس سے اظہار چاہ رہا ہے، مگر وہ کیوں خود کو گراتی، اب تو ہرگز نہیں جبکہ وہ اس پہ اس کی حیثیت بہت بار واضح کر چکا تھا، اس کی انا اسے ہرگز اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اس پہ اپنی محبت آشکار کر دیتی، جبھی خشک اور سرد آواز میں بولی تھی، معاذ کی رنگت متغیر ہوئی تھی، اس نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

"تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، شکایت اور شکوے وہاں ہوتے ہیں جہاں محبت ہو، جہاں محبت نہ ہو وہاں ان کا کیا کام۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ بوجھل ہی نہیں بھینچا ہوا بھی تھا، پرنیاں نے حیرانی سے اس کی کیفیت کو نوٹس کیا تھا مگر دانستہ غفلت برت لی۔

"ہمارے بزرگ ہماری زندگی کا فیصلہ کرتے وقت پتہ نہیں اتنی ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں، ان کی اس نام نہاد ضد کی وجہ سے دو زندگیاں خراب ہو جاتی ہیں انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا۔" وہ اسی کیفیت کے زیر اثر کہہ رہا تھا، اب کے پرنیاں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"تو آپ کی زندگی خراب ہو چکی ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے میں بہت خوش ہوں؟" معاذ نے طنز بھری نظروں سے اسے دیکھا، پرنیاں کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزرا تھا، اس نے بے ساختہ ہونٹوں کو باہم بھینچ لیا تھا، کچھ کہے بغیر وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی، اسے نہیں سمجھ آئی تھی معاذ اتنا حساس کیوں ہو رہا تھا، البتہ وہ اگر یہاں سے جانا چاہ رہی تھی تو اس کی وجہ کچھ اور تھی، وہ ہرگز نہیں جانتی تھی اس رات کی وہ غلطی اس جگہ پر ختم نہیں ہوئی، وہ جو کوئی بھی تھا، پرنیاں نے تو ڈھنگ سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی مگر وہ شاید اسے اچھی طرح سے جان گیا تھا، کل وہ اپنے دھیان میں ٹیرس پہ کھڑی تھی جب سامنے والے اپارٹمنٹ کے ٹیرس کا دروازہ کھولا تھا اور ایک لمبے قد کا آدمی ہاتھ میں شمپین کی بوتل لئے ریلنگ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا، اوپر ہٹاتے اس کی نگاہ سرسری انداز میں پرنیاں کی سمت اٹھی تھی اگلے لمحے وہ چونک گیا تھا۔

"ہی تم وہی ہو نا جو اس رات میرے پاس آئی تھیں مگر پھر بھاگ کیوں گئی تھیں؟" وہ سفید فام تھا اور اچھا خاصا خوبرو مگر دانت نکوس کر بات کرتا ہوا پرنیاں کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا، دل کو اسی کا تب ہی دھک سے رہ گیا تھا، جب اس نے اس منحوس ملاقات کا حوالہ دیا تھا کچھ کہے سنے بغیر وہ پلٹی تھی اور سرعت سے اندر چلی گئی مگر وہ ہرگز نہیں جانتی تھی اس کا یہ رویہ بھی اسے بددل نہیں کرے گا، وہ نیچے آئی تو دروازے کی بیل زور و شور سے بج رہی تھی، پرنیاں یہی سمجھی کہ معاذ واپس آیا ہے مگر میجک آئی سے اسی منحوس کی شکل دیکھ کر صحیح معنوں میں پرنیاں کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

"دروازہ کھولو سویٹ ہارٹ، تم مجھ سے آخر اتنی خفا کیوں ہو؟ میں تو اس دن سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا، تھینک گاڈ تم آج نظر تو آئیں۔" وہ صحیح معنوں میں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا تھا، پرنیاں کا دل دھک دھک کرنے لگا، وہ خوفزدہ ہو کر اندر کمرے میں آ گھسی اور دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا، تب ہی لینڈ لائن کی بیل ہوئی تھی پرنیاں اپنی جگہ پہ زور سے اچھل گئی، اس تسلسل سے بجتے فون سے عاجز ہو کر اس نے کال ریسو کی تھی۔

"تم مجھ سے بات نہیں کرو گی تو میں زبردستی تمہارے گھر میں گھس آؤں گا، یاد رکھو یہ میرے لئے قطعی مشکل کام نہیں ہے۔" اس کی دھمکی نے پرنیاں کی رہی سہی جان بھی نکال دی، ریسور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

(جاری ہے)

☆☆☆

خالدہ نثار

وہ رات بے حد طویل تھی، سیاہ تھی اور سرد تھی اور وہ اسی طویل، سیاہ اور سرد رات میں تنہا کھڑا اپنے زندگی میں اچانک آ جانے والے طوفان پر ششدر کھڑا تھا، اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں تھیں اسے لگتا تھا اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، زندگی اسے ایک عجیب دوراہے پر لے آئی تھی، اسے فیصلہ کرنا تھا اور ابھی کرنا تھا، دو چیزیں دو راستے، ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مختلف سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو چکا تھا، مگر جوں جوں رات بیت رہی تھی فیصلے کا وقت بھی قریب آتا جا رہا تھا، اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا، دکھتی آنکھوں کو انگلیوں سے دبایا اور پھر جیب میں موجود سیل نکال لیا تھا، نمبر ملا کر سیل کان سے لگائے وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز کا منتظر تھا، چند لمحوں بعد ہی دوسری طرف سے

ناولٹ

فریش سی آواز گونجی تھی، اس نے انتہائی مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا، اس نے دل کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

وہ جس وقت تھانے کی حدود میں داخل ہوئی سہ پہر ڈھل رہی تھی، بنچ پر بیٹھے اونگھتے سپاہی کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی چوپٹ کھلیں تھیں۔

"السلام علیکم!" اس کے سلام کرنے پر کرسی پر بیٹھے ایس ایچ او نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے کے بعد جواباً سر ہلا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"میرا نام جیا فاروق احمد ہے۔" کرسی پر بیٹھ کر اس نے بہت اطمینان سے اپنا تعارف کروایا تو ان دونوں سے ذرا فاصلے پر سول کپڑوں میں ملبوس اے ایس پی ضرغام عباس

نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس پر ڈالی تھی اور پھر سے اپنے سامنے کھلی بوسیدہ سی فائل کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''جی مس جیا ہم کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟'' لڑکی کو دیکھ کر ایس ایچ او کا لہجہ کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔

''مجھے ایف آئی آر کٹوانی ہے۔'' جیا نے اسی اعتماد سے جواب دیا تھا۔

''اچھا کس کے خلاف؟'' ایس ایچ او فضل نے بہت اطمینان سے پوچھا، اس بات سے بے خبر کے ابھی چند لمحوں میں اس کا سارا اطمینان و سکون غائب ہونے والا ہے۔

''اعظم شہریار کے خلاف۔'' وہ بہت سکون سے بتا کر اب اس کے چہرے پر نظریں گاڑھے بیٹھی تھی۔

''جی کس کے خلاف؟'' ایس ایچ او فضل کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے، ایس پی ضرغام عباس نے بھی بہت چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''سابق صوبائی وزیر اور موجود ایم این اے اعظم شہریار کے خلاف۔'' اس نے دوبارہ ذرا تفصیل سے جواب دیا تھا۔

''میم آپ ہوش میں تو ہیں؟'' ایس ایچ او فضل کا خوشگوار لہجہ لمحوں میں طنزیہ ہوا تھا۔

''جی ہاں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور چاہتی ہوں کے آپ میری کمپلین درج کریں اور اس پر ایکشن لیں۔''

''اچھا کس جرم میں؟''

''مجھے اور میری فیملی کو ہراساں کرنے، میرے ساتھ بدتمیزی کرنے اور ہمیں بلیک میل کرنے کے جرم میں۔'' ایس ایچ او فضل نے آگے ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جو سوال کیا تھا اس کا جواب اس نے بالکل اسی طرح آگے ہو کر اور پر اعتماد انداز میں اس کی طرف دیکھتے دیا تھا۔

ایس پی ضرغام عباس بھی فائل بند کر کے اب ان دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

''دیکھیں مس!'' چند لمحوں بعد انسپکٹر فضل نے ایک طویل سانس خارج کر کے کہا تھا۔

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''کیا بات کر رہے ہیں آپ ایس ایچ او صاحب۔'' اس کی پیشانی لمحوں میں شکن آلود ہوئی تھی۔

''قانون کے رکھوالے ہو کر آپ ایسی بات کیسے کر سکتے ہیں۔''

''دیکھیں میڈم ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔'' ایس ایچ او فضل کا انداز بے بس سا تھا۔

''جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں، آپ کی مجبوریوں کو۔'' اس کے گہرے طنز پر وہ پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔

''جانتی ہیں تو یہ بھی جانتی ہوں گی کے آپ کا مطالبہ ماننا ہمارے بس کی بات نہیں۔''

''تو اس کا مطلب آپ انکار کر رہے ہیں؟'' اس کا سوالیہ انداز بہت تیکھا تھا۔

''ایک منٹ میڈم، آپ ذرا ریلیکس ہو کر بیٹھیں، ہم ابھی اعظم صاحب سے رابطہ کر لیتے ہیں جو بھی ایشو ہے مل بیٹھ کر حل کر لیتے ہیں۔'' ایس ایچ او فضل کا انداز مصالحانہ تھا۔

''آپ میرے سوال کا جواب دیں آپ میری کمپلین درج کریں گے یا نہیں۔''

''دیکھیں مس مسئلہ کمپلین درج کرنے کا نہیں ہے، لیکن اس کے بعد پھر آپ کے اپنے لئے بھی بہت سے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔'' ایس ایچ او فضل نے نجانے در پردہ اسے سمجھایا تھا یا دھمکایا تھا۔

''یہاں انصاف ملنا آسان نہیں ہے مس جیا فاروق احمد۔'' اب کے وہ آہستہ سے بڑبڑایا تھا۔

''مجھے حیرت ہے کہ قانون کی کرسی پر بیٹھ کر آپ اس طرح کی بات کر رہے ہیں اور اگر انصاف ملنا مشکل ہے تو پھر آپ جیسے لوگوں کو یہاں کیوں بیٹھایا گیا ہے گھر کیوں نہیں بھیج دیا جاتا، جب آپ اور آپ کا قانون کسی مصیبت زدہ کی مدد ہی نہیں کر سکتا تو آپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' اس کے تلخ انداز پر ایس ایچ او فضل کا چہرا سرخ ہوا تھا۔

''آپ حد سے بڑھ رہی ہیں میڈم۔''

''آپ میری کمپلین درج کریں گے یا نہیں۔'' اس کے دوٹوک پوچھنے پر جواب بھی دو ٹوک آیا تھا۔

''او کے۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھایا، کندھے سے لگایا اور واپس مڑی تھی۔

''ایک منٹ مس جیا۔'' اس کے پیچھے ایک بھاری آواز گونجی تھی۔

☆☆☆

اس کی بات پر اس کی ماں نے بہت غصیلی نظر اس پر ڈالی تھی۔

''کیا ملے گا تجھے یہ سب کر کے، سوائے اپنا تماشہ آپ بنانے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''نہیں خالہ بات بہت آگے جا چکی ہے، اب خاموش بھی تو نہیں رہا جا سکتا تھا۔'' سامعیہ اگر اندر سے خود بھی پریشان تھی مگر ان پر ظاہر کیے بنا اس نے جیا کی سائیڈ لی تھی۔

''اب کچھ نہ کچھ تو ہو جائے گا۔''

''اچھا کیا وہ شخص پکڑا جائے گا؟'' اس کی ماں نے سوال سامعیہ سے کیا تھا اور طنزیہ نظر اس

پر ڈالی تھی جو بہت اطمینان سے دال چاول
کھانے میں مصروف تھی۔
''بالکل خالہ۔'' سامعیہ نے گلاس اور پانی
کی بوتل جیا کے آگے رکھتے سر ہلایا تھا۔
''میں تو تجھے بڑا سمجھدار سمجھتی تھی سامعیہ
بچے پر لگتا ہے تو بھی دیوانے کے خواب دیکھنے
والوں میں سے ہے۔''
''تو کیا ہم ظلم پر خاموش ہو کے بیٹھ جائیں،
انصاف نہ مانگیں۔'' اس کی خاموشی ٹوٹی تھی اور
اماں کے غصے کا گراف بلند ہونا شروع ہوا تھا۔
''لو جی پاس نہیں دانے، خالہ چلی بھنانے،
انصاف نہ مانگیں، انصاف نہ ہوا ہنڈی ہو گئی جو
لینے چلی ہیں، گھر میں کھانے کو روٹی نہیں، باپ
بیماریوں کی پوٹ بنا چارپائی پر لیٹا ہے، ماں دو جمع
دو کر کے وقت گزار رہی ہے اور یہ چلی ہیں
انصاف لینے او بی بی، ہم ابھی پاکستان میں ہی
ہیں، لندن، امریکہ شفٹ نہیں ہوئے۔''
''خالہ اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔'' سامعیہ
نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔
''ہاں بیٹا جو ہونا تھا ہو چکا اب تو بس
بھگتان بھگتنا باقی ہے۔''

☆☆☆

''تمہیں نہیں لگتا تم نے جذبات میں آ کر
غلط قدم اٹھایا ہے؟'' رات کو بستر پر لیٹے لیٹے
سامعیہ نے سوال کیا تھا، وہ جو رخ موڑے سونے
کی کوشش کر رہی تھی جھٹکے سے سیدھی ہوئی تھی۔
''غلط قدم؟ کیا میرا انصاف مانگنا غلط ہے یا
اس ذلیل انسان کے چہرے پر پڑا نقاب الٹ کر
اس کا مکروہ چہرا سب کے سامنے لانا غلط ہے۔''
اس کے انداز پر سوال پر سامعیہ نے گہری سانس
بھری تھی۔
''تمہیں کیا لگتا ہے جیا انصاف اتنی جلدی
اور آسانی سے مل جایا کرتا ہے۔''
''کوشش تو کی جا سکتی ہے ناں۔'' اس نے
مضبوط لہجے میں جواب دیا تا، سامعیہ کے لبوں پر
اداس سی مسکراہٹ چھلکی تھی۔
''نہیں جیا، یہاں انصاف مانگا نہیں جاتا
خریدا جاتا ہے اور ہم جیسے لوگ کبھی انصاف کی
قیمت نہیں چکا سکتے۔''
''تو کیا مایوس ہو کے بیٹھ جائیں ہار مان
لیں۔'' اس کے سوال پر سامعیہ نے خاموشی سے
سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

''کیا بکواس کر رہے ہو فضل؟'' اعظم
شہریار کی غضبناک آواز گونجی تو فضل کا سر مزید
نیچے ہوا تھا۔
''تم نے میرے خلاف اعظم شہریار کے
خلاف ایف آئی آر کاٹی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ
ہم تمہیں اور تمہارے قانون دونوں کو جیب میں
لئے پھرتے ہیں۔'' وہ یہاں سے وہاں چلتے بہت
غصے سے بول رہا تھا اور فضل کا دل خزاں رسیدہ
پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔
''سر میں بہت مجبور ہو گیا تھا اور پھر ضرغام
صاحب......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑا تھا،
اعظم شہریار بہت بری طرح سے چونکا تھا۔
''تو اس میں ضرغام کا ہاتھ ہے؟'' اس کے
سوالیہ انداز پر فضل نے اثبات میں گردن ہلائی
تھی۔
''ہوں۔'' وہ ہنکارا بھرتے خاموش ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ اچھی خاصی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا اس
کا ارادہ جلدی گھر پہنچنے کا تھا، وہ اچھا خاصا تھک
چکا تھا اور اب گھر جا کر آرام کرنا چاہ رہا تھا۔
مین روڈ سے اس کی گاڑی کالونی کی سڑک

پر مڑی تھی جب ڈیش بورڈ پر دھرا اس کا سیل بجنے
لگا تھا، گاڑی سائیڈ پر روکتے اس نے سیل اٹھا کر
نمبر دیکھا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی
تھی، تھکن لمحوں میں اڑتی محسوس ہوئی تھی،
بیزاریت شگفتگی میں تبدیل ہوئی تھی، ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ ایسے چہرے، جو ہمارے دل کے
اتنے قریب ہوتے ہیں اور ہمارے لئے اتنے
اہم ہوتے ہیں، کہ ان کے تصور سے ہی من مندر
میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں، جو جینے کی وجہ اور
مرنے کا سبب ہوتے ہیں، جن کے بغیر زندگی،
زندگی نہیں لگتی، جن سے جڑا رشتہ اور تعلق اتنا
مضبوط ہوتا ہے کہ باقی ہر شے ہی اس کے سامنے
ہیچ لگتی ہے تو ''مغوی شہریار'' بھی ضرغام عباس کی
زندگی میں ایسا ہی مقام رکھتی تھی، ضرغام عباس
اپنے مضبوط سیاسی بیک گراؤنڈ رکھنے والے باپ
کا اکلوتا بیٹا، وہ اکلوتا بھی تھا، لاڈلا بھی، اس کے
باپ نے اس کی پرورش بہت شاہانہ انداز میں کی
تھی، وہ اس کی تربیت بھی اپنے اصولوں کے
مطابق کرنا چاہتے تھے مگر یہ اس کی ماں تھی، جس
نے اس معاملے میں ان کی زیادہ چلنے نہیں دی تھی
اور اس کی تربیت اس کے باپ کے اصولوں کے
مطابق نہیں انسانیت کے اصولوں کے مطابق کی
تھی، وہ اسے صرف ایک کامیاب سیاست دان،
وڈیرا یا سردار نہیں ایک بہت اچھا انسان بھی بنانا
چاہتی تھیں، وہ صرف اسے دولت کمانے کے
طریقے نہیں سکھانا چاہتی تھیں وہ اسے رشتے
بنانے اور انہیں نبھانے کا گر بھی سکھانا چاہتی تھی،
وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اختیار، طاقت اور دولت
غلط چیزیں نہیں ہیں ان کا غلط استعمال غلط چیز
ہے، وقت گزرنے کے ساتھ انہوں نے یہ ساری
چیزیں اسے سکھائیں تھیں اور اسے ایک اچھا اور
ذمہ دار انسان بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، وقت
گزرنے کے ساتھ وہ ایک مہذب انسان ایک
فرمانبردار اور ذمہ دار بیٹے کے طور پر سامنے آیا
تھا، بابا جان چاہتے تھے کہ وہ سیاست میں آئے
اور ان کی پارٹی جوائن کرے، مگر یہ وہ واحد بات
تھی جو وہ ان کی کبھی نہیں مان سکتا تھا، ویسے بھی
سیاست وہ چیز تھی جس میں اس کی سرے سے
دلچسپی ہی نہیں تھی، ہاں البتہ زمینوں وغیرہ کے
معاملات کو وہ ان کے ساتھ مل کر بہت اچھے
طریقے سے دیکھ لیتا تھا اور ساتھ ساتھ اس نے
اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تھی اور جب اس نے سی
ایس ایس کا امتحان دینا چاہا تھا تب زیاد چچا تھے
جنہوں نے بابا جان کو منایا تھا، ورنہ ان کی مرضی
تھی اور خواہش بھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ان
کی پارٹی کے یوتھ ونگ کو جوائن کرے، بہر حال
زیاد چچا اور بی جان کی کوششوں کے باعث وہ نیم
رضامند ہو گئے تھے، زندگی سیدھے سبھاؤ ہی گزر
رہی تھی، جب اچانک ایک دن اس نے مغوی
شہریار کو دیکھا تھا، وہ اپنی چچا زاد بہن کو کالج
ڈراپ کرنے آیا تھا جب اس کی نظر گلابی لباس
پہنے اس گلابی رنگت والی لڑکی پر اٹھی تھی اور ٹھہر گئی
تھی، ٹھٹک گئی تھی، یہ نہیں تھا کہ اس نے
خوبصورت یا حسین چہرے پہلے کبھی نہیں دیکھے
تھے، وہ خود بہت ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک تھا اور
بہت سی حسین اور طرح دار لڑکیاں اس کی طرف
بڑھی تھیں، مگر اس کی طرف سے ہمیشہ نو لفٹ والا
تاثر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا، کیونکہ
فلرٹ وہ کرتا نہیں تھا اور محبت جیسا کوئی بھی
جذبہ......اسے ابھی تک اسے چھو کر نہیں گزرا تھا،
ویسے بھی وہ ان ساری چیزوں کو وقت کا زیاں
سمجھتا تھا، لیکن مغوی شہریار، جس نے اس جیسے
بندے کو بھی ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا تھا، وہ کچھ
لمحے بنا پلک جھپکے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا،

ہوش اسے تب آیا تھا جب وہ اس کے قریب سے گزر کر کالج گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

''ایکسکیوز می مس۔'' وہ قطعی غیر ارادی طور پر اور بے اختیاری کے عالم میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

''جی!'' وہ پلٹ کر الجھن آمیز تاثرات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی اور اب اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یوں اسے روکنے اور مخاطب کرنے کا کیا جواز پیش کرے۔

''وہ...... مجھے...... آپ سے کہنا تھا کہ...... آپ نے گاڑی غلط جگہ پارک کی ہے۔'' ادھر ادھر نگاہ گھماتے بہرحال اسے ایک بہانہ تو سوجھ ہی گیا تھا، اس لڑکی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر شرمندگی پھیلی تھی۔

''او...... آئی ایم سوری...... ایکچوئیلی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے تو...... بس سمجھ نہیں لگی۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تھی۔

''کیوں کیا ہوا آپ کو...... آئی مین اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آپ کو گھر پہ آرام کرنا چاہیے تھا۔'' اس کی سادگی بھرے لہجے پر اس نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اور اگر طبیعت خراب ہی گھر والوں کی وجہ سے ہو تو۔'' اس لڑکی نے بہت آہستگی سے کہا تھا، مگر بہرحال اس نے سن لیا تھا، مگر بنا ظاہر کیے وہ اسے اپنا تعارف دینے لگا تھا۔

''آئی ایم ضرغام عباس، مغوی شہریار۔'' جواباً اس نے اپنا نام بتایا تھا، یہ تھی پہلی ملاقات جو اتفاقیہ تھی، اچانک تھی، مگر آگے ہونے والی کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بھی تھی، اس دن واپس گھر آئے، آفس جاتے، کام کے دوران، کھانا کھاتے، چائے پیتے، لاشعوری طور پر وہ مغوی شہریار کو سوچ گیا تھا، کیا تھا اس میں ایسا جس نے ضرغام عباس جیسے بندے کو بھی پابند کر لیا تھا یہ حسن نہیں تھا، یہ کچھ اور تھا۔

☆☆☆

بہت جلد وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے، بے تکلفی دوستی میں اور دوستی محبت میں کب بدلی، دونوں کے گھر والوں کو خبر نہیں ہو سکی تھی، جب خبر ہوئی تو خاصا پانی گزر چکا تھا، وہ ضرغام عباس تھا جس کے لئے مغوی شہریار کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا اور وہ مغوی شہریار تھی جس نے جب اسے ضرغام عباس کو دیکھا تھا اسے باقی سب کچھ نظر آنا بند ہو گیا تھا، دونوں کا تعلق اچھے اور متمول گھرانوں اور اونچے خاندانوں سے تھا، مسئلہ دولت کا نہیں تھا وہ دونوں خاندانوں کے پاس بے تحاشا تھی، مسئلہ سیاست کا تھا، ضرغام کے بابا جان اور مغوی شہریار کے لالہ اعظم شہریار دو انتہائی مخالف سوچ و نظریہ رکھنے والی جماعتوں سے تھا اور ماضی میں جن لوگوں پر کیچڑ اچھالتے، عزت کنگالتے نہ تھکتے ہوں ان سے ایسی نازک اور قریب کی رشتہ داری، کبھی نہیں، سوچنا بھی نہیں، دونوں طرف سے ایک جیسے حالات یکساں جوابات، وہ دونوں پریشان بھی تھے اور پرامید بھی، محبت ایسی چیز ہے جو بیک وقت انسان کی مضبوطی بھی ہوتی ہے اور کمزوری بھی اور ان دونوں نے بھی اپنے گھر والوں کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھایا تھا اور بالآخر انہیں مان لیا تھا، دل سے کوئی بھی نہیں مانا تھا مگر بچوں کی خوشی کو یہ کڑوا گھونٹ پینے کو دونوں تیار ہو گئے تھے، دونوں پر ہی اپنی اپنی پارٹی کی طرف سے غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا اور دونوں ہی ہمہ وقت اس دھوم دھام سے ہونے والی منگنی کو ختم

کرنے کی سوچوں میں گم رہتے تھے۔

☆☆☆

وہ بہت فریش موڈ کے ساتھ گھر لوٹا تھا جب اسے اعظم شہریار کی آمد کی اطلاع ملی تھی، بابا جان ان دنوں اسلام آباد میں تھے، بی جان بھی ان کے ہمراہ تھیں، ڈرائنگ روم میں اعظم شہریار کی میزبانی کو زیاد چچا موجود تھے۔

''السلام علیکم۔'' سنجیدہ سے لہجے میں دیئے گئے سلام پر اعظم شہریار نے اپنی بات روک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر پرجوش سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''آیئے آیئے ضرغام صاحب، آپ تو ہمارے لئے عید کا چاند ہی ہو گئے، اب ایسی بھی کیا فرض شناسی کے انسان اپنوں کو ہی بھول جائے۔'' اسے گلے لگاتے اس نے در پردہ جو جتانے کی کوشش کی تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

''بس کیا کیجئے سر، بچپن سے سکھا ہی یہی ہے کہ فرض اور قرض ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔'' اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے اس نے بھی مسکرا جواب دیا تھا۔

''درست سو فیصد درست کہا آپ نے ضرغام صاحب، میں خود قرض رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں جب تک سود سمیت چکا نہ دوں، چین نہیں پڑتا۔'' سگریٹ سلگاتے وہ در پردہ اسے دھمکا بھی رہا تھا، جواباً وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہولے سے مسکرایا تھا، اعظم شہریار کچھ دیر ہی مزید بیٹھا تھا، جاتے سے اس سے مصافحہ کرتے اس نے ایک ہی جملہ بولا تھا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا داماد صاحب۔'' اور پھر آگے بڑھ کر اپنی پجارو میں بیٹھ گیا تھا، وہ چند لمحے وہیں کھڑا دیا پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے تیزی سے چلتے قلم کو ریسٹ دی اور ہاتھ بڑھا کر کب سے بجتے لینڈ لائن کا ریسور اٹھایا تھا۔

''کہتے ہیں انسان کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے، کیونکہ بنا سوچے سمجھے اٹھائے گئے قدم میں غلطی کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔'' دوسری طرف سے ٹھنڈے لہجے اور سرد انداز نے اسے لب بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''غلطی کرنے کی ہمت ہو تو نقصان اٹھانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے، غلطی آپ نے کر لی ہے نقصان ہم کیے دیتے ہیں۔'' دھمکی آمیز لہجہ اس لمحوں میں آتش فشاں بنا گیا تھا۔

''بکواس بند کرواپنی اور یہ جو تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو ناں بختیار علی اور جس کی بلہ شیری پر کر رہے ہو تو جان لو کہ میں اپنے دل میں اگر کسی کا خوف رکھتی ہوں تو وہ ذات صرف میرے رب کی ہے، انسان کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور یہ بھی یاد رکھنا مراد بی بی کو انصاف مل کر رہے گا، تمہارے پیچھے ایک چھوڑ دس بھی اعظم شہریار آ جائیں تب بھی نہ میں ڈروں گی نہ ہی سچ کو دنیا کے سامنے لانے سے جھجکوں گی، بس تم کل کے اخبار کا انتظار کرنا۔'' غصے سے کہتے وہ ایک لمحے کو رکی تھی۔

''ہاہاہا، یہی تو مسئلہ ہے آپ کا جیا بی بی آپ خیالی دنیا میں رہتی ہیں، کتابی باتیں کرتی ہیں اور اس کل کے سپنوں میں رہتی ہیں جو کبھی نہیں آنے والا، ایک بات یاد رکھیے گا جیا بی بی، آج ابھی اور اسی لمحے سے زندگی آپ پر تنگ ہونا شروع نہ ہو گئی تو میرا نام بھی بختیار علی نہیں ہے، بہرحال اعظم صاحب کا ایک پیغام پہنچانا تھا آپ تک، کہ انہیں نڈر لوگوں کے ساتھ کھیلنے میں مزہ

آتا ہے، آپ کے ساتھ کھیلنے میں بھی مزہ آئے گا، ویسے بھی شروعات آپ نے کر ہی دی ہے اختتام وہ کر دیں گے۔''

☆☆☆

اس کا تعلق لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تھا، اس کے ماں باپ سفید پوش لوگ تھے، جن کے پاس عیش کرنے کو باپ دادا کی دولت نہیں تھی، اس کے باپ نے ساری زندگی محنت سے رزق حلال کماتے گزاری تھی اور اس کی ماں نے اس کے باپ کا بھرپور ساتھ دیتے، صبا اور جیا دو بیٹیاں قدرت نے دی تھی اور انہوں نے قدرت کے اس تحفے کی دل سے قدر کی تھی، اپنی اولاد کو وہ زیادہ شاہانہ طرز زندگی اور عیش و عشرت تو نہیں دے سکے تھے، اچھی تعلیم و تربیت ضرور دے دی تھی، ان کے باپ نے بڑی دل جمعی سے اپنی سچائی اور ایمانداری کے سبق پڑھائے تھے اور انہوں نے بہت دلچسپی سے یاد کیے تھے، صبا کی شادی کے بعد اس کے ابو اچانک بیمار پڑ گئے تھے اور ایسے پڑے تھے کہ تاحال ٹھیک نہیں ہو پائے تھے، نوکری چھوٹی، رشتے دار، جاننے والے، کتنی کترانے لگے، ادھار چڑھا، حالات مشکل تھے پھر مشکل ترین ہو گئے، اس نے بمشکل ہی تعلیم مکمل کی اور میدان عمل میں اتر آئی، ایک اچھی کمپنی کے ساتھ وابستہ ہوئے۔

اب تو چار سال ہو گئے تھے، جاب کے ساتھ ساتھ وہ لکھتی بھی تھی اور ایسا لکھتی تھی کے بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے، سچائی کے کاغذ پر اس کا قلم ایمانداری سے چلتا تھا اور کہیں راز سرعام فاش ہو جاتے تھے، دھمکیاں اور ڈراوے، اسے خوفزدہ نہیں کر پاتے تھے، کیونکہ اس کا ایمان مکمل تھا۔

لالچ، خوشامد، اس کے قلم کو روک نہیں پاتے تھے، اس کا وژن بڑا اور سوچ مضبوط تھی، ارادے پختہ تھے اور کردار اعلیٰ، اماں کو اس پر فخر بھی بڑا تھا، مگر جب اس کے قلم کی نوک ذرا زیادہ تیکھی ہو جاتی اور گھر کے فون کی گھنٹیاں مسلسل بجتی تو اماں ہولتی، غصہ دکھاتی، محتاط ہونے کے مشورے اور نصیحتیں اور ڈھیر ساری دعائیں، اس کے پلو سے باندھتی، زندگی یونہی رواں دواں تھی یعنی کبھی نرم کبھی گرم جب اس کے ہاتھ اعظم شہریار کی کچھ غیر قانونی سرگرمیوں کے ثبوت لگے تھے اور انہی دنوں آفس میں، اس سے مراد بی بی ملنے چلی آئی تھی، مراد بی بی عمر پچیس سال، غریب والدین اور کمزور بیک گراؤنڈ، وہ اعظم شہریار کے دست راست بختیار علی کی بربریت کا نشانہ بنی زخم زخم تھی اور انصاف کی متلاشی بھی، کہانی نئی نہیں تھی مگر جیا فاروق کے لئے اعظم شہریار کا رد عمل نیا تھا، حیران کن تا اور افسوناک تھا، وہ صوبائی سطح پر وزیر قانون تھا اور اسی کے خاص بندے کے ہاتھوں مراد بی بی کی عزت کے ساتھ ساتھ قانون کی بھی دھجیاں بکھیری تھی، جب وہ مراد بی بی کو ساتھ لئے اس وزیر قانون کے پاس پہنچی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''او بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر۔'' وہ اس کے پاس اس کے ایک اہم بندے کی شکایت لے کر آئی تھی اسے کتنا افسوس ہوا تھا یہ اس کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا۔

''بہرحال آپ اطمینان رکھیے جیا بی بی، میں خود اس تمام واقعے کی تحقیق کراؤں گا اور اگر بختیار واقعی گناہ گار ہے تو اسے سزا ضرور ملے گی، بختیار واقعی ملزم تھا اور یہ بات اس کے ساتھ ساتھ اعظم شہریار بھی جانتا تھا، مگر اس نے بختیار کو کیا سزا دی تھی وہ یہ نہیں جانتی تھی اسی لئے جاننے ایک بار پھر اس کے روبرو بیٹھی تھی۔

''میں مانتا ہوں کہ بختیار سے غلطی ہوئی ہے اور میں اس مراد بی بی کے نقصان کا ازالہ کرنے کو تیار ہوں پوچھیے آپ اس سے کتنی رقم چاہیے اسے۔'' جیا کو لگا اس نے لاپرواہ لہجے میں وہ سب نہیں کہا تھا بلکہ اس کے اور ان سارے کتانیوں کے منہ پر طمانچہ مارا تھا جو ایسے لالچی، خودغرض، کرپٹ، ظالم اور بے حس لوگوں کو منتخب کر کے ایوانوں میں بھیجتے ہیں وہ وہاں سے خاموشی سے اٹھ ضرور آئی تھی مگر پھر خاموش رہ نہیں پائی تھی۔

اس سے اگلے دن ہی اخبار میں اعظم شہریار کے غیر قانونی کاموں اور اڈوں کا ذکر آیا تھا، بختیار علی کے خلاف ایف آئی آر درج ہوئی تھی اور ان کے گھر پہلا دھمکی آمیز فون آیا تھا، پھر وہ چیزیں معمول کا حصہ بنی تھیں، اعظم شہریار اور اس کے درپردہ کاروبار کی تفصیلات، اخبار میں آتی اور دھمکیاں جیا فاروق کے گھر، باقی رہی پولیس، تو وہ بے بس تھی، اعظم صاحب خاموش تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بے بس تھے، وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ایک معمولی اخباری رپورٹر ان کا کیا بگاڑ سکتی ہے، وہ تو کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

☆☆☆

''چل مائی جوان جہان بیٹی کی میت پر رونے کی تیاری پکڑ لے، کیونکہ اب اس کے دن گنتی کے ہی دن رہ گئے ہیں۔'' یہ تھی وہ آخری دھمکی یا وارننگ جو اماں کو ملی تھی، جس نے اماں کو انتہائی خوفزدہ کر دیا تھا اور اسے تھانے میں جا کر کمپلین کرنے پر مجبور۔

☆☆☆

بلیک پینٹ پر سفید شرٹ پہنے تک سک سے تیار وہ مغوی سے ملنے جا رہا تھا، گاڑی سے اترتے ہی اس کی نظر اپنی مخصوص جگہ پر پڑی تھی اور اس کے سرخ لبوں پر جاندار سی مسکراہٹ آ گئی تھی، سفید اور گلابی کنٹراسٹ میں اپنے سیاہ ریشمی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے حسین چہرے پر دلکش مسکراہٹ لئے وہ پہلے سے وہاں موجود تھی، اتنی دیر اس نے مصنوعی خفگی سے پوچھا تو اس نے بائیں ہاتھ سے ہلکے سے کان کی لو کو چھوا تھا۔

''معافی؟'' اس کے لہجے میں بے چارگی بھری تھی۔

''ایسے تو ہرگز نہیں ملے گی۔'' مغوی نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے تھے۔

''تو؟'' وہ اس کے قدموں سے قدم ملانے لگا تھا۔

''پہلے لیٹ ہونے کی وجہ بتاؤ۔'' اس نے اردگرد کھلے پھولوں سے نگاہ ہٹا کر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''یار بابا جان کے کچھ اہم مہمان آ گئے تھے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ گلاب توڑتے ہوئے وجہ بتائی تھی اور پھر گلاب اس کی طرف بڑھایا تھا، سرخ گلاب جو محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے وہ محبت جس کے وجود کا قائل وہ تب ہوا تھا جب اس نے مغوی شہریار کو دیکھا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے میں ان لمحوں کو اپنی مٹھی میں مقید کر لوں۔'' مغوی کی بات پر وہ مسکرایا تھا۔

''اور میرا دل چاہتا ہے وقت یہی کہیں رک جائے، لمحے ٹھہر جائیں اور ہم دونوں یونہی ایک ساتھ چلتے رہیں اور یہ پل امر ہو جائیں۔'' اس نے محبت بھری نگاہ اپنے ساتھ چلتے وجود پر ڈالی تھی اور طمانیت بھری سانس اس کے لبوں سے خارج ہوئی تھی، وہ دونوں اب بھی ایک ساتھ چل رہے تھے۔

☆☆☆

وہ بمشکل ہی اماں سے اجازت لے کر آفس

پہنچی تھی، اماں ہرگز ہرگز اسے گھر سے نہیں نکلنے دے رہی تھی۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے نہیں جاتی میں آج آفس، کل بھی نہیں جاؤں گی مگر پرسوں اس سے اگلے دن، کیا نوکری چھوڑ دوں اماں؟ زندگی چھپ چھپا کر رکھنے والی چیز نہیں ہے اماں، یہ امانت ہے اور جس کی امانت ہے اس کے بغیر اجازت کوئی نہیں لے سکتا، ہر کسی کے آنے اور جانے کا وقت مقرر ہے میرا بھی ہے ارو جب آئے گا کوئی روک نہیں پائے گا کہ آپ نہ میں نہ یہ چار دیواری اور یہ تب آئے گا جب اس کی مرضی ہوگی۔" اب اماں مزید کیا کہتی خفگی سجا چہرا لے کر باورچی خانے میں چلی گئی اور وہ با آواز بلند سب کو خدا حافظ کہتے باہر کی طرف بڑھ گئی، اسے آئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا جب افتخار صاحب نے یاد کرلیا تھا۔

"مے آئی کم ان سر۔" دروازہ کھولے سر اندر ڈالے وہ اجازت طلب کر رہی تھی، انہوں نے پہلے سر اٹھایا پھر ہلایا، وہ اندر آگئی۔

"بیٹھو۔" کہنے کے بعد وہ خاموش تھے اور وہ ان کے بولنے کی منتظر۔

"جیا! اگر تمہیں موجودہ جاب سے زیادہ اچھی جاب ملے گی تو مجھے خوشی ہوگی کیونکہ موجودہ جاب کو Countinew کرنا اب تمہارے لئے ممکن نہیں اور ہمارے لئے سود مند نہیں۔" صاف اور دوٹوک انداز، وہ حیران بھی نہ ہو پائی تھی، کجا کہ اپنی غلطی پوچھتی۔

بختیار علی نے کہا تھا زندگی اس پر تنگ ہوتی جائے گی اس نے ٹھیک کہا تھا، جاب سے اسے نکال دیا گیا تھا اور مزید کہیں جاب اسے کرنے نہیں دی جا رہی تھی، مختلف جگہوں پر اس نے انٹرویو دیا، مگر نتیجہ ایک سا رہا، انٹرویو ٹھیک ٹھاک ہوتا اور مالکان کا رویہ حوصلہ افزا، اگلے دن صاف کھرا جواب دے دیا جاتا، ان ہی حالات میں وہ ایک دن مراد بی بی سے ملنے اس کے گھر آئی تھی اور اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی، مراد بی بی اور اس کے گھر والوں نے اس سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

"مے آئی کم ان سر!"

"ہاں ہاں ضرغام آؤ ناں، بیٹھو۔" ہارون اطہر نے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔

"تھینک یو سر!" فل یونیفارم میں موجود ضرغام مسکراتے ہوئے ان کے روبرو بیٹھا تھا۔

"ہاں بھئی جوان کیس کہاں تک پہنچا؟"

"سر بہت سارے نئے اور اہم پہلو ملے ہیں، جس سے کیس میں بہت اہم پیش رفت ہوئی ہے اور وہ دن اب دور نہیں جب ہمارے ہاتھ مجرموں کی گردنوں پر ہوں گے۔" اس کے لہجے میں موجود عزم اور امید دونوں ہی ہارون اطہر کو بھائے تھے۔

"گڈ، مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا پورا بھروسہ تھا ضرغام اسی لئے میں نے یہ کیس تمہارے حوالے کیا تھا۔"

"اٹس آنر فار می سر!" اس نے ذرا سا گردن کو خم دیا۔

"مگر اس چھ لوگوں کے گروپ میں تمہارے متوقع سالے کا بھی نام ہے؟" انہوں نے ایک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"میں رشتے داریاں اور تعلقات اپنے فرض پر حاوی نہیں ہونے دیتا سر۔" اس کے مضبوط لب و لہجے نے ایک بار پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"کہیں ایک وجہ آپ کے والد صاحب

ہوئے تو؟"

"میرا جواب پھر پہلے والا ہی ہوگا سر۔"

"گڈ، تو پھر ٹھیک ہے تم شام کو فائل تیار رکھنا، ڈی آئی جی صاحب نے شام کو یاد فرمایا ہے۔" ہارون اطہر نے بات سمیٹی تھی۔

"او کے سر، پھر میں چلوں۔" وہ اٹھ کر ان سے مصافحہ کرنے لگا تھا۔

"او کے اللہ حافظ۔"

وہ ہارون اطہر سے ملاقات کر کے آ رہا تھا جب گاڑی آفس کے راستے پر ڈالتے اس کی نظر سڑک کنارے کھڑی جیا فاروق پر پڑی تھی اور پاؤں بریک پر۔

"مس جیا فاروق۔" پکار پر اس نے سر اٹھایا تھا۔

"پلیز آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" ذرا سا بائیں طرف جھکتے اس نے دروازہ کھولتے کہا تھا۔

"نو تھینکس، میں چلی جاؤں گی، بس آنے ہی والی ہے۔" رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے اس نے سہولت سے انکار کیا تھا۔

"بس پتہ نہیں کب آئے گی، آپ آجائیں، ویسے بھی یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔" اس کے اصرار اور آس پاس کھڑے مہذب افراد کی نظروں نے اسے لفٹ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تھینک یو۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔

"ویلکم۔" وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔

"یہ بتایئے آپ کے کیس کا کیا بنا؟" موڑ کاٹتے اس کے سوال اس کے سامنے رکھا تھا۔

"یہ تو آپ کو پتہ ہوگا، کمپلین کرنا میرا کام تھا اور۔"

"ایکشن لینے تو آپ کا کام تھا۔" اس کے چبھتے انداز پر وہ ایک لمحے کو چپ رہ گیا تھا۔

"صحیح۔" اس نے گہری سانس بھری تھی۔

"مگر یہ بات تو آپ بھی جانتی ہیں ایسے لوگوں کے خلاف ایکشن لینا بھی اتنا آسان نہیں ہوتا۔" ضرغام کی بات پر اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آرکی تھی۔

"جانتی ہوں ضرغام صاحب، سب جانتی ہوں بلکہ میں ہی کیا اس ملک کی ساری عوام جانتی ہے، ہر چیز جانتی ہے، سارے چہرے پہچانتی ہے، کون سا ایسا راز ہے جو اس سادہ عوام کو نہیں پتہ مگر مسئلہ پتہ ہے کیا ہے، ہمیں انجان نظر آنے بے خبر رہنے اور بیوقوف بننے میں اب مزہ آنے لگا ہے۔" کہہ کر وہ تلخی سے مسکرائی اور باہر سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

اعظم شہر یار کے ڈرائنگ روم میں سے ابھی ابھی اس کے دو بہت اہم اور خاص الخاص مہمان اٹھ کر گئے تھے اور وہ خوش تھا کہ وہ اس سے خوش ہو کر گئے تھے، یعنی نوازنے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہونے والا تھا، اس کی پارٹی اپوزیشن میں تھی لیکن آنے والے دنوں میں حکومتی پارٹی سے اتحاد متوقع تھا اور پارٹی کی طرف سے حکومت میں شمولیت کے بعد نامزد وزرا میں اس کا نام بھی شامل تھا، وہ خوش تھا اور آنے والے دنوں کے تصور بلکہ خوش کن تصور میں کھویا ہوا تھا، کہ ٹیبل پر رکھے سیل کی بجتی ٹون نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا تھا، ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھاتے وہ نمبر دیکھتے ہی سیدھا ہوا تھا، لیس کا بٹن دباتے وہ سیل کان سے لگائے دوسری طرف سے ملنے والی ہدایات سننے میں مشغول تھا، جس میں اسے علی الصبح ہی اسلام آباد پہنچنے کا کہا گیا تھا۔

☆☆☆

ڈی آئی جی سے ملاقات کے بعد اس نے ہارون اطہر کوان کے گھر ڈراپ کیا تھا گھر آیا تو بابا جان اور بی جان واپس آ چکے تھے۔

''ضرغام کتنے کمزور ہو گئے ہو تم؟'' بی جان سے جھک کر مل کر وہ سیدھا ہوا تو انہوں نے غور سے اسے دیکھتے کہا اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''بی جان چار دنوں میں، میں کتنا کمزور ہو سکتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ان کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

''خیال جو نہیں رکھتے اپنا کیا خیال ہے خیال رکھنے والی کو اب لے آئیں ناں۔'' انہوں نے کھوجتی سی نظر ڈال کر پوچھا تھا، اس نے سر جھکایا، یہ اس کی طرف سے رضا مندی کا اشارہ تھا، مگر صرف اس کی رضا مندی ہی تو کافی نہیں تھی۔

''میرا خیال ہے مغوی کو اب اس گھر میں آ جانا چاہیے۔'' رات کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے وہ سبز چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب بی جان نے اپنا خیال بابا جان کے آگے رکھا تھا، انہوں نے ایک پل کو نظر اپنے سیل کی چمکتی سکرین سے ہٹائی ان دونوں کے چہروں کے ساتھ بی جان کے خیال پر ڈالی اور پھر سے سابقہ جگہ پر جما دی تھی۔

''پھر کیا کہتے ہیں آپ؟'' بی جان نے خالی کپ میز پر رکھا اور سوال بابا جان کے آگے۔

''ہوں سوچتے ہیں کچھ، دیکھتے ہیں۔'' بابا جان نے پرسوچ انداز میں کہا تھا اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

تھکن اور مایوسی اس کے قدموں سے لپٹی تھی جب اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا، سامعیہ نے اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی بھری تھکن کو دیکھا، تاسف سے سر جھٹکا اور اس کے لئے پانی لینے چل دی تھی، ابا کو سلام کر کے اس نے کندھے سے بیگ اتار کر میز پر رکھا اور چارپائی پر ڈھیر ہوئی۔

''اماں کہاں ہیں؟'' سامعیہ سے پانی لیتے اس نے نظر نہ آنے والی اماں کے متعلق پوچھا تھا۔

''صفیہ خالہ کے گھر گئیں ہیں، چائے بناؤں یا کھانا کھاؤ گی؟'' خالی گلاس لیتے سامعیہ کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''چائے لے آؤ، بھوک تو اب ہے نہیں۔'' اس کے کہنے پر سامعیہ سر ہلاتے مڑ گئی تھی۔

''آج بھی کچھ نہیں بنا ہر جگہ ٹرائی کر چکی ہوں مگر کہیں کوئی ذرا سی بھی امید نہیں ہے۔'' رات وہ دونوں کھلے آنگن میں چاند تاروں کی چھاؤں تلے بیٹھی تھیں جب اس نے مایوسی بھرے لہجے میں حقیقت بیان کی تھی۔

''تم مایوس مت ہو، انشا اللہ جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا جو بہت بہتر ہو گا۔'' سامعیہ کے تسلی دلاتے انداز پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں کچھ نہیں ہو گا، ویسے بھی سچ بولنے یا سچ کا ساتھ دینے کی قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے، تم دیکھنا جیا ایک نہ ایک دن حالات ضرور بدلیں گے؟'' سامعیہ کا لہجہ خوش امید تھا، اس نے طنز سے سر جھٹکا۔

''کون بدلے گا؟ بے حس حکمران یا پھر لاپروائی اور بے خبری کا نقاب اوڑھے کولہو کے بیل جیسی زندگی گزارتی عوام، یا پھر قوم کے وہ سچے لیڈر جو بڑے بڑے دعوے اور باتیں ضرور کرتے ہیں، انقلاب کی، نظام تو بدلنے کی، پہلا قدم کون بڑھائے گا؟ مسئلہ پتہ ہے کیا ہے جیا؟

اس قوم کے پاس لیڈر نہیں ہے ایسا لیڈر جو اسے اس کی طاقت سے آگاہ کرے، کیونکہ جس دن اس قوم کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا پھر کوئی شخص کبھی بھی اسے بیوقوف بنانے کی ہمت نہیں کر سکے گا، ہم نظام کے ڈسے ہوئے ہیں جیا، ہم ایسے قیدی ہیں جن کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں مگر جن کے ذہن اور سوچ اسی فرسودہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ہم آج بھی غلام ہیں، ان فرسودہ رسموں رواجوں کے، ہم نے کل بھی یہی فرض کر رکھا تھا کہ اقتدار امیر کے پاس اور اطاعت غریب کے ہاں رہے گی، ہم آج بھی یہی مانتے ہیں، اس ملک میں بڑا المیہ یہ ہے یہاں جو قانون و آئین کو پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں وہی اقتدار کی مسند پر بیٹھے ہیں اور جو ان کی پاسداری کرتے ہیں وہ آج بھی دھکے کھاتے اور دو وقت کی روٹی کے لئے پریشان پھیرتے ہیں، مگر ایسا کب تک چل سکتا ہے؟ کب تک چلے گا؟ وقت بدلنا چاہیے وقت کو بدلنا ہو گا، اقتدار اور اختیار امیر کے پاس نہیں اہل کے پاس ہو تبھی نظام بدل سکتا ہے اور اس ملک کا نصیب بھی اور میں پر امید ہوں جیا، کہ وہ وقت بس آیا ہی چاہتا۔'' سامعیہ کی بات پر اس نے دل سے آمین کہتے آنکھیں موند لیں تھیں۔

☆☆☆

بابا جان بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ اسلام آباد سے لوٹے تھے، اعظم شہریار کی پارٹی کے ساتھ مفاہمت ہو گئی تھی، اس کی پارٹی کو وزارتیں بھی مل گئیں تھیں اور انہیں پانچ سال تک اقتدار کے مزے لوٹنے کو ان کی حمایت پرانی رنجش پرانے اصولوں اور نظریوں کے ساتھ ہی مدفن ہو چکیں تھیں اور اب نئے تعلقات، نئے اعلانات اور خیر سگالی کے جذبات، بابا جان اعظم شہریار اکٹھے ہی اسلام آباد سے واپس لوٹے تھے اکٹھے ہی اعظم شہریار کے فارم ہاؤس پر کھانا کھایا تھا، چائے پی تھی اور آئندہ کے سیاسی حالات پر سیر حاصل گفتگو بھی کی تھی، بہر حال جو بھی تھا ضرغام کے لئے ان دونوں کے خوشگوار تعلقات سودمند ہی تھے، وہ بابا جان کے پاس بیٹھا تھا اور وہ اعظم شہریار سے فون پر محو گفتگو تھے، ضرغام ہولے سے مسکرایا۔

''واہ رے سیاست، انوکھے ترے رنگ، نرالے تیرے کھیل، جنہیں رشتہ داری قریب نہ کر پائی تھی انہیں کرسی قریب لے آئی تھی۔''

''ضرغام یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' بابا جان فون بند کیے اس کی طرف متوجہ تھے وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

''اعظم صاحب کے خلاف انکوائیریاں کرتے پھر رہے ہو۔'' انہوں نے اپنے مخصوص دبنگ انداز میں استفسار کیا تھا اور آج سے چند دن پیشتر اگر بابا جان تک ایسی کوئی چیز پہنچی تو ان کا ردعمل کیا ہوتا وہ اسے شاباشیاں دیتے، کندھے تھپکاتے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتے اس خبر کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا سوچ رہے ہوتے، اس کے ذہن میں بے اختیار یہ سوچ آئی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بابا جان، دراصل چند ماہ پہلے ہی مجھے ایک اہم کیس سونپا گیا تھا، جسے مکمل رازداری سے حل کرنے کی شرط کے ساتھ، میں نے پوری دیانتداری کے ساتھ کیس حل کرنے کی کوشش کی ہے، اب چھ لوگوں میں اگر اعظم شہریار کا نام آ رہا ہے تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' اس نے انتہائی مختصر ترین الفاظ میں ان تک بات پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

''اگر ایسا تھا بھی تو تمہیں اس کے نام کو

رپورٹ میں نہیں لکھنا چاہیے تھا اور نہیں تو اپنی رشتہ داری کا ہی خیال کر لیتے، پولیس والوں کے پاس تو ویسے ہی بڑے طریقے ہوتے ہیں، بے گناہ کو گناہگار اور گناہگار کو بے گناہ ثابت کرنے میں۔" اس کے باپ نے سگریٹ سلگاتے عام اور لاپرواہ لہجے میں جو مشورہ دیا تھا اسے اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی، حیرت تب ہوئی جب وہ اپنے باپ کو جانتا نہ ہوتا وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتا تھا، اسی لئے دانستہ اس نے فرض اور اپنی ایمانیداری جیسی چیزوں کا ذکر نہیں کیا تھا اسے معلوم تھا یہ چیز اس کے باپ کو بیخ پا کر دے گی۔

"یہ میرے بس میں نہیں تھا کیونکہ میرے ساتھ کیس کی معاونت دو اور لوگ بھی کر رہے تھے۔" اس نے وہ بات کی جو اس کے باپ کو مطمئن کر سکتی تھی، مگر بجائے مطمئن ہونے کے وہ ہنسنے لگے تھے۔

"تمہیں پتہ ہے ضرغام تمہارا باپ ایک دن میں کتنے لوگوں کو خریدتا ہے؟"

نہیں اسے معلوم نہیں تھا، اسے معلوم کرنا بھی نہیں تھا۔

"بہر حال اب اس مسئلے کو ختم کرو۔" انہوں نے اپنے تئیں بات ختم کی تھی۔

"آئم سوری بابا جان، مگر اب یہ میرے بس کی بات نہیں، بات بہت اوپر تک جا چکی ہے۔"

☆☆☆

وہ پچھلے پندرہ منٹ سے مغوی کا نمبر ملا رہا تھا اور پچھلے پندرہ منٹ سے ہی ایک ہی جواب کی تکرار ہو رہی تھی۔

"آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔"

"کیوں بند ہے؟" اس سوچ نے اس کے ذہن کا گھیرا کر رکھا تھا، جواب ندارد اور الجھن بڑھتی جا رہی تھی، اگلے آدھے گھنٹے تک وہ مزید ٹرائی کرتا رہا اور وہی جواب سنتا رہا تھا، صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے پہلا کام مغوی کا نمبر ڈائل کرنے کا کیا تھا اور وہی جواب سن کر اس کا دل چاہا تھا وہ سیل اٹھا کر دیوار پر دے مارے، دس منٹ میں وہ تیار ہوا تھا اور پندرہ منٹ میں آفس پہنچا تھا اور آفس آنے کے بعد بھی اس نے پہلا کام وہی کیا تھا جو وہ کل رات سے مسلسل کر رہا تھا۔

ایک دو تین اب تو گنتی بھی یاد نہیں تھی، کچھ لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے اعظم ولا کا نمبر ڈائل کیا تھا، فون کسی ملازمہ نے اٹھایا تھا۔

"مغوی بی بی کو بلاؤ۔" اس نے تحکم آمیز لہجے میں کہا تھا اور دوسری طرف ایک پل کو خاموشی چھائی تھی۔

"مغوی بی بی ایدر نئیں ایہہ۔"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھن بھرے تاثرات کے ساتھ پوچھا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟" "یہ ام کو نئیں پتہ، پر وہ ایدھر نئیں ایہہ۔" یہ کہتے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا تھا وہ حیران پریشان بیٹھا رہ گیا تھا، اس نے اگلا نمبر اعظم شہریار کا ڈائل کیا تھا۔

"آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا کچھ دیر بعد ٹرائی کیجئے۔" وہ پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، اگلے دس منٹ بعد اس کی گاڑی اعظم ولا کی جانب گامزن تھی۔

☆☆☆

"مغوی کہاں ہے اور کیوں ہے اس کا جواب میرے پاس ہے اور وہ وہاں کب تک رہے گی اس کا جواب تمہارے پاس ہے۔" سفید کلف لگے سوٹ میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کے بیٹھے اعظم شہریار نے اس کے چہرے پر پھیلی بے

اطمینانی کو غور سے دیکھتے اطمینان سے کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" اس کی آرام و سکون سے کی گئی بات کا مفہوم قطعاً اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔

"بیٹھو آرام سے، سکون سے چائے وغیرہ پیو، مطلب بھی بتائے دیتے ہیں، جلدی کس بات کی ہے ضرغام صاحب۔" سرد سے لہجے میں کہتے وہ چائے کے لوازمات لاتے ملازم کی طرف متوجہ ہوا تھا، ضرغام الجھتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ رات بے حد طویل تھی، سیاہ تھی اور سرد تھی اور اسی طویل سیاہ اور سرد رات میں کھڑا وہ اپنے زندگی میں اچانک در آنے والے اس طوفان پر ششدر کھڑا تھا، اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں تھیں، اسے لگتا تھا اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، زندگی اسے عجیب دوراہے پر لے آئی تھی، اسے فیصلہ کرنا تھا اور ابھی کرنا تھا، دو چیزیں، دو راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مختلف، سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو چکا تھا، مگر جوں جوں رات بیت رہی تھی، فیصلے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا، اس نے ایک گہری طویل سانس لے کر خود کو کمپوز کیا، انگلیوں کی مدد سے دکھتی آنکھوں کو دبایا پھر جیب میں موجود سفید کاغذ نکال کر ایک بار پھر سے پڑھا، اس چیز نے اسے فیصلہ کرنے میں آسانی دی، کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ جیب میں ڈالا اور پھر سیل نکال کر مطلوبہ نمبر ڈائل کیا۔

"کہیے ضرغام صاحب کیا کہتے ہیں؟" دوسری طرف سے چھوٹتے ہی سوال ہوا تھا۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆☆☆

آفس کی بلڈنگ سے باہر آتے ہی اس نے سامعیہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہاں سامعیہ یار بہت اچھی خبر ہے مجھے جاب مل گئی ہے۔" سامعیہ کے ہیلو کے جواب میں اس خوشی سے کھنکھتے لہجے میں جو بات بتائی اس نے سامعیہ کو بھی دل سے خوش کر دیا تھا۔

"رئیلی یار یہ تو بہت بہت زیادہ خوشی کی خبر ہے مبارک ہو۔"

"خیر مبارک مگر ابھی اماں ابا کو نہ بتانا میں خود آ کے انہیں یہ خوشخبری دوں گی۔" وہ پارکنگ ایریا سے باہر نکلتے اسے ہدایت دینا نہ بھولی تھی۔

"او کے۔" سامعیہ فوراً راضی ہوئی تھی اس نے خدا حافظ کہہ کر موبائل پرس میں ڈال تھا اور ٹھیک اسی لمحے سیاہ کرولا اس کے قریب آ کے رکی تھی۔

اس کا نجانے کتنی دیر سے تاریکیوں میں ڈوبا ذہن روشن ہوا تھا اس نے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ خود کو اس نیم تاریک کمرے میں قید پایا تھا، کتنی ہی دیر تو وہ خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد کو دیکھتی رہی تھی، اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا وہ کہاں ہے اور جہاں ہے وہاں کیوں ہے؟ اس نے ذہن پر زور ڈالا تھا اور اس کے دماغ میں زوردار جھماکہ ہوا تھا۔

پچھلے دو دن سے وہ بھوکی پیاسی وہاں قید تھی رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکیں تھیں اور چیخ چیخ کر گلا بیٹھ چکا تھا، ابا اماں اور سامعیہ سوچ کی ہر پرواز انہی تینوں تک جا پہنچی تھی اور اس کی آنکھوں سے پھر سے سیل رواں ہو جاتا تھا، کیا سوچا ہو گا انہوں نے کہ وہ کہاں گئی، کہاں کہاں ڈھونڈا ہو گا، کس کس سے پوچھا ہو گا؟ کیا وہ اب تک مایوس ہو گئے ہونگے؟ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، مگر صرف ایک اس بات پر نہیں

اپنے اعتماد اور بھروسے کے ٹوٹنے پر بھی، چوٹ وہاں سے لگی تھی جہاں سے وہ مر کر بھی تصور نہیں کر سکتی تھی، دروازے کا لاک کھولا تھا، اس کی نظریں اس کی سمت نہیں اٹھیں تھیں، وہ جانتی تھی کہ کون ہوگا، وہ پہلے خود اندر آیا تھا پھر اس کے پیچھے ٹرے اٹھائے عمر رسیدہ عورت، عورت نے تازہ ٹرے رکھی اور کل کی رکھی ان چھوئی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی تھی اس کے جاتے ہی وہ آہستہ روی سے چلتا عین اس کے سر پر پہنچ گیا تھا، وہ یونہی نظریں پھیرے بیٹھی رہی تھی، وہ ذرا سا آگے ہوتا اپنا ٹراوزر کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھ گیا تھا، جیا نے نظریں گھما کر اسے دیکھا تھا، وہ چند لمحے اس کی زخم زخم آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر سر جھکا لیا تھا اور وہ تڑپ کے رہ گئی تھی، وہاں سوال تھے جیا فاروق کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں، اس کمرے میں ہر جگہ، سوال تھے بے شمار تھے اور یہاں وہاں بکھرے تھے۔

''زندگی میں ہر انسان کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جگہ کسی نہ کسی چیز کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے، مجبوری میرا دل ہے۔'' سر جھکائے نظر جھکائے اس نے کہا اور پھر اٹھ گیا تھا، اس کے پاس سوال چھوڑ کر، اپنے جواب سمیٹ کر۔

☆☆☆

وہ آفس سے گھر پہنچا تو خاصا تھک چکا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی، ملازمہ کو کھانے کا کہہ کر وہ اپنے روم میں فریش ہونے چل دیا تھا، وہ فریش ہو کے نکلا تو ملازمہ کھانے کی ٹرے لئے منتظر تھی، گرم گرم کھانا اس کی بھوک بڑھا گیا تھا، اس نے تازہ اور نرم روٹی کا نوالہ توڑا پالک گوشت اس کی فیورٹ ڈش تھی اور آج سوئے اتفاق وہی بنی ہوئی تھی روٹی کے ساتھ سالن لگا کر اس نے نوالہ منہ کی طرف بڑھایا مگر ہاتھ راستے میں ہی رک گیا تھا، اسے بے اختیار ہی کسی اور کی بھوک یاد آ گئی تھی، پپڑی زدہ ہونٹ، گہرے حلقوں والی آنکھیں اور زرد چہرا، اس کے تصور میں آیا تھا اور اس کی بھوک مر گئی تھی۔

☆☆☆

وہ پچھلے ایک ہفتے سے ضرغام عباس کی قید میں تھی اور اسے علم نہیں تھا وہ وہاں کیوں ہے مگر اب اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا وہ جہاں ہے وہاں کیوں ہے، ضرغام عباس نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا فقط ایک چیز کے وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے تو ضرغام اس کا دل دولت پہ مرتا تھا، اس نے بے اختیار ہو کے سوچا اسے خبر نہیں تھی ضرغام عباس کا دل مغوی شہریار پر مرتا تھا، وہ اسے دولت کے ہاتھوں بکا ہوا سمجھ رہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی وہ محبت کے ہاتھوں بکا ہے۔

''زہے نصیب دیکھئے تو مس جیا قدرت نے آپ سے ملاقات کا کیسا موقع دان کیا ہے۔'' عین اس کے سامنے کرسی رکھ کر وہ بیٹھا اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر سگریٹ جلایا تھا۔

سگریٹ کا گہرا کش لیتے وہ اس کی بے بس حالت کا بھی مزہ لے رہا تھا، ضرغام ان دونوں سے کچھ فاصلے پر موجود کھڑکی کے رخ چہرا کیے کھڑا تھا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی اعظم شہریار اس طرح کی گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے۔'' اس کے خون میں اس شخص کو دیکھتے ہی شرارے پھوٹنے لگتے تھے اور زبان انگارے برسانے لگتی تھی۔

''ہاہاہا شرم؟ بھئی وہ کہاں سے ملتی ہے مجھے تو کچھ معلوم نہیں کیوں ضرغام تمہیں کچھ خبر ہو؟'' اعظم شہریار نے رخ موڑ کر اسے مخاطب کیا تھا اس نے پیچھے پلٹ کے دیکھا تو اعظم نے آنکھ

سے گھٹیا سا اشارہ کیا تھا اس کا چہرا لمحوں میں سرخ ہوا تھا، ویسے بھی وہ کتنی مشکل سے برداشت کیے ہوئے تھا وہی جانتا تھا۔

''خدا کے انصاف اور قہر سے ڈرو اعظم شہر یار۔'' اس بے بس حالت میں بھی وہ بپھری شیرنی کا سا روپ دھارے ہوئے تھی، اس کی بات نے اعظم شہریار کے چہرے پہ بدمزہ سے تاثرات پھیلے تھے۔

''ایک تو تم جیسے بے بس ولاچار لوگوں کا یہ بڑا مسئلہ ہے جب خود کچھ نہیں کر سکتے تو خدا کے قہر اور انصاف کے ڈراوے دینے لگتے ہو، مگر سویٹ ہارٹ آج میرا ڈرنے کا بالکل موڈ نہیں ہے، آج تو کچھ پچھلے حساب کتاب کلیر کرنے کا دن ہے اور میرا کچھ انجوائے کرنے کا موڈ ہے، یو نو انجوائے؟'' اس کا بے باک معنی خیز لہجہ، وہ لمحوں میں ڈھیلی پڑی تھی اور اسے لگا تھا اس کے جسم سے جان اب نکلی کے تب، بے بسی کے شدید احساس تلے دب کر وہ بے اختیار ہو کے رو دی تھی اور ضرغام عباس کو لگا تھا وہ مزید اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا، وہ آج کے بعد کبھی خود سے آنکھ نہیں ملا پائے گا وہ اب کسی عورت کے سامنے سر نہیں اٹھا پائے گا، جیا فاروق نے نگاہ گھمائی، چاروں جانب اپنا کوئی حمایتی مدد گار ڈھونڈنا چاہا، وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا، مگر وہاں ہی تو کوئی تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔

''اللہ۔'' اس کے دل نے شدت سے پکارا تھا اور جب کوئی یوں بے بس ولاچار ہو کے دل کی گہرائیوں سے اسے پکارتا ہے تو اس کی پکار سن لی جاتی ہے اس کی بھی سن لی گئی تھی، شارٹ نوٹس پر ہونے والی پارٹی کی ہنگامی میٹنگ، اعظم شہریار کو بہت جلدی جانا پڑ گیا تھا، ویسے بھی اس کا مقصد یہ نہیں کچھ اور تھا۔

☆☆☆

اسپیشل ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں لئے وہ بے حد مطمئن انداز میں بیٹھا گھونٹ گھونٹ انجوائے کر رہا تھا، اس کے لبوں پر اطمینان دلاتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ڈولتا فتح کا خمار بہت واضح تھے، اس کے چہرے پر ایسی ہی چمک تھی جو کسی بھی فاتح کے چہرے پر ہوتی ہے، یا کسی اسے فلم ڈائریکٹر کے چہرے پر جس کی بنائی فلم میں ہر چیز اس کی حسب منشا ہو اور اسے اپنی فلم کی کامیابی کا سو نہیں ایک سو ایک فیصد یقین ہو، ایسا ہی یقین اسے بھی تھا، اس اسکرپٹ پر جو اس نے خود ہی لکھا تھا خود ہی ڈائریکٹ کیا تھا اور سونے پہ سہاگہ ہر چیز بالکل ویسے ہی ہوتی چلی گئی تھی جیسے اس نے چاہا تھا، وہ اعظم شہریار تھا، سیاست اور بساط کا بہت پرانا اور منجھا ہوا کھلاڑی۔

وہ زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق چلانے کا عادی تھا، اس کے اپنے اصول تھے اپنے ضابطے تھے اور اس کے لئے وہی حرف آخر تھے اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو ہار کو جیت میں بدل دینے کا ہنر رکھتے ہیں، وہ تصویر میں ایک آدھ نقطہ نہیں پورے کا پورا منظر بدل دینے کی صلاحیت رکھتا تھا، وہ کامیاب رہتا تھا اس لئے نہیں وہ کامیابی کا جذبہ رکھتا تھا، اس لئے کیونکہ وہ کامیابی تک پہنچنے کے لئے ہر ناجائز وہ جائز چیز کو اپنے لئے جائز سمجھتا تھا، مغوی شہریار اس کی چھوٹی لاڈلی بہن وہ اسے اپنی سگی اولاد جیسا ہی سمجھتا تھا آج تک مغوی کی کوئی ایسی ضد، فرمائش اور خواہش نہیں تھی جو منہ سے نکلی ہو اور پوری نہ ہوئی ہو مگر جب اس کے منہ سے ضرغام عباس کا نام نکلا، اسے لگا وہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کر سکے گا، بہت پہلے ہی وہ مغوی کے

رشتے کی زبان چچا فرید کو دے چکا تھا اور اگر نہ بھی دیتا تب بھی ضرغام عباس آغا علی عباس کا بیٹا تھا اس کے سیاسی مخالف اور حریف آغا علی عباس کا بیٹا، نہیں کبھی نہیں، اس کا جواب اٹل تھا مگر مغوی کے رونے دھونے، بھوک ہڑتال اور جذباتی بلیک میلنگ، وہ مان گیا مگر کیا دل سے بھی مان گیا تھا، ہرگز نہیں، ایک بات تو طے تھی مغوی کی شادی چچا فرید کے بیٹے سکندر فرید سے ہونا تھی، ضرغام عباس سے نہیں، مگر چیزیں ابھی اس کے حق میں تھیں انہیں اپنے حق میں کرنا تھا۔

☆☆☆

ضرغام عباس اور جیا فاروق احمد دونوں ہی اپنے پیشے سے مخلص تھے دونوں ہی ایماندار تھے دیانت دار تھے اور فرض شناس تھے، یہ ساری اچھی چیزیں تھیں، مگر وہ دونوں اس کے خلاف تھے یہ اچھی چیز نہیں تھی، جیا فاروق معمولی صحافی وہ اس کے خلاف اعظم شہریار کے خلاف سچ لکھنے چلی تھی۔

''ہونہہ، اور ضرغام عباس احسان بخش مرڈر کیس میں اس کے خلاف انکوائریاں کرتا پھیرتا ہے اور حد تو یہ کہ اسے نامزد بھی کر دیتا ہے، بنا کسی تعلق داری کے لحاظ کے، تو ٹھیک ہے فرض رکھنے والوں میں سے تو وہ بھی نہیں یہ دو لوگ تھے جن سے اسے نمٹنا تھا مگر اکیلے اکیلے کیوں؟ اکٹھے کیوں نہیں۔''

''میں رشتہ داریوں کو اپنے فرض پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔'' ضرغام عباس کے الفاظ اس تک پہنچ گئے تھے۔

''ٹھیک ہے وہ رشتے داریاں اپنے فرائض پر حاوی نہیں ہونے دیتا اچھی بات ہے مگر معاملہ اب رشتے داریوں کا نہیں محبت کا تھا اور اب اسے دیکھنا تھا محبت فرض اور ضرغام عباس کے درمیان حائل ہوتی ہے یا نہیں۔''

مغوی کو اس نے کوٹھ میں مورے کی خراب طبیعت کا بتا کر بہ عجلت روانہ کیا تھا، اس نے اتنی جلدی مچائی تھی کہ وہ اپنا سیل بھی ساتھ لے جانا بھول گئی تھی اور حویلی میں اس نے مغوی کو فون استعمال نہ کرنے دینے کی سختی سے تاکید کر دی تھی اور اب اسے انتظار تھا ضرغام عباس کا، وہ آیا تھا اور پریشان چہرا لئے آیا تھا، مغوی سے رابطہ نہ ہونے پر وہ بے کل تھا بے چین تھا، اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات ٹھیک سے سو نہیں پایا، اس نے آتے ساتھ ہی مغوی کے متعلق پوچھا تھا۔

اس کی بات سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

''ایک منٹ ضرغام صاحب آرام سے، جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں، کیوں کے آپ کو اس وقت اس کی ضرورت ہے گھر جائیں اور سکون سے تسلی سے سوچیں، آپ کے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔''

''ضرغام لالہ میری شادی زبردستی کروا دیں گے انہوں نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے وہ مجھے کسی سے ملنے بھی نہیں دے رہے، پلیز ضرغام کچھ کرو، میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔'' یہ اور چند اور اس جیسے الفاظ اور جملے مغوی کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھے ہوئے اس تک پہنچے تھے اور وہ مزید برداشت نہیں کر پایا تھا، اس نے اعظم شہریار کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا، لوگ دولت کے لئے اسی کو اغواء کرتے ہیں، دشمنی کے نام پر کرتے ہیں وہ پہلا شخص تھا جو محبت کے لئے ایسا کر رہا تھا، اس نے جیا فاروق کی عزت پر مغوی شہریار کی محبت کو ترجیح دی تھی، اسے خبر نہیں تھی اس نے کتنا غلط کر دیا تھا، غلطیاں تو سب ہی کرتے ہیں مگر کچھ لوگ ناقابل تلافی غلطیاں کر دیتے

ہیں ضرغام عباس کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

کھیل یہاں ختم نہیں ہونا تھا، کھیل تو ابھی بہت آگے تک جانا تھا، کل صبح...... کل صبح تک اسے انتظار کرنا تھا اور شروعات کی طرح اختتام بھی اس کی عین مرضی کے مطابق ہونا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور سونے چل دیا تھا۔

وہ سوئمنگ پول کے نیلگوں پانیوں پہ نگاہ جمائے ساکت بیٹھا تھا اور اس کی ہر سوچ جا کر جیا فاروق پہ ختم ہو رہی تھی، یہ کیا کر دیا تھا اس نے اس کے ساتھ، ایک عورت کی محبت میں وہ اتنا پاگل ہو گیا تھا کہ اس کو کھونے کے ڈر سے اس نے دوسری عورت کی زندگی ہی تباہ کر دی تھی، اپنی محبت کی قیمت اس نے کسی دوسرے کی عزت سے چکائی تھی، نہیں وہ ایسا نہیں تھا، وہ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟

رات ساڑھے بجے کا وقت تھا جب ہارون اطہر نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو غصے، حیرت، دکھ اور تاسف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دیکھا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کوئی اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ اس وقت خاصی ریش ڈرائیونگ کر کے اس تک پہنچا تھا اور اب اسے آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔

''شکر کرو کہ میری سورس آج کام آ گئی ہے ورنہ تم نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے والد صاحب اور خاندان کی عزت ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، تم جانتے ہو تمہارے ساتھ انہوں نے کیا کیا ہے؟'' اس کے سوال پر وہ سر جھکا کر رہ گیا تھا۔

''اس شخص نے چوہے دانی لگائی ہے اور تم اس چوہے دانی میں پھنس چکے ہو ضرغام، تمہاری مکمل خبر گیری کی گئی ہے اور صبح فلیٹ پر چھاپہ پڑنے کا سو فیصد امکان ہے، ان لوگوں کے پاس تمہاری اور اس لڑکی کی تصویریں ہیں اور وڈیو ٹیپ اور تو اور انہوں نے تم دونوں کی فیک میڈیکل رپورٹس تک بنوالیں ہیں وہ تم پر اور اس لڑکی پر حد لگوانا چاہتے ہیں اور آگے تم خود سوچ لو، کہ یہ سارا اسکینڈل تمہیں اور تمہارے خاندان کو کہاں لا کھڑا کرے گا؟'' ہارون اطہر ایک لمحہ کو خاموش ہو کر اسے سوچنے کا موقع دیا، وہ سر جھکائے اب بھی چپ تھا۔

''اور اب اس سارے مسئلے کا ایک ہی حل ہے، تم اس لڑکی سے نکاح کر لو ضرغام، آج اور ابھی۔''

☆☆☆

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی جب وہ اندر داخل ہوا تھا، نظر جھکائے وہ روز کی طرح آج بھی اس کے روبرو آ بیٹھا تھا، اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور پھر سے اپنے ہاتھوں پر جما دی تھی۔

''مجھ سے شادی کرو گی جیا فاروق احمد۔'' دفعتاً اس کی سرگوشی نما آواز گونجی تھی اور اسے ساکت کر گئی تھی۔

''ہر کام ویسے نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں بلکہ ویسے ہوتا ہے جیسے ہمارا رب چاہتا ہے اور یقیناً ہمارا رب ہی بہتر چاہتا ہے۔''

اعظم شہریار کی چال ناکام ہو گئی تھی اور وہ اب زخمی شیر کی طرح بلبلا رہا تھا۔

''ایسے تو نہیں چھوڑوں گا تمہیں ضرغام عباس، ایک کاغذ کے ٹکڑے کے باعث تم مجھ سے نہیں جیت سکتے۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ سیل پر نمبر ملا رہا تھا۔

"معروف سیاستدان اور وفاقی وزیر آغا علی عباس کے بیٹے ایس پی ضرغام عباس کا لوئر مڈل سے تعلق رکھنے والی جیا فاروق احمد سے خفیہ نکاح۔" خبر بمباسٹک تھی بریکنگ تھی اسی لئے ہر نیوز چینل نے بریک کی تھی، وہ ایک ہاتھ میں ریموٹ پکڑے ہر سیکنڈ بعد چینل تبدیل کرتے دوسرے ہاتھ سے مسلسل اس کا نمبر ملانے میں مصروف تھے اور اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا، بی جان بہت خاموشی سے ٹی وی سکرین پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی، ابھی سے کچھ دیر پہلے ہی وہ انہیں اور ان کی تربیت دونوں کو خراج تحسین پیش کر چکے تھے۔

"یاد رہے ضرغام عباس معروف سیاستدان اعظم شہریار کی بہن مغوی شہریار سے منسوب تھے اور عنقریب دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے والے تھے۔" نیوز کاسٹر پوری دل جمعی سے تفصیلات سنانے میں مگن تھی، انہوں نے ایک قہر بھری نظر خوش پوش حسینہ پر ڈالی تھی، یوں جیسے وہ ان کی نظروں سے ہی ان کے اندر کا حال جان لے گی اور خاموش ہو جائے گی۔

"ہم دونوں خاندانوں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ہیں جیسے ہی مزید تفصیلات سامنے آتی ہیں ہم اپنے ناظرین کو آگاہ کرتے رہیں گے، فی الحال ایک بریک لیتے ہیں۔" انہوں نے ٹی وی آف کیا اور ایک بار پھر اس کا نمبر ملانے لگے تھے۔

ضرغام نے خود میڈیا کے سامنے آ کر اپنی اور جیا کے نکاح کا اعتراف کیا تھا اور اس شادی کی وجہ پسندیدگی اور محبت بتائی تھی، کھیل ہی ختم، انہوں نے ٹی وی پر نظر آتے ضرغام کو دیکھ کر دانت پیسے تھے، ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے ترجمان کے ذریعے اس خبر کی تردید کروا دیں گے اور اسے دشمنوں اور بدخواہوں کا پروپیگنڈہ قرار دیں گے مگر ضرغام نے ان کی سوچوں پر پانی پھیر دیا تھا، ایک بار ان کے سامنے آ جائے سارا عشق ناک کے راستے نکال دیں گے، انہوں نے تنفر سے سوچا تھا۔

☆☆☆

بی جان نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کی نمی صاف کی اور تاسف سے اسے دیکھا۔

"تو یہ جانتا تھا ضرغام کہ عزت اہم ہوتی ہے کاش تو یہ بھی جانتا ہوتا کہ عزت سب کی اہم ہوتی ہے اور سب کے لئے اہم ہوتی ہے۔" اس کا سر مزید جھکا تھا۔

"میں جانتا ہوں بی جان میں نے غلطی کی ہے اور میں اس پر شرمندہ بھی ہوں۔" اس نے اعتراف کیا تھا لہجہ شرمندگی بھرا تھا۔

"صرف شرمندہ ہونا ہی اہم نہیں ہے ضرغام عباس، غلطی کی ہے تو مداوا کرنا بھی سیکھو۔" بابا جان کے کڑکتے لہجے پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا، وہ دونوں بازو پیچھے باندھے اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"مجھے تم سے محبت ہے۔" اس کے لفظوں میں آج بھی وہی اثر تھا وہی سچائی تھی اور وہی خوشبو تھی مگر سامنے بیٹھی ہستی کی آنکھوں میں آج بے اعتباری تھی اور اس بے اعتباری کو دیکھنے اس کو اندر سے کسی چیز نے کاٹا تھا، یہ عورت ہے، جس کے لئے اس نے اپنے گھر والوں کی مخالفت مول لی تھی، یہ عورت ہے جس سے وہ اندھا عشق کرتا ہے یہ عورت ہے جس کی محبت میں وہ ہر حد پھلانگ گیا تھا، حتیٰ کہ ساری زندگی اپنے ضمیر کی مار سہنے کو تیار تھا اور یہی عورت اسے بے اعتبار نظروں سے دیکھ رہی تھی، ساری دنیا اس کا اعتبار

نہ کرتی اسے پرواہ نہیں تھی مگر ایک یہ عورت اس پر اعتبار کرتی، وہ اسے جانتی تھی وہ اسے سمجھتی تھی، یہ اس کے دعوے تھے، اس کے دعوے کتنے بودے تھے اور دوسری طرف بیٹھی وہ بھی دکھ کے جنگلوں میں بھٹک رہی تھی اور یہ مرد ہے اور پرت در پرت ہے، یہ مرد جسے میں نے جب سے دیکھا میں نے اور کچھ نہیں دیکھا، اسے جانا تو باقی کسی چیز کو جاننے کی خواہش نہیں رہی، جسے میں نے ایک دنیا کی مخالفت مول کر اپنانا چاہا اور یہ مرد ابھی پچاس لوگوں اور دس کیمروں کے سامنے اعتراف کر آیا ہے اسے جیا فاروق احمد سے محبت ہے اور اب اس سنسان جگہ پر بیٹھا مجھ سے کہہ رہا ہے اسے مجھ سے محبت ہے اور پھر چاہتا ہے میں اس کا اعتبار کروں میں اس کا اعتبار کس طرح کروں؟

"میں تمہیں بیچ میں لے آیا تھا، اس نے درمیان میں تمہاری ذات رکھ دی تھی، وہ کہتا تھا وہ تمہیں مجھ سے چھین لے گا، میں ڈر گیا، میں تمہیں کھونے سے ڈر گیا، تم سے بچھڑنے سے خوف کھا گیا تمہارے بغیر میری ذات، میری بات، میرا آج میرا کل سب ادھورا، میں خود نامکمل، میں اس کی بات کیسے نہ مانتا۔" وہ اسے بتا رہا تھا لفظ لفظ حرف حرف اس کے سامنے کھول رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کی اتنی محبت پر ہنسے یا روئے۔

☆☆☆

سنہری شام پہاڑوں سے اتر آئی تھی جب اس نے کھڑکی کھولی بابا جان اور بی جان لان میں موجود تھے اور آپس میں محو گفتگو تھے، ہلکے سبز کپڑوں میں بالوں کی ڈھیلی ڈھالی سے پونی بنائے میک اپ اور زیور وغیرہ سے پاک چہرا لئے جیا ضرغام عباس نے چائے کی ٹرے لا کر میز پر رکھی تھی، اس نے دیکھا ٹرے میں آج بھی تین ہی کپ تھے، اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ چھلکی بابا جان نے جیا کی طرف جھکتے کچھ کہا تھا، شاید بی جان کو چھیڑا تھا، تبھی ان کے چہرے پر مصنوعی خفگی چھلکی تھی اور جیا کے لبوں پر ہلکی سی ہنسی، بابا جان میں آنے والا بدلاؤ ان سب کے لئے حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی، اس نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھا تھا۔

تو طے ہوا محبت میں سب کچھ جائز ہو تب بھی خود غرضی جائز نہیں ہوتی جو لوگ محبت کے نام پر خود غرض ہو جاتے ہیں، ان کی زندگیوں میں باقی ہر شے بھلے موجود رہے خود محبت موجود نہیں رہتی، اس کی زندگی میں بھی نہیں رہی تھی مغوی شہریار نے بھلے اسے معاف کر دیا تھا مگر اب وہ مزید جیا فاروق کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی، مغوی شہریار کے لئے جیا فاروق کا بہت کچھ چھینا گیا تھا، اب مغوی شہریار کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے جیا فاروق کو دان کرنا تھا حساب برابر تو شاید نہ ہوتا مگر اسے کوشش تو کرنی تھی اور جیا فاروقی اس نے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا تو صرف اپنے معذور باپ اور بے بس ماں کے لئے یا شاید اس لئے کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، وہ آج بھی اس کے سامنے نظریں جھکائے رکھتا ہے، وہ بارہا اس سے اپنے کیے کی معافی مانگ چکا ہے اور وہ کہتی ہے، ابھی میرے زخم کچے ہیں ابھی رستے ہیں اور تکلیف دیتے ہیں، ابھی ان پر کھرنڈ آنے میں دن لگیں گے اور ضرغام عباس محو انتظار ہے کب وہ دن آئے جب وہ دل سے اسے معاف کر سکے اور وہ دونوں جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ایک ساتھ چل سکیں پتا نہیں کب؟

☆☆☆

روبینہ سعید

"اے لو! اری میری بچی، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟" اماں نے چھالیہ سروتے سے کترتے ہوئے کہا۔

"ہائیں۔" الوینہ نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تو اماں آپ کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، اماں میں کام کر کر کے تھک جاتی ہوں، پکا پکا کر ہلکان ہو جاتی ہوں، ایک وقت کا پکا کر ہٹتی ہوں کہ دوسرا وقت سامنے کھڑا تیار ہوتا ہے اور ابا میاں......" وہ ذرا سانس لینے کو رکی۔

"ابا میاں تو کھانے پینے سے زیادہ کھلانے پلانے کے شوقین ہیں، جب دیکھو کبھی پائے لئے چلے آ رہے ہیں، تو کبھی دس دس کلو مچھلی ہاتھ میں پکڑ رکھی ہے، سامان میرے ہاتھ میں تھمایا اور خود لگے باری باری اپنے سب بچوں کو دعوت دینے، ہاتھ میں موبائل لیا اور حسن بھائی، محسن بھائی، شکیلہ آپا، نائلہ کے ساتھ ساتھ اپنی بھانجی بشریٰ کو بھی دعوت دے دی کہ پائے پک رہے ہیں چلو جلدی سے گھر آنے کی تیاری کرو، اب اماں کوئی اکیلا تو آنے سے رہا، شام ہوتے ہوتے سب اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، پھر تو گھر میں کسی میلے کا سا سماں ہوتا ہے، بڑے اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوتے ہیں اور بچوں نے الگ ادھم مچایا ہوتا ہے، کیا بتاؤں اماں...... میرا تو قسم سے رونے والا حال ہو جاتا ہے۔" الوینہ بات کرتے کرتے یکدم ہی آبدیدہ ہو گئی۔

"پکا کر الگ دو، اور نخرے الگ برداشت کرنے پڑتے ہیں، ثمرہ بھابھی تو کھاتی بھی جاتی ہیں اور کوئی نہ کوئی نقص بھی نکال دیتی ہیں، یوں جیسے مجھے تو کچھ پکانا ہی نہیں آتا اور...... اور...... پھر اماں ان سب کے کھانا کھانے کے بعد مجال ہے جو کوئی کچن سنبھالنے میں میری مدد کرے، نجانے اماں آپ نے کیا دیکھا جو مجھے وہاں جھونک دیا اور تو اور بھائی بہنوں کو دیکھ کر احسن بھی جیسے بدل سے جاتے ہیں، وہاں ڈرائنگ روم میں سب بیٹھے خوش گپیوں میں معروف ہو جاتے ہیں، اے سی چل رہا ہوتا ہے اور میں وہاں کچن میں جل کڑھ رہی ہوتی ہوں، کہ اللہ پاک تو نے جو مجھے ایسے خوش خوراک لوگوں میں بھیج دیا ہے تو کم از کم دو چار نوکر بھی دے دیتا۔" الوینہ نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں جن میں نمی بھر گئی تھی، اماں شہادت کی انگلی ٹھوڑی پر ٹکائے اس کی بپتا سن رہی تھیں۔

"تو تمہاری ساس اپنی دوسری بہوؤں کو نہیں کہتیں کہ کام وام میں ہاتھ بٹائیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"کیسی بات کر رہی ہیں اماں۔" الوینہ نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"کام وام میں ہاتھ تو کیا بٹانا ہے، الٹا کئی چھوٹے چھوٹے کام مزید بتا بتا کر میرا کام بڑھاتی رہتی ہیں، الوینہ بیٹا، کھانے میں دیر ہے تو بچوں کو کچھ فروٹ کاٹ دو، بچوں کو بھوک لگ رہی ہو گی۔" الوینہ نے ساس کی نقل اتاری۔

"پھر میں اپنا کام چھوڑ کر جلدی جلدی جاتی ہے، اماں کیا بتاؤں، کبھی بھی تو میرا دل اپنے بال نوچنے کو کرتا ہے۔" الوینہ نے بات کرتے کرتے سچ مچ اپنے بال پکڑ کر کھینچ لئے۔

"ہیں ہیں کیا کرتی ہو۔" اماں نے اس کے ہاتھ بالوں پر سے ہٹائے۔

"ہاں تو اماں کیا کروں میں جب کھانے کو دیر ہو جاتی ہے تو ثمرہ بھابھی کچھ ایسی باتیں کرنے لگتی ہیں جیسے میں پھوہڑ ہوں، وقت پر کھانا فروٹ باسکٹ سے فروٹ نکال کر کاٹ کر دیتی ہوں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھانے میں مزید دیر ہو

بھی تیار نہیں کر سکتی، پھر ثمرہ بھابھی، حمیرا بھابھی، نائلہ اور شکیلہ آپا بھی باتوں باتوں میں اپنی سلیقہ مندیوں کے قصے شروع کر دیتی ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنے گھروں کو سنبھالے ہوا ہے اور اماں سب سے آخر میں اماں کا جوانی نامہ شروع ہو جاتا ہے، بس اماں یہ کلائمیکس ہوتا ہے کہ کس طرح اماں اپنی جوانی میں کام کرتی تھیں اور میرا بس نہیں چلتا ایسے وقت میں کہ میں کیا کروں۔" الوینا دل کی بھڑاس نکالتی جا رہی تھی۔

"اور پھر اگر ایسے میں گڑیا اور ٹیپو میں سے کوئی میرے سامنے آ جائے تو بس پھر دو دو چار چار تھپڑ دونوں کے لگا دیتی ہوں، بچے رونے لگتے ہیں تو احسن آ کر انہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور میں پھر ڈھیروں کام میں کھڑی رہ جاتی ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔" الوینا نے اپنی کنپٹیوں کو دبایا۔

"ارے کرنا کیا ہے؟ بس چھوٹا سا تمہارا مسئلہ ہے اور تم نے پہاڑ بنا لیا ہے۔" اماں نے اپنا تکیہ ہٹا کر کچھ ڈھونڈنے کے لئے ہاتھ مارا۔

"ہائیں اماں، یہ چھوٹا سا مسئلہ ہے، آپ کے ساتھ ہوتا نہ تو پھر میں پوچھتی۔" الوینا نے طنزیہ کہا۔

"ارے تو اور کیا، چھوٹا سا ہی تو مسئلہ ہے، یہ لو۔" اماں نے بالآخر تکیے کے نیچے سے اپنی مطلوبہ چیز برآمد کر ہی لی۔

"یہ کیا؟" الوینا نے حیرت سے دیکھا اماں کے ہاتھ میں ان کی مشہور زمانہ پٹی تھی جو انہوں نے اتنی استعمال کی تھی کہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئی تھی، اماں نے پٹی الوینا کے ہاتھ میں تھمائی۔

"اس کا کیا کروں؟" اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اماں یہ پٹی اسے کیوں دے رہی ہیں۔

"اری بے وقوف یہی پٹی تیرے سارے مسئلے حل کروائے گی۔" اماں مسکرائیں۔

"وہ کیسے؟"

"جب بھی گھر میں دیکھو کام وام زیادہ ہے بس یہ پٹی نکالو اور سر پر کس کر باندھ لو، سر میں خوب سارا سرسوں کا تیل لگا لو اور بستر پر پڑ جاؤ، ہائے ہائے کرنا نہ بھولنا، بس پھر دیکھنا یہ ثمرہ، حمیرا اور بشریٰ باتیں کرتی نظر نہیں آئیں گی بلکہ سارا کام وام کر کے جائیں گی، کھانا تمہیں پکا پکایا تمہارے کمرے میں دے کر جائیں گی۔"

"اور اماں اگر ایسا نہ ہوا تو؟" الوینا شش و پنج میں تھی۔

"ایسا ہی ہوگا۔" اماں پر زور آواز میں بولیں۔

"مگر اماں اگر یہ پٹی میں لے جاؤں گی تو آپ اپنے سر درد کا کیا کریں گی یہ پٹی تو آپ باندھتی ہیں۔" اماں مسکرا دیں۔

"اب مجھے پٹی کی ضرورت نہیں رہی۔"

"ہیں۔" وہ تھوڑا حیران ہوئی۔

"مگر اماں اگر کسی کو پتہ چل گیا تو۔" وہ ہچکچا رہی تھی۔

"کیسے پتہ چلے گا؟" اماں نے دوبارہ پاندان کھول لیا۔

"مگر پھر بھی اماں، اگر احسن کو ہی پتہ چلا کہ میں مکر کر رہی ہوں تو پھر۔"

"ایک بات بتا الوینا۔" اماں نے کتھا اپنی انگلی پر لگا کر چاٹا۔

"ہاں جی۔" الوینا نے ان کی آنکھوں میں دیکھا اماں مسکراتی آنکھوں سے کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔

"تمہیں آج تک کچھ پتہ لگا۔" الوینا کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہ آیا پھر یکدم ہی اس کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔

"تو اماں آ...... آ...... آپ بھی۔" اس کی آواز میں بے یقینی در آئی۔

اماں کچھ دیر تک مسکراتی رہیں، پھر پاندان رکھ کر انگلیاں پاس رکھے رومال سے صاف کیں۔

"تمہارے ابا، اللہ جنت نصیب کرے، آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، عید بقر عید دن تہوار سب کے سب چلے آتے تھے کہ جی بڑے بھیا باپ کی جگہ ہیں، ذرا دیر میں ہی گھر ایسے لگنے لگتا تھا جیسے عید کا میلہ لگا ہے، بس میں تو ایسے میں تمہارے ابا کو کہہ دیتی تھی کہ میرے سر میں شدید درد ہے، کوئی میرے کمرے میں نہ آئے، تمہاری پھپھو اور چاچیاں خود ہی کھانے پکانے کا اہتمام کرتی تھیں، اللہ اللہ خیر صلا۔"

الوینا حق دق بیٹھی تھی، اسے آہستہ آہستہ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔

شام کو احسن اسے لینے آ گیا اور وہ اماں کی مشہور زمانہ پٹی بیگ میں رکھ کر سسرال آ گئی، اس کی ساس نے کھانا وغیرہ تیار کیا ہوا تھا، کھانا کھا کر وہ اوپر اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی، گڑیا اور ٹیپو پہلے ہی اپنے دادا کے کمرے میں چلے گئے تھے۔

☆☆☆

ذوالفقار احمد بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، بیوی سنجیدہ بانو ایک سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون تھیں، ان کے پانچ بچے تھے سب سے بڑا احسن پھر محسن پھر شکیلہ اس کے بعد نائلہ اور سب سے چھوٹا احسن تھا، ذوالفقار احمد ایک زیرک اور سمجھدار انسان تھے ہر کام پلاننگ کے تحت کرتے، اپنی ریٹائرمنٹ تک انہوں نے اپنے بچوں کے لئے اتنا کر دیا تھا کہ زمانے کے سرد گرم سے بچنے کے لئے انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، حسن اور محسن کے لئے پلاٹ خرید کر ان کی مرضی کے گھر بنوا دیئے تھے، حسن شادی کے کچھ عرصے ہی ساتھ رہا پھر ذوالفقار احمد نے جب محسن کا رشتہ طے کیا تو احسن کو علیحدہ کر دیا، حسن بیوی کو لے کر نئے گھر میں شفٹ ہو گیا، اسی طرح محسن کی شادی سے پہلے محسن کو الگ گھر میں شفٹ کر دیا، بیٹوں کی شادیاں خوب دھوم دھام سے کیں، احسن ان کا اور سنجیدہ بانو کا چھوٹا بچہ ہونے کے سبب بہت لاڈلہ تھا، اگرچہ حسن اور محسن کی طرح ذوالفقار احمد نے احسن کے لئے بھی گھر بنوا دیا تھا مگر احسن بھی ماں باپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لئے اس نے علیحدہ ہونے سے انکار کر دیا، ذوالفقار احمد ایک پریکٹیکل انسان تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ گھریلو رنجش پیدا ہوں گی تو بچوں کو الگ کیا جائے، ان کا نظریہ تھا کہ بچے جب اڑنے کے قابل ہو جائیں تو انہیں اڑنے دینا چاہیے، کرنے کو تو انہوں نے بیٹوں کو الگ کر دیا تھا مگر پدرانہ شفقت سے مجبور ہو کر آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ ڈھونڈتے رہتے تھے کہ سارے بچے کچھ دیر کے لئے ہی سہی ان کے گھر اکٹھے ہو جائیں۔

احسن کی بیوی الوینا فطرتاً کچھ سستی کی بناء پر اور کچھ اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے گھر کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی، الوینا اپنی بہنوں اور بھائیوں میں آخری بہن ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلی تھی، گھر کا کوئی کام نہیں کرتی تھی گھر کا سارا کام بڑی، بہنیں فائقہ اور ہادیہ نے سنبھالا ہوا تھا، شادی کے بعد جو یکدم ذمہ داری اس پر پڑی تو وہ تو بوکھلا گئی، اس وقت تو بہت مسئلہ بنتا تھا جب ابا میاں کچھ ایسا پکانے کے لئے لے آئے تھے جو

اسے پکانا ہی نہیں آتا تھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے، ایسے میں وہ فائقہ اور کبھی ہادیہ سے فون پر پوچھ پوچھ کر پکاتی، ایسے ہی شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے اس عرصے میں فیملی میں گڑیا اور ٹیپو کی صورت میں اضافہ بھی ہو چکا تھا۔

جب سارے لوگ گھر میں جمع ہوتے تو الوینا اتنے سارے لوگوں کا کھانے پینے کا انتظام میں ہی ہلکان ہو جاتی اور آج جب وہ اپنے میکے میں اپنی اماں کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی تو اماں نے اسے جھوٹ موٹ بیمار پڑ جانے کا کہا تھا تاکہ اسے کام وام نہ کرنا پڑے، اماں کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں بہت سارے ایسے منظر آ رہے تھے جب گھر میں مہمان بھرے ہوتے تھے اور اماں پٹی باندھے ہائے ہائے کر رہی ہوتی تھیں، ایسے میں عذرا پھپھو، خدیجہ چاچی ہی زیادہ تر کچن سنبھالتی تھیں، اب جو اس پر وقت پڑا تو اس نے بہت سوچنے کے بعد اماں کا حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا، پہلے تو وہ ہچکچاتی رہی مگر پھر جو بچوں کو گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو نائلہ اور شکیلہ نے ایک ایک مہینے کے لئے ذوالفقار احمد کے گھر رہنے کا پروگرام بنایا، کچھ دن تو الوینا نے گھر سنبھالا، مگر پھر ایک دن اس نے اماں کی پٹی نکال کر باندھ لی، سر میں تیل لگا لیا تاکہ حالت خراب نظر آئے، ہائے ہائے کی آوازوں سے سنجیدہ بانو گھبرا گئیں اور ڈاکٹر کو بلوایا، ڈاکٹر دوائیں لکھ کر رخصت ہو گیا تو اس کی جان میں جان آئی، سنجیدہ بانو اسے آرام کرنے کا کہہ کر خود کچن کی طرف بڑھ گئیں مگر نائلہ اور شکیلہ نے انہیں کچن سے نکال کر کام سنبھال لیا، جب شکیلہ ٹرے میں کھانا رکھ کر الوینا کے سامنے لائی تو الوینا جھوم اٹھی اماں نے یہی تو کہا تھا کہ پکا پکایا تمہارے سامنے لایا جائے گا۔

''واہ اماں۔'' اس نے کھانا کھاتے ہوئے اماں کو داد دی۔

☆☆☆

احسن پریشان ہو گیا تھا، الوینا کے سر درد کو پندرہ بیس دن ہو چکے تھے، الوینا کے سر پہ پٹی بندھی ہوئی تھی، نائلہ اور شکیلہ جو ایک مہینہ رہنے کے لئے آئی تھیں اب گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں، الوینا دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔

''مان گئی اماں آپ کو میں۔'' دونوں نندوں کے گھر چلے جانے کے اگلے دن الوینا کا سر کا درد غائب ہو گیا اور اس نے دوبارہ گھر سنبھال لیا، مگر آرام کرنے کا مزہ اسے پڑ چکا تھا، کچھ دنوں بعد ابا میاں کے کچھ پرانے دوستوں نے ان سے حلیم کی فرمائش کی تو ابا میاں ٹال نہ سکے اور حلیم کا سارا سامان لا کر الوینہ کے حوالے کیا اور خود لاؤنج میں بیٹھ کر خبریں سننے لگے، ادھر کچن میں الوینہ سامان رکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

''مجال ہے جو دو دن مجھے آرام کرنے دیں۔'' اس نے گوشت نکال کر پرات میں ڈالا اور چھری سے گوشت صاف کرنے لگی۔

''حرام ہے جو سکھ کا سانس ابا میاں مجھے لینے دیں، مجھ سے تو خدا واسطے کا بیر ہے۔'' اس نے چھری ایک طرف رکھی اور گوشت دھونے لگی۔

''کبھی اتنا کام ابا میاں نے اماں بی سے نہیں کروایا ہو گا جتنا ان پانچ سالوں میں مجھ سے کروایا ہے، غضب خدا کا کبھی حلیم تو کبھی پائے، کبھی شب دیگ تو کبھی حریصہ۔'' اس نے چولہے کو آن کر کے دیگچہ چولہے پہ پٹخ دیا، کچھ پانی دیگچے میں سے چھلک کر چولہے کے اردگرد گر گیا۔

''ہائے ہائے، اب پانی بھی صاف کرنا پڑے گا۔'' وہ جھنجھلا گئی اور صافی تلاش کرنے لگی۔

''ایک کام ختم نہیں ہوتا دوسرا شروع۔'' صافی کی تلاش میں جو ادھر ادھر ہاتھ مارا تو برتن یہاں وہاں لڑھک گئے، کپ کو گرنے سے بچایا مگر کپ تو بچ گیا لیکن گلاس نیچے گر ہی گیا۔

''آئے ہائے۔'' گلاس گرتے ہی چکنا چور ہو گیا، اس کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا، ابھی چولہے کے گرد گرا پانی صاف ہوا نہیں تھا کہ کانچ فرش سے سمیٹنا پڑ گیا، قضا کی ماری گڑیا ٹیپو کی شکایت لے کر وہاں آ گئی پیچھے پیچھے ٹیپو بھی تھا۔

''امی...... امی یہ دیکھیں...... بھائی نے......''

''نہیں امی...... گڑیا جھوٹ بول رہی ہے۔'' ٹیپو نے گڑیا کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی کہ چیخ کے بولا، ادھر گڑیا چیخ رہی تھی، الوینہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دو تھپڑ ٹیپو کے لگائے۔

''کم بختو، مجھے بھی تو سکھ کا سانس لینے دیا کرو۔'' وہ مارتے ہوئے چلائی۔

''امی...... آپ گڑیا کو کچھ نہیں کہتی۔'' ٹیپو روتے روتے چلایا اس نے ایک دھمو کا گڑیا کے بھی جڑ دیا، گڑیا نے فوراً ہی اپنا والیوم اونچی آواز میں کھول دیا۔

''بند کرو آواز۔'' اس نے گڑیا کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''ہائے ہائے بہو کیا کرتی ہو۔'' سنجیدہ بانو نے بروقت آ کر گڑیا کو چھڑایا، اس نے چھوڑتے چھوڑتے بھی دو چار چانٹے مزید گڑیا کے رسید کیے۔

''اماں بی ناک میں دم کر دیا ہے ان بچوں نے میرا۔'' وہ ہانپ رہی تھی۔

''کوئی لمحہ سکون کا نہیں جانے دیتے، ہر وقت طوفان اٹھا کر رکھتے ہیں۔''

''چلو بس کرو۔'' اماں بی نے گڑیا کو گود میں اٹھا لیا۔

''چلو آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔'' اماں بی نے منہ بسورتے ٹیپو کو چمکارا اور دونوں بچوں کو لے کر کچن سے باہر آ گئیں، الوینہ نے جیسے تیسے کر کے فرش صاف کیا اور حلیم کی طرف متوجہ ہو گئی مگر اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا، اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں آیا، بیڈ روم میں آ کر اس نے پٹی سر پر باندھ لی اور کچن میں آ گئی اماں بی جو کسی کام سے کچن میں آئیں تو اسے پٹی باندھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

''اے دلہن کیا ہوا؟ پٹی کیوں باندھ لی؟'' وہ پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''کیا بتاؤں اماں بی۔'' الوینا نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

''درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔'' الوینہ نے اپنی آواز ایسی بنا لی جیسے وہ واقعی اذیت میں مبتلا ہو۔

''آئے ہائے۔'' وہ تاسف سے بولیں۔

''جب اتنا درد ہے تو یہاں کیا کر رہی ہو جاؤ آرام کرو۔'' سنجیدہ بانو فطرتاً شریف اور نیک خاتون تھیں، تب ہی اس کی بات پر تڑپ اٹھیں۔

''کیسے آرام کروں اماں بی۔'' الوینہ نے دکھی آواز میں کہا۔

''اتنا کام ہے، میں اگر آرام کرنے لگی تو بس پک چکا حلیم۔'' اس نے طنزیہ کہا اور فریج کھول کر ہرا مصالحہ نکالنے لگی، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، لیموں اور ادرک نکال کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور چھری اٹھا کر مصالحہ کاٹنے بیٹھی مگر اماں بی نے اسے زبردستی آرام کرنے بھیج ہی دیا، ساتھ ہی دودھ کا گلاس لے کر اسے دوا کھلانے اس کے

پیچھے پیچھے بیڈروم میں آ گئیں۔

"چلو پہلے دودھ سے دوا کھاؤ، پھر سو جاؤ، کام میں دیکھ لوں گی۔" انہوں نے شفقت سے کہا ان کے خلوص کے آگے الوینہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔

"نہیں اماں بی میں ٹھیک ہوں۔"

"اے خاک ٹھیک ہو، حالت ذرا اپنی دیکھو کیا ہو رہی ہے، چلو شاباش دوا کھا کر سو جاؤ اور حلیم کی فکر نہ کرو، میں تمہارے ابا میاں سے کہتی ہوں شکیلہ یا نائلہ میں سے کسی کو بلا لیتے ہیں، وہ آ کر حلیم دیکھ لیں گی۔"

"اچھا چلیں ٹھیک ہے۔" الوینہ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا، شرمندگی کا جو احساس تھوڑی دیر پہلے گھیرے ہوئے تھا، شکیلہ اور نائلہ کا نام سنتے ہی کہیں اڑن چھو ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"میں نے بھی بڑا پکا پکا کر سب کو کھلایا ہے اب اگر شکیلہ آپا اور نائلہ ذرا سے ہاتھ پیر ہلا لیں گی تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔" وہ اطمینان سے سوچتی ہوئی لیٹ گئی۔

ابا میاں نے پہلے نائلہ کو فون کیا تو پتہ لگا کہ نائلہ کی نند کی آج دعوت تھی، اس کی نند کی ساری سسرال والے نائلہ کے گھر مدعو تھے، اس لئے اس کے آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، لہٰذا ابا میاں نے پھر شکیلہ کو فون کیا، شکیلہ کے میاں بابر نے بتایا کہ شکیلہ کو ملیریا ہوا ہے جس کی وجہ سے اسے بخار سے نڈھال کیا ہوا ہے ساتھ ساتھ سردی بھی لگ رہی ہے ابا میاں نے ساری صورتحال اماں بی کو بتائی، اماں بی تو سن کر پریشان ہو گئیں اور تو کچھ نہ سوجھا، فوراً احسن کو فون کیا کہ فوراً آفس سے آف کر کے بشریٰ کو لے آئے، بشریٰ ابا میاں کی بھانجی تھی۔

ماں باپ حادثے میں مر گئے تھے اب چچا اور دادی کے ساتھ رہتی تھی، ابا میاں کو اپنی اس بھانجی سے بہت پیار تھا، ان کی بڑی خواہش تھی کہ بشریٰ ان کی بہو بنتی، مگر ان کی خواہش تشنہ ہی رہی، محسن اور حسن تو بشریٰ سے کافی بڑے تھے، ابا میاں احسن سے بشریٰ کو بیاہنا چاہتے تھے مگر احسن نے کسی شادی کی تقریب میں جو الوینہ کو دیکھا تو بس اسی کے حسن کے دیوانے ہو گئے اور بڑے سبھاؤ سے بات ابا میاں اور اماں بی تک پہنچا دی، ابا میاں بڑے سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے، احسن کا رجحان جہاں دیکھا، چپ چاپ اماں بی کو راضی کر کے وہاں رشتہ لے گئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ زبردستی اپنی یتیم بھانجی کو بیٹے کے سر منڈھ دیں، لہٰذا صبر کر کے بیٹھ گئے، ابھی بھی وہ بشریٰ کے لئے اچھے رشتے کی تلاش میں تھے۔

بشریٰ کو احسن لے آئے تھے، اس نے آتے ہی جلدی جلدی سارا کام نمٹایا، اماں بی پہلے تو اس کے ساتھ لگی رہیں مگر بشریٰ نے بعد میں انہیں کچن سے بھیج دیا، احسن کو چائے کی طلب ہو رہی تھی بشریٰ نے جلدی سے اسے چائے بنا کر دی، گڑیا اور ٹیپو کو بھوک لگنی شروع ہو چکی تھی، بشریٰ نے فٹافٹ دونوں کو نوڈلز بنا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا دیا۔

"بشریٰ آنٹی آپ کتنی اچھی ہیں۔" گڑیا نے نوڈلز ختم کر کے بشریٰ سے کہا۔

"اچھا۔" بشریٰ ہنسی۔

"اور آپ بھی تو کتنی اچھی ہو۔" بشریٰ نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

"آپ کو پتہ ہے آج امی نے ہمیں مارا۔" ٹیپو بھی اس کے نزدیک آ گیا۔

"اچھا وہ کیوں؟"

"بس۔" ٹیپو نے سر جھکا۔

"میں اور گڑیا لڑ رہے تھے کہ امی نے ہم دونوں کی پھر پٹائی کی۔" ٹیپو کی آنکھوں میں اس وقت کو یاد کر کے پھر آنسو بھر گئے۔

"بھائی رو نہ۔" گڑیا بشریٰ کی گود سے پھسل کر نیچے اتری۔

"امی گندی بچی۔"

"بری بات گڑیا۔" احسن جو پاس ہی کہیں تھا، آگے آ گیا غالباً وہ کچن کے دروازے کے پاس کھڑا تھا، اس نے گڑیا کو گود میں بھر کر پیار کیا۔

"نہیں پاپا...... امی گندی بچی...... اتی زور سے مارا، ایسے کر کے۔" گڑیا نے اپنے منہ پر تھپڑ خود مارا۔

"کیا کرتی ہو گڑیا، بری بات۔" بشریٰ نے احسن کو گود سے گڑیا کو لے لیا۔

"لائیے گڑیا کو مجھے دیں، اس نے نوڈلز کھائے ہیں، میں اس کا منہ دھلوا دوں۔" وہ گڑیا کو لے کر کچن سے نکلی۔

"چلو آؤ ٹیپو۔" اس نے ننھے ٹیپو کا ہاتھ تھاما، دونوں بچوں کو اچھی طرح سے منہ ہاتھ دھلوا کر ان کے کپڑے تبدیل کیے گڑیا کو نیند آ رہی تھی۔

"بشریٰ آنٹی گڑیا سونے سے پہلے فیڈر سے دودھ پیتی ہے۔" ٹیپو نے بشریٰ کو بتایا، بشریٰ نے پھرتی سے فیڈر بنا کر گڑیا کے منہ میں لگایا اور سنجیدہ بانو کی گود میں گڑیا کو لٹا دیا، انہوں نے دونوں بچوں کو سلا دیا، بشریٰ واپس کچن میں آ گئی اور جلدی جلدی کچن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

الوینہ کو سو کر اٹھنے پر احسن سے پتہ چلا کہ شکیلہ آپا یا نائلہ میں سے کوئی نہیں آ سکا تو اماں بی نے بشریٰ کو کام کے لئے بلایا ہے۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" اس نے سوچا۔

"شکیلہ آپا یا نائلہ نہ سہی تو بشریٰ سہی۔" وہ مطمئن ہو گئی، بشریٰ اس کو کھانا بیڈروم میں ہی دے گئی۔

"کیسی طبیعت ہے بھابھی اب آپ کی؟" بشریٰ نے اس کے پاس ٹرے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت درد ہے۔" الوینہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

"قسم سے بشریٰ سر میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔"

"آپ کھانا کھا کر دوا لے لیں، انشاء اللہ آرام آ جائے گا۔" بشریٰ نے نہایت خلوص سے کہا۔

"اچھا۔" الوینہ اٹھ بیٹھی۔

"بھوک تو نہیں ہے، مگر تھوڑا سا لے لیتی ہوں، تم نے کھانا کھایا۔" اسے کھاتے ہوئے خیال آیا۔

"نہیں بھابھی مجھے بھوک نہیں ہے، آپ کھائیں میں کچن میں ہوں برتن رہ گئے ہیں دھلنے والے۔" وہ عجلت میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

ابا میاں کے دوست جا چکے تھے، ڈرائینگ روم سے تمام برتن وغیرہ احسن نے اندر پہنچائے، جہاں بشریٰ جلدی جلدی برتن دھو رہی تھی، احسن کو شرمندگی کے احساس نے گھیر لیا۔

"سوری بشریٰ!" وہ اس کے قریب آ گیا۔

"ارے۔" بشریٰ حیرانی ہوئی۔

"سوری کس لئے؟"

"دراصل الوینہ کی وجہ سے......"

"کوئی بات نہیں، تھوڑا سا کام ہی تو ہے، پھر کیا ہوا؟" اس نے فوم کے اسفنج پر لیکوئڈ انڈیلا اور جھاگ بنا کر جلدی جلدی برتنوں پر لگانے لگی۔

"لاؤ میں ہیلپ کرواؤں۔" احسن آگے بڑھا۔

"ارے نہیں نہیں۔" اس نے احسن کو گلاس اٹھاتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا، احسن نے بے حد چونک کر اسے دیکھا، بشریٰ کو فوراً ہی احساس ہوا کہ اس نے احسن کا ہاتھ تھام لیا ہے تو جھٹ سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"آپ جائیے یہاں سے۔" اس نے نظریں جھکائیں اور خجالت مٹانے کے لئے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی، اسے قدموں کی چاپ سنائی دی، اس نے رخ موڑ کر دیکھا، احسن جا چکا تھا۔

☆☆☆

الوینہ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اماں کی پٹی نکال کر باندھ لیتی تھی، اب تو اماں بی بھی عادی سی ہو گئی تھیں اس سارے عمل کی، ادھر الوینہ پٹی سر پر باندھ کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑتی ادھر اماں بی احسن کو فون کر بشریٰ کو بلا بھیجتیں، ایسے ہی ایک دن فائقہ اس کی طرف چلی آئی، شرجیل اسے گھر سے باہر چھوڑ گیا تھا، فائقہ اندر آئی تو لان میں احسن اور بشریٰ کو دیکھا جو کرسیوں پر بیٹھے نجانے کس بات پر ہنس رہے تھے، ان کو اس طرح ہنستے دیکھ کر فائقہ کے اندر کہیں دور خطرے کی گھنٹی سی بجی، اسے ان دونوں کا اس طرح بے تکلف ہو کر ہنسنا ناگوار سا گزرا، گڑیا بھی بشریٰ کی گود میں تھی، فائقہ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اسے الوینہ کہیں نظر نہیں آئی۔

"السلام علیکم!" اس نے نسبتاً اونچی آواز سے سلام کیا، ان دونوں نے چونک کر گیٹ کی سمت دیکھا، احسن اٹھ کر تیزی سے فائقہ کی سمت بڑھا۔

"آیئے آیئے فائقہ آپا، کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو اور الوینہ نظر نہیں آ رہی۔" وہ آگے بڑھی۔

"کیسی ہو بشریٰ؟" بشریٰ گڑیا کو لئے کھڑی ہو گئی۔

"میں ٹھیک ہوں آپا، الوینہ بھابھی کے سر میں درد ہے وہ آرام کر رہی ہیں۔"

"کیا ہوا الوینہ کو؟" فائقہ پریشان ہوئی۔

"ارے نہیں فائقہ آپا، گھبرائیں نہیں، بس سر میں درد ہے، آپ چلیں اندر میں چائے بناتی ہوں۔" بشریٰ نے گڑیا کو نیچے اتارتے ہوئے فائقہ کو تسلی دی۔

"فائقہ آپ اکیلی آئی ہیں؟ شرجیل بھائی نہیں آئے۔" احسن اس کے ساتھ اندر کی طرف چلنے لگا اور بشریٰ کچن میں آ گئی تو احسن واپس کچن میں آ گیا، الوینہ کے کمرے میں اندھیرا تھا فائقہ نے لائٹ روشن کی تو الوینہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا الوینہ؟" فائقہ اس کی طرف بڑھی۔

"احسن بتا رہے تھے سر میں بہت درد ہے۔"

"فائقہ آپا۔" الوینہ تیزی سے اٹھی۔

"آپ کب آئیں؟" فائقہ اس کا حلیہ دیکھ کر حیران ہوئی۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے اور...... اور ...... یہ پٹی کیوں باندھی ہے۔" وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"بس آپا! وہ ذرا سا سر میں......" الوینہ کے سامنے جھوٹ بولتے میں ہچکچائی۔

"اور یہ پٹی، اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہی تو یہ تو اماں کی پٹی ہے، تمہارے پاس کیسے؟" وہ حیران ہوئی جا رہی تھی، الوینہ چپ سی ہو گئی۔

"بولو نہ، اماں کی پٹی تمہارے پاس کیا کر رہی ہے۔"

"آپا...... وہ......" الوینہ کو سمجھ نہیں آیا کیا جواب دے۔

"چھوڑیں آپا...... آپ سنائیں آپ ٹھیک ٹھاک ہیں، شرجیل بھائی کیسے ہیں؟"

"مجھے باتوں میں نہ لگاؤ الوینہ۔" فائقہ تیز لہجے میں بولی۔

"بتاؤ مجھے یہ اماں کی پٹی تم نے کیوں باندھی ہوئی ہے؟" فائقہ نے الوینہ کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"وہ آپا...... دراصل۔" الوینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائقہ کو کیسے بتائے مگر فائقہ کے تابڑ توڑ حملوں نے الوینہ کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور اسے تمام قصہ اس کے سامنے اگلنا پڑا۔

"تمہیں شرم تو نہ آئی یہ سب کرتے ہوئے۔" فائقہ کا سارا معاملہ سن کر دکھ سے برا حال ہو گیا۔

"مگر تمہیں شرم کیوں آتی؟ تمہیں تو مزے پڑے ہوئے ہیں آرام کرنے کے، شادی سے پہلے مجال ہے جو تم گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹاتی تھی، صرف تم ہوتی تھیں اور الٹے سیدھے رسالے۔" فائقہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، الوینہ چپ بیٹھی تھی۔

"اور رسالوں کی جان چھوڑتی تھیں تو موبائل کا شغل ہاتھوں میں تھام لیتی تھیں اور اگر اس سے بھی جی بھر جاتا تو ٹی وی کے آگے گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی مگر حرام ہے جو کسی کام میں مدد کرواتی تھیں۔" الوینہ کا سر جھک گیا تھا۔

"اسی دن کے لئے کہتی تھی الوینہ ہاتھ پیر چلایا کرو، سسرال میں جا کر کیا کرو گی مگر تمہیں تو میں دشمن لگتی تھی، یہاں آ کر کام کرنا پڑا تو جان چھڑانے کو پٹی باندھ لی۔" اس کی طنزیہ آواز کمرے میں گونجی۔

"مگر آپا...... آپ یہ...... بھی تو دیکھیں کہ ابا میاں کبھی کسی کی دعوت کر دیتے ہیں اور کبھی کسی کی اور میں اکیلی کام کر کر کے ہلکان ہو جاتی تھی۔" الوینہ نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"ہاں تو کیا ہوا؟ اگر کام تھوڑا زیادہ کرنا پڑ گیا تو کیا قیامت آ گئی، یا کام کر کے گھس جاتی ہو جو اور تو کچھ نہ سوجھا پٹی باندھ لی اور پٹی بھی اماں کی۔" فائقہ نے الوینہ کے سر پر ہاتھ مار کر پٹی نوچ لی۔

"جانتی ہو جب گھر میں مہمان آتے تھے اور اماں یہ پٹی باندھ لیتی تھیں اور کمرے میں لیٹ کر یہ سمجھتی تھیں کہ انہوں نے سب کو بے وقوف بنا لیا تو الوینہ بی بی جان لو کہ ایسا نہیں تھا۔" الوینہ نے چونک کر فائقہ کو دیکھا، فائقہ نے کرب سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں الوینہ، جیسے میں جانتی تھی کہ اماں ہر درد کا دکھاوا کرتی ہیں اسی طرح عذرا پھپھو اور خدیجہ چاچی بھی جانتی تھیں، وہ دونوں کچن میں کام بھی کرتی جاتی تھیں اور چپکے چپکے باتیں بھی جاری رہتیں جو زیادہ تر اماں کے بارے میں ہوتی تھیں، میں بچی تھی مگر اتنی نا سمجھ بھی نہیں تھی کہ سمجھ نہ پاتی اور الوینہ کیا بتاؤں مجھے کتنا غصہ آتا تھا جب وہ اماں کو کام چور، سست، کاہل اور ہڈ حرام کے الفاظ کہتیں، وہ سمجھتی تھیں یہ بچی ہے اسے کیا سمجھ، مگر میری بہن تم نہیں جانتیں میں کس کرب سے گزرتی تھی مگر جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی

ویسے ویسے اس حقیقت کا ادراک مجھ پر ہوتا گیا کہ چاچی اور پھپھو اماں کو اگر ایسا کہتی تھیں تو اماں واقعی انہیں ایسا کہنے پر مجبور کرتی تھیں اب بھلا بتاؤ یہ کیا بات ہوئی کہ کوئی ہم سے محبت اور خلوص سے ملنے آیا اور ہم آگے سے اس کی خاطر مدارت کے بجائے الٹا اس سے کہیں کہ یہ لو جی یہ سارا سامان آیا رکھا ہے پکاؤ اور خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔"

فائقہ یہاں تک بتا کر چپ ہو گئی، الوینہ بھی خاموشی سے اسے دیکھے جا رہی تھی، کمرے میں ایک جان لیوا خاموشی پھیل گئی۔

"اور۔" فائقہ ذرا دیر خلا میں دیکھتی رہی اور پھر بولی تو الوینہ کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"اور الوینہ صرف کھلاؤ پلاؤ کا معاملہ نہیں تھا، عذرا پھپھو اور حمیدہ پھپھو اگر دس پندرہ دن کو رہنے آ جاتی تھیں تو اماں تو وہ ان کی جان کو عذاب میں ڈالتی تھیں کہ کیا بتاؤں، واشنگ مشین تو ہوتی نہیں تھی اماں دونوں پھپھوؤں سے سارے گھر کے کپڑے، پردے، چادریں، تکیوں کے غلاف غرض ہر قسم کا کپڑا دھلواتیں، چھت صاف کرواتیں، صفائیاں اور تو اور چھت پر بنے مرغیوں کا ڈربہ تک صاف کرواتیں ساتھ ساتھ اماں ہائے ہائے کرتی جاتیں اور دونوں پھپھوؤں اماں کو تسلیاں بھی دیتی جاتیں اور کام بھی نپٹا دیتیں مگر الوینہ آہستہ آہستہ وہ بھی سمجھ گئیں اور انہوں نے آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی کبھی ہی ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی، میرا خیال ہے یہی کام تم نے بھی پکڑ لیا ہے۔" بات کرتے کرتے فائقہ نے ایک دم جیسے الوینہ کی چوری پکڑ لی۔

"ہیں نا۔" الوینہ ایک دم گڑبڑا گئی۔

"نہیں آپا۔" اسے پچھلے دنوں کے سارے واقعات یاد آنے لگے جب نائلہ اور شکیلہ آپا کچھ دنوں کے لئے رہنے آئی تھیں تو الوینہ نے یہی پٹی باندھ کر ان کا کچھ دن میکے میں رہنا حرام کر دیا تھا۔

"نہیں الوینہ۔" فائقہ نے گردن نفی میں ہلائی۔

"تم یقیناً ایسا ہی کر رہی ہوں گی، کیونکہ اماں نے مجھے بھی یہی سب سبق پڑھایا تھا، مگر میں نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے تھے، کیونکہ میں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ اپنے سسرال میں اپنے کام سے اپنا نام بناؤں گی، میں نے سوچا ہوا تھا کہ کبھی ایسا نہیں کروں گی کہ پیٹھ پیچھے لوگ مجھے الٹے سیدھے القابات سے نوازیں، مگر افسوس ہے مجھے تم پر، کہ تم نے یہ سب کیسے کر دیا؟" تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر بشریٰ لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"ارے بشریٰ اتنا تکلف کیوں کر لیا؟" فائقہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فائقہ آپا، تکلف کیسا؟ اتنے دنوں بعد تو آپ آئی ہیں، آپ بتایئے شوگر کتنی لیں گی۔" بشریٰ نے چائے بنانے کے لئے کپ سیدھے کیے۔

"بس ایک چمچ۔" بشریٰ نے چائے بنا کر فائقہ کو کپ پرچ میں رکھ کر تھمایا۔

"اور بھابھی آپ؟" اس نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں بشریٰ، شکریہ دل نہیں چاہ رہا۔" الوینہ نے بیزار سے لہجے میں جواب دیا، تب ہی احسن بھی اندر چلا آیا، وہ فائقہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

جب سب نے چائے پی لی تو بشریٰ ٹرالی واپس لے جانے لگی۔

"پاپا سیر کرنے چلیں نا۔" ٹیپو اور گڑیا شور مچانے لگے۔

"ہاں ہاں بیٹا چلیں گے ابھی تو خالہ جانی آئی ہیں۔" احسن نے گڑیا کو گود میں اٹھایا تو وہ مچل گئی۔

"نہیں ابھی چلو، ابھی چلو پاپا، اُنہوں۔" ٹیپو بھی احسن کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"اچھا بابا چلتے ہیں، جاؤ بشریٰ آنٹی سے کہو آپ کو تیار کر دیں۔" دونوں بچے فوراً بشریٰ سے جا کر لپٹ گئے، انہوں نے ماں کی طرف دیکھا بھی نہیں، فائقہ نے اس بات کو بہت محسوس کیا، احسن بھی فائقہ سے معذرت کرتا اٹھ گیا۔

"دیکھا الوینہ بی بی۔" فائقہ نے طنز سے کہا اور الوینہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے فائقہ کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے بچے بھی تم سے دور ہوتے جا رہے ہیں، دونوں بچے تمہارے قریب بھی نہیں آئے، وہ سیدھے بشریٰ سے جا کر لپٹ گئے، انہوں نے تمہیں پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی؟" الوینہ کے اندر کہیں دور کچھ ہوا، واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

"تم اپنی نادانی سے اپنا گھربار کہیں......"

"نہیں آپا...... خدانہ کرے کیسی بات کر رہی ہیں۔" الوینہ تڑپ گئی۔

"فائقہ آپا...... آپ بھی چلیں بچوں کے ساتھ۔" تب ہی احسن اندر کمرے میں داخل ہوا۔

"نہیں شکریہ احسن، میں نے اب گھر جانا ہے فخر اور فاروق انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے اپنے بچوں کا بتایا۔

"مجھے تو دراصل کل شکیلہ آپا بازار میں ملیں تو انہوں نے الوینہ کی طبیعت کا بتایا تو میں دیکھنے چلی آئی، اب میں بھی چلتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اسی وقت بشریٰ دونوں بچوں کو تیار کر کے لے آئی، بچے جانے کی خوشی میں خوب اچھل کود کر رہے تھے، احسن اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے بشریٰ تم تیار نہیں ہوئیں۔" احسن نے بشریٰ کے سراپے پر نظر ڈالی۔

"نہیں میں کیا کروں گی جا کر۔" بشریٰ نے ایک چور نظر فائقہ اور الوینہ پر ڈالی۔

"آپ بھابھی کو لے جائیں۔" اس نے کہا، اس سے پہلے کے الوینہ کچھ کہتی احسن بولا۔

"ارے نہیں بھئی، تمہیں پتہ تو ہے الوینہ کی طبیعت خراب ہے۔" فائقہ نے ایک زخمی نظر بہن پر ڈالی اور ہاتھ میں تھامی پنی بیڈ پر ڈال دی۔

"اچھا بھئی، میں چلتی ہوں، الوینہ اپنا خیال رکھنا۔" بچوں کو پیار کرتی ہوئی وہ چلی گئی مگر الوینہ کے لئے سوچ کے کئی در کھول گئی۔

☆☆☆

الوینہ نے ادھر اُدھر دیکھا، بشریٰ تیار ہونے جا چکی تھی، احسن بھی کمرے میں نہیں تھا۔

"تم اپنی نادانی سے کہیں اپنا گھر بار......" اس کے دماغ میں فائقہ کی کہی بات گونجنے لگی۔

"تمہارے بچے بھی تم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔" فائقہ کا کہا، ایک اور جملہ کہیں دور اس کے دماغ میں گونجا۔

"تمہیں پتہ تو ہے الوینہ کی طبیعت خراب ہے۔" احسن کی کہی بات اسے یاد آئی۔

"کہیں آپا سچ تو نہیں کہہ رہیں۔" اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ احسن اور بشریٰ......" اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکی، وہ تڑپ کر بیڈ سے اٹھی اور واش روم میں گھس گئی، بمشکل چند منٹ لگائے اس نے تیار ہونے میں، احسن اور بشریٰ دونوں بچوں کو لے کر نکلنے ہی والے تھے جب وہ گیراج میں پہنچی، اس کی مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا۔

"ارے بہو، تم آرام کرتیں۔" ذوالفقار احمد لان میں بیٹھے تھے، اماں بی بھی وہیں موجود تھیں، اسے اماں بی پر رشک آیا وہ اس عمر میں بھی ابا میاں کے ساتھ ساتھ رہتیں تھیں اور ایک وہ تھی جو نادانی میں اپنا گھر بار کسی اور کے حوالے کرنے چلی تھی۔

"ابا میاں میں اب ٹھیک ہوں۔" اس نے کھڑے کھڑے ہی واپسی کا فیصلہ کیا۔

"نہیں دلہن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تمہیں اتنا درد تھا، بیٹا آرام کر لو۔" اماں بی پیار سے بولیں تھیں، اسے شرمندگی کے احساس نے گھیر لیا، کتنے پر خلوص لوگ ہیں اور ایک وہ تھی کہ۔

"نہیں میری پیاری اماں۔" اس نے اماں بی کے گلے میں باہیں ڈال لیں۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" اماں بی نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"اللہ تیرا شکر ہے، میری بچی کے چہرے پہ رونق آئی۔" انہوں نے جھٹ سو کا نوٹ نکال کر اس کے سر پر سے وار کر الگ کر کے رکھا تا کہ کسی ضرورت مند کو دے سکیں، احسن اور بشریٰ ہکا بکا کھڑے تھے، کہاں ابھی تو الوینہ اندر بیماری کا منہ بولتا نمونہ بنی ہوئی تھی اور اب۔

"چلیں احسن، میں نے سوچا بچوں کے ساتھ میں بھی چلتی ہوں اور تھوڑی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور...... اور......" وہ بشریٰ کی طرف مڑی۔

"بشریٰ بیچاری بھی میری وجہ سے بہت پریشان رہی ہے، ابا میاں ہم بشریٰ کو گھر چھوڑتے آئیں گے۔" وہ سب گاڑی کی طرف چلے۔

"اور ہاں ابا میاں......" الوینہ واپس پلٹی۔

"ہاں بیٹا......" ذوالفقار احمد بولے۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ کافی دنوں سے آپ نے سب کو کھانے پر نہیں بلایا۔"

"ہیں۔" ابا میاں کے ساتھ ساتھ سب حق دق رہ گئے، الوینہ اور وہ بھی خود سے دعوت کا کہہ رہی ہے۔

"میں ذرا بچوں کو گھما لاؤں پھر آ کر آپ کے ساتھ پروگرام سیٹ کرتی ہوں، نائلہ اور شکیلہ آپا کو آئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔"

"ارے ہاں۔" ابا میاں کے ساتھ ساتھ اماں بی بھی بول پڑیں۔

"یہ ٹھیک ہے، میں ثمرہ اور حمیرا کو کہوں گی تمہارا ہاتھ بٹائیں سب مل جل کر کام کریں تو بیٹا اتفاق بھی ہوتا ہے اور گھر پہ اللہ کی رحمت بھی نازل ہوتی ہے۔" احسن گاڑی نکال چکے تھے دونوں بچے اور بشریٰ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

"اب آ جاؤ الوینہ۔" احسن نے آواز دی۔

"ابا میاں۔" وہ چلتے چلتے بولی۔

"ہاں بیٹا۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"ابا میاں میری پھپھو کے بیٹے حمزہ بھائی کو تو آپ نے دیکھا ہے نا۔"

"ہاں ہاں، کیا ہوا حمزہ کو۔" حمزہ، الوینہ کی بڑی پھپھو کا ہونہار اور خوبرو بیٹا تھا۔

"حمزہ بھائی کو کچھ نہیں ہوا ابا میاں۔" وہ ہنسی۔

"میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر آپ کہیں تو اماں سے بات کروں اپنی بشریٰ کے لئے۔" اس نے گاڑی میں بیٹھی بشریٰ کو دیکھا۔

"ہیں بیٹا۔" وہ حیران ہوئے، کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہ آئی کیا کہیں آخر ہوش آیا تو خوشی سے بھرپور آواز میں بولے۔

"ہاں بیٹا، اگر ایسا ہو جائے تو۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"اب آ بھی جاؤ۔" احسن گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"جیتی رہو بیٹا، جیتی رہو۔" ابا میاں نے خوش ہو کر دعا دی، اماں بی کا چہرہ بھی جگمگا اٹھا تھا۔

فائقہ کی باتوں نے اس کا دماغ گھما دیا تھا مگر وہ بلا کی چہرہ شناس تھی، اس نے احسن اور بشریٰ کے چہروں کو پڑھ لیا تھا جب اس نے سیر پر ساتھ جانے کو کہا تھا تو کیسے ایک ناگواری کی لہر دونوں کے چہرے پر آئی تھی اور اب اسے صرف اپنا گھر بچانا تھا، اپنے بچے اپنے بنانے تھے اور اس کے لئے پل کا کام تو ابا میاں اور اماں بی ہی تھے۔

اس دن سیر سے واپسی پر بشریٰ کو اس نے اس کے گھر چھوڑا اور گاڑی نہر پر سے جب گزر رہی تھی تب اس نے مٹھی میں دبی اماں کی پنی پوری قوت سے نہر کے پانیوں کی جانب اچھال دی، اسے اب کسی پنی کی ضرورت نہیں تھی، اس نے گھر بنانے کا گر سیکھ لیا تھا۔

"تھینک یو فائقہ آپا۔" اس نے گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

کنول عمران خان

"ناجیہ یار کبھی کوئی ڈھنگ کا سوٹ ہی پہن لیا کرو، ہر روز تم ماسی ہی بنی رہتی ہو، کبھی کوئی آجاتا ہے، حالت تو دیکھو اپنی۔" میں نے ناجیہ کے بکھرے بال اور ایک رنگ کی شلوار اور دوسرے رنگ کی قمیض کی طرف دیکھ کر بے زاری سے کہا۔

"یار میرے سے نہیں ہوتا، میں گھر کے کام کروں یا خود کو سنواروں۔" ناجیہ نے بے دلی سے کہا۔

"ناجیہ تم کم سے کم کپڑے تو ٹھیک پہن لیا کرو اور بالوں کو کتنے دنوں سے کنگھی نہیں کی؟" میں نے اس کے گھونسلے ہوتے بالوں کو دیکھ کر کہا۔

"کل دھوئے تھے تو ایسے ہی کیچر لگا لیا تھا، چل چھوڑنا مجھے، تو بتا کیا کھائے گی؟" اس نے ہمیشہ کی طرح بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"اپنا حلیہ تو دیکھ تیرے ہاتھوں سے بنا کچھ کھاؤں گی کیا میں؟" میں نے مذاق سے ہنستے ہوئے کہا۔

"چل کمینی۔" اس نے کشن اٹھا کر میری طرف کھینچ کے مارا۔

"چل آ کچھ بناتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ایسے نہیں پہلے تو جا اپنا حلیہ ٹھیک کر پھر آنا کچن میں۔" میں نے اسے اس کے بیڈ روم میں دھکیلا اور خود کچن میں چلی گئی۔

ناجیہ سے میری دوستی صرف ایک سال پرانی تھی، یہ میرے سامنے والے گھر میں تقریباً ایک سال پہلے آئی تھی، ہمارا گھر ایسے علاقے میں تھا جہاں آس پڑوس میں بہت کم گھر تھے اور جو تھے وہ کسی سے زیادہ ملتے تھے، میں سارا دن بور ہو جاتی تھی، مگر جب سامنے والے گھر میں یہ لوگ آئے تو میں دوسرے ہی دن اس کے گھر چلی گئی۔

یہ گھر میرے گھر کے سامنے اور قریب تھا، ناجیہ کے دو بچے تھے احمد اور مہک اس کا میاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا اور پھر پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں میں گاڑھی چھننے لگی، ہم اکثر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے بالکل بے تکلفی والا ماحول تھا، میرا ایک بیٹا تھا میرے شوہر بینک میں منیجر تھے، روپے پیسے کی دونوں گھروں میں کمی نہ تھی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا ہمارے پاس، میں نے اپنے گھر کو بہت اچھے طریقے سے سجایا ہوا تھا جو بھی آتا تعریف کیے بغیر نہ رہتا مگر ناجیہ اس معاملے میں ذرا لاپرواہ تھی، اس کے گھر میں ہر وقت ابتری پھیلی رہتی، بچے بھی بہت شرارتی تھے ہر وقت اچھل کود مچائے رکھتے، وہ خود بھی بولائی بولائی پھرتی رہتی تھی، وہ میری طرف کم ہی آتی تھی، میکے میں اکثر چلی جاتی تھی، اصل میں میرا بیٹا دو سال کا تھا اور اس کے لئے اسکول وغیرہ کا جھنجھٹ نہ تھا، میں صبح جلدی اٹھ جانے کی عادی تھی، سو اپنا کام صبح ہی صبح نپٹا لیتی تھی، پھر میاں جی کو رخصت کرنے کے بعد کھانا تیار کرتی اور سب کام سے فارغ ہو کر ناجیہ کی طرف چلی جاتی تھی، وہاں وہ ایسے ہی بیٹھی ہوئی ہوتی، ٹیبل پر ناشتے کے برتن پڑے ہوتے، صوفوں پر بچوں

کے کپڑے آدھے اوپر آدھے نیچے گرے پڑے ہوتے اور وہ خود سر جھاڑ منہ پہاڑ کبھی ایک طرف جاتی کبھی دوسری طرف، میں اکثر اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

"تو ماسی کیوں نہیں رکھ لیتی۔" میں نے اس کی حالت زار دیکھ کر کہا۔

"ماسی تو میں رکھ لوں مگر آج کل کسی پر اعتبار نہیں اور پھر یہاں اتنی دور ماسی کہاں سے آئے؟ یہاں تو کسی گھر میں ماسی آتے جاتے دیکھی ہی نہیں کہ بندہ اس سے بات کرے، بس یار گزارہ

چل رہا ہے، اب سچ پوچھو تو دل ہی نہیں کرتا کچھ کرنے کو میرا۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

"کیوں جی، عشق ہو گیا ہے کیا؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں سارہ ہم سے کون کرے گا عشق۔" اس کے لہجے میں اداسی صاف جھلک رہی تھی۔

"کیا بات ہے بتاؤ مجھے ہمیں کتنا ٹائم ہو گیا ہے ایک ساتھ مگر تم مجھ سے اپنے دل کی باتیں شیئر نہیں کرتی، تم نے آج تک مجھے غیر ہی سمجھا ہے۔" میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"اور اب میں جا رہی ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گی۔" میں جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں سارہ پلیز ایسا مت کہو، مت جاؤ۔" وہ مجھے روکتے ہوئے بولی۔

"ایک تم ہی تو ہو جسے میں اپنا سمجھتی ہوں، تم بھی نہیں آؤ گی تو میں تو بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔" اس نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا، اسے روتا دیکھ کر میرا دل دکھی ہو گیا، میرا جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا، میں تو اسے ڈرا رہی تھی اور اس کے رونے سے ظاہر ہو گیا کہ کوئی تو بات ہے جو وہ اس قدر اپ سیٹ ہے۔

"او کے ڈیئر میں نہیں جاتی، بس تم روؤ مت اور مجھے سب بتا دو۔" میں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بس سارہ کئی بار سوچا کہ تمہیں بتاؤں مگر پھر یہ سوچتی ہوں کہ اس میں اپنی ہی بدنامی ہو گی، تو چپ ہو جاتی ہوں۔"

"چلو اب بتا دو تاکہ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔" میں نے اسے کہا۔

"سارہ وہ سعد کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ ہے اور یہ سب کافی ٹائم سے چل رہا ہے۔" اس نے نیچی نظروں سے کہا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو یار؟ سعد بھائی نہیں یار مجھے یقین نہیں آ رہا۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔

سعد، ناجیہ کے شوہر بہت ڈیسینٹ اور باوقار تھے اور ان کی شخصیت واقعی ایسی تھی کہ جنس مخالف کو متوجہ کر سکیں۔

"مگر مجھے ایسے لگتے نہیں وہ۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ایسے تو نہ تھے مگر ایسے ہو گئے ہیں پتہ نہیں اس نے کیا جادو کر دیا ہے وہ ان کے آفس میں ہوتی ہے، پہلے تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اب تو میری طرف دیکھتے بھی نہیں، پہلے تو مجھے شک تھا، مگر بس جب شک ہوا تو میں نے نوٹ کرنا شروع کیا اور پھر شک یقین میں بدل گیا، بس تب سے ہی میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا ہے۔" وہ خیالوں میں گم اپنی کہانی سنا رہی تھی۔

"ہم دونوں کی زندگی بہت پرسکون اور خوشگوار تھی، سعد بہت محبت کرتے تھے مجھ سے، میں بھی ان پر جان چھڑکتی تھی اور ان کی خواہش کے مطابق بنی سنوری رہتی تھی، ہم روز گھومنے جاتے اور اکثر ڈنر باہر کرتے تھے، مگر پھر پتہ نہیں کب اور کیسے ندا ان کی زندگی میں آئی اور آتی ہی چلی گئی اور میرا پیار، میری چاہت سب کچھ ان کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا، میں ان میں تبدیلی نمایاں دیکھ رہی تھی وہ مجھ سے اور بچوں سے دور ہوتے جا رہے تھے، گھر سے جانے میں بہت جلدی کرتے اور واپسی پر اکثر لیٹ ہو جاتے، پوچھنے پر کام کی زیادتی کا بہانہ بناتے، میں بھی آخر کب تک چپ رہتی آخر ایک دن بول پڑی۔"

"سعد آپ اتنا لیٹ کیوں آنے لگے

ہیں؟"

"آفس کا کام ہوتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"کام کی زیادتی ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہے۔" میں نے آخر اپنے اندر کے شک کو ظاہر کر ہی دیا۔

"دیکھو ناجیہ میں اس طرح کی جواب طلبی کا عادی نہیں سن لیا، اپنے کام سے کام رکھو تم۔" اس نے غصے سے کہا اور چلا گیا۔

"ارے یہ کیا ہو گیا؟" میں تو اس کا روپ دیکھتی ہی رہ گئی، اتنا روکھا اور سرد انداز تو کبھی نہ دیکھا تھا، مجھے بے اختیار رونا ہی تو آ گیا، اپنی بے عزتی اور بے وقعتی محسوس ہو رہی تھی، بس یہی بات میرے دل گھر کر گئی اور پھر گاہے بگاہے بہت سی تلخیاں ہمارے درمیان آتی گئیں اور پھر وہ دن میں آ گیا جب میرے شک کے تابوت میں یقین کی آخری کیل بھی لگ گئی، ہوا کچھ یوں کہ اس دن حالات بہت خراب تھے، شہر کے باہر مار دھاڑ اور ہنگامے ہو رہے تھے، میں نے فون کر کے پوچھا تو کہا کہ۔

"آفس میں ہی ہوں، حالات ٹھیک نہیں جب ٹھیک ہو گئے تو آ جاؤں گا، اگر زیادہ حالات خراب ہوئے تو وہیں آفس میں سو جاؤں گا تم فکر نہ کرو۔" مجھے کچھ تسلی ہوئی، بچوں کو سلا کر میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی، پھر بار بار فون کرنے لگی تو فون آف ملا تھا، مجھے لگا آفس میں ہی سو گئے ہوں گے، سو میں نے دل میں ان کی خیریت کی دعائیں مانگیں اور پھر سو گئی، میرے دل میں اس وقت شک کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، پھر صبح ہوتے ہی میں نے فون کیا تو کسی لڑکی نے فون اٹھایا، وہ نیند کے خمار آلود لہجے میں بولی۔

"کون؟"

"سعد کہاں ہیں؟ اور آپ کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ندا ہوں ان کی آفس کولیگ اور سعد میرے گھر پر ہیں سو رہے ہیں، آپ کون ہیں؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا؟" میں غصے سے کانپ رہی تھی۔

"میں وائف ہوں اس کی، سعد کو دو فون۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس نے یہ کہہ فون بند کر دیا۔

"سعد سو رہے ہیں۔"

میرا تو برا حال تھا، میں اس آدمی کے لئے ساری رات پریشان رہی اور یہ مجھ سے جھوٹ بول کر وہاں عیاشیاں کر رہا تھا، مجھے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

"سعد آج تم نے یہ کام بھی کر دیکھایا؟ آخر مجھ میں کیا کمی تھی جو تمہیں باہر منہ مارنے کی ضرورت پڑ گئی۔"

دوپہر میں جب وہ آیا تو مجھ سے نظریں چرا رہا تھا، ظاہر ہے اسے سب پتہ چل گیا ہو گا، جب میں چپ رہی تو وہ خود ہی بولا۔

"دیکھو ناجیہ، ندا مجھے پسند ہے میں گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں، میں تمہیں صاف صاف بتا رہا ہوں میں نہ اسے چھوڑوں گا نہ تمہیں۔" وہ بہت سکون سے یہ سب کہہ رہا تھا، وہ کہتا گیا میں سنتی گئی، جیسے جیسے وہ بولتا گیا میرے اندر اس کے لئے موجود پیار محبت احساسات، جذبات سب ختم ہوتے چلے گئے، جب اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا تو میں کیا کہتی۔

"تم بھی اپنی مرضی کی مالک ہو، تم کو یہاں رہنا ہے تو رہو جانا ہے تو جاؤ میں تم کو نہیں روکوں گا۔" اس نے یہ کہہ کر گویا مجھ پر احسان کیا تھا اور چلا گیا اور میں بس دیکھتی ہی رہ گئی، کہاں جاتی

میں؟ میری خاموشی سے سعد کو کھلی چھوٹ مل گئی، اب ہم ایک ہی چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔

"ہوں تو یہ بات ہے اچھا اب تم دیکھنا کہ میں کیا کرتی ہوں۔" سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گی تم؟ چھوڑ دو انہیں وہ نہیں سمجھیں گے۔" ناجیہ نے کہا۔

"ندا کا جادو ان کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

"تم مجھے چھوڑ دو۔" سارا بولی۔

"اگر یہ عورت مرد کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے تو مرد سمجھتا ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا تیس مار خان ہے اور اگر عورت اسے اگنور کرنا شروع کر دے تو وہ دم ہلاتے اس کے پیچھے آتا ہے۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" ناجیہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

"تم تو سدا کی بدھو رہنا میری بے وقوف دوست، اس نے اپنا ہرجائی پن دکھایا تو تم بھی چپ کر کے بیٹھ گئی، تم ڈٹ جاتی، مرتی یا مار دیتی، مگر خیر چھوڑو، اب ہم دوسری چال چلتے ہیں۔" سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گی؟ کیسی چال۔" ناجیہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا چکر چلاؤں گی، مطلب افیئر۔"

"کیا پاگل تو نہیں ہو گئی تم۔" ناجیہ نے یقیناً چلاتے ہوئے کہا۔

"ارے گھونچو، سنو تو تم سعد پر ایسا ظاہر کرنا کہ کوئی ہے جو تمہیں چاہتا ہے تمہاری زندگی میں کوئی داخل ہو گیا ہے اور تم اس کے ساتھ بہت خوش ہو اور ایسے ایسے اشارے دینا کہ وہ یہ سب سچ ماننے لگے، جب اسے یہ پتہ چلے گا تو پھر تماشا دیکھنا، کیونکہ وہ کچھ بھی کرے تم کچھ نہیں کہتی وہ تو آزاد ہے، اس نے تمہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے، اب باری تمہاری ہے اگنور کرنے کی، تم اسے مکمل طور پر اگنور کرو، پھر دیکھو۔"

"مگر میں کس سے چلاؤں افیئر؟" ناجیہ نے گھبرا کر سارہ سے پوچھا۔

تو پھر میں اسے سب سمجھانے لگی اور اس کے ہونٹوں پر ہنسی پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆

اس دن سعد گھر آیا تو گھر کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی، ہر چیز اپنی جگہ پر تھی، بچے بھی معمول سے ہٹ کر خاموش تھے اور وہ سب سے زیادہ جھٹکا اسے ناجیہ کو دیکھ کر لگا، وہ معمول سے ہٹ کر لگ رہی تھی۔

آج اس نے بہت پیارا سوٹ پہنا ہوا تھا، ہلکے میک اپ میں تھی اور بالوں کو کندھوں پر کھلا چھوڑ ہوا تھا، پہلی نظر میں تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"آج آپ جلدی آ گئے۔" ناجیہ نے سوال پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

"ہاں...... ہاں وہ آج کام اتنا نہ تھا۔" وہ نظریں چرا کر کمرے میں چلا گیا، ناجیہ نے اس کا چونکنا دیکھ لیا تھا اور وہ مسکرا کر رہ گئی، بس پھر تو ناجیہ نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا، وہ سعد کے سامنے فون پر کسی سے بات کرنے کی ایکٹنگ کرتی، وہ اگر اس کی طرف دیکھتا تو چونک کر "میں پھر بعد میں بات کروں گی" کہہ کر فون بند کر دیتی، گھر کے کام کاج کے دوران مسکراتے رہنا، گنگنانا اور خود بھی ہر وقت بنی سنوری رہنا، سعد یہ سب دیکھتا رہتا تھا، تو اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔

ایک دن بعد گھر آیا تو ناجیہ گھر پر نہ تھی، وہ

سخت تشویش میں تھا کہ وہ کہاں گئی ہو گی اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر لاکھ اختلاف سہی مگر وہ اسے ہر جگہ بتا کر جاتی تھی اور میں منع بھی نہیں کرتا تھا، مگر آج کیا ہو گیا؟ ایسی بھی کیا پریشانی ہے؟ وہ انہیں سوچوں میں گم تھا کہ خیال آیا کہ بچوں سے پوچھے، یہ خیال آتے ہی وہ فوراً اوپر بچوں کے کمرے کی طرف بھاگا۔

"بیٹا ماما کچھ بتا کر گئی ہے کہ کہاں جا رہی ہیں؟"

"نہیں پاپا، بس کوئی فون آیا تھا تو ماما تیار ہو کر چلی گئی، کہہ رہی تھی آ جاؤں گی۔" حمزہ نے لاپروائی سے جواب دیا اور اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سعد کا دماغ پک رہا تھا، یہ سب کیا ہو رہا ہے، وہ سوچتا ہوا نیچے کی طرف آ رہا تھا کہ ناجیہ بے خیالی میں گھر میں داخل ہوئی تھی، آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی اور کافی خوش نظر آ رہی تھی، سعد پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کہاں گئی تھی تم اتنا تیار ہو کر۔" سعد نے غصے سے اس پر سر سے پاؤں تک نظر ڈال کر پوچھا۔

ناجیہ اس سب کے لئے پہلے سے تیار رہی تھی۔

"میں اپنی دوست سے ملنے گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"یہ کون سی دوست ہے یا کون سا دوست ہے جس سے تم اس وقت ملنے گئی۔" اس کے لہجے میں شک ہی شک تھا۔

"جو تم سمجھ لو اور پلیز سعد میں بہت تھک گئی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور سعد کے چہرے پر اس وقت سخت پریشانی کے تاثرات تھے جو ناجیہ کے دل میں مسرتوں کے در وا کرتے چلے گئے، وہ سیدھا اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔

"سعد احمد میں بھی اسی طرح پریشانی ہوتی تھی مگر تمہیں کہاں پروا تھی، کیونکہ تم مرد ہو تم کچھ بھی کر سکتے ہو، آج تمہیں ہو رہا ہے کہ میں کہاں جا رہی ہوں کس سے مل رہی ہوں؟ کیوں جب میں تم سے سوال کرتی تھی تب تو تم مجھے دیکھتے بھی نہیں تھے پھر آج کیوں مجھے دیکھا؟ کیوں مجھ سے سوال کیے؟ تمہاری پریشانی تمہارا شک یہ سب مجھے مضبوط بنا رہا ہے، میں اپنا آپ منوا کر رہوں گی سعد احمد، میں اپنا گھر برباد نہیں ہونے دوں گی، کبھی نہیں۔"

دوسری طرف سعد بھی کروٹیں بدل رہا تھا، وہ ناجیہ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں سے بات شروع کرے، کیونکہ چور اس کے دل میں بھی تھا، کہیں ناجیہ کسی اور میں تو...... نہیں یہ نہیں ہو سکتا، وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔

صبح اس نے سارہ کو فون پر تمام حالات سے آگاہ کیا۔

"ہاہاہا دیکھا میری جان میں نہ کہتی تھی، مرد خود باہر جتنا بھی اِدھر اُدھر منہ مارے مگر یہ کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی اسے نظر انداز کرے، بس تم دیکھو اب آگے کیا ہوتا ہے؟" سارہ نے کہا۔

اُدھر سعد کی بے چینی میں ہر گزرے دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کی وجہ سے اس کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا ندا بھی، پریشانی نوٹ کرتی تھی۔

"آج کل بہت پریشان پریشان لگ رہے ہو۔" ندا نے آخر ایک دن پوچھ ہی لیا۔

"کچھ نہیں بس ذرا کام کی پریشانی ہے۔" سعد نے ٹالنے والے انداز میں کہا، کیونکہ سچ میں

اپنی بے عزتی تھی۔

"چلو آج باہر لنچ کرتے ہیں، میرا بھی دل نہیں ہے کام کرنے کو تھکاوٹ ہو رہی ہے، وہاں سے گھر چلے جائیں گے۔" ندا نے اپنا منصوبہ بتایا۔

"نہیں آج نہیں، پھر کبھی۔" وہ کہہ کر اٹھا اور باہر نکل گیا، ندا اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کچھ تو ہے ورنہ تم اس طرح مجھے کبھی انکار نہیں کرتے۔" ندا نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"پاپا ہمیں کہیں گھمانے لے جائیں، ہم کتنے دنوں سے باہر نہیں گئے۔" دونوں بچے آج باہر جانے کی ضد کرنے لگے، تو اسے ماننے ہی پڑی۔

"او کے بیٹا آپ تیار ہو جاؤ پھر ڈنر بھی کر کے ہی آئیں گے۔"

"Hurry۔" دونوں بچوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا اور تیار ہونے چلے گئے، سعد کا موڈ نہیں تھا مگر وہ بچوں کی وجہ سے راضی ہو گیا، سوچا کہ میں بھی فریش ہو جاؤں گا پہلے یہ لوگ سی ویو گئے، وہاں بچے بہت خوش تھے، گھڑ سواری، اونٹ کی سواری اور بائیک پر سوار بہت خوش تھے، سعد بھی بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو گیا، ناجیہ بھی ساتھ تھی مگر وہ بار بار میسج پر لگی ہوئی تھی، اس کی یہ حالت سعد کی نظروں سے اوجھل نہ تھی۔

وہ جز بز ہو رہا تھا مگر پبلک پلیس پر تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا، اس لئے خاموش رہا، میسج پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر آنے والی رونق کو دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا، کہ کوئی تو ہے، خیر جیسے تیسے ڈنر کیا اور گھر واپس آئے، اس رات بھی طرح طرح کی سوچوں نے سعد کو سونے نہیں دیا، اس نے ناجیہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے کا سکون اس کی نیند اڑا رہا تھا، وہ سوچتا گیا، اس وقت اسے لگا کہ کسی کی آواز آ رہی ہے۔

"تمہاری بیوی نے کب تم سے بے وفائی کی؟ کب تمہاری کسی بات سے پیچھے ہٹی؟ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی، اس کی چاہت، محبت کو ٹھکرا دیا، یہاں تک کہ تم نے تو اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا اور اب اگر وہ کسی بھی وجہ سے خوش ہے تو تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ جان چھوٹی کیونکہ تم عنقریب ندا سے شادی کرنے والے ہو، مگر یہ کیا؟ کیوں میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا ہے؟ کیوں دل ناجیہ کی طرف کھنچتا ہے مجھے؟" وہ یہ سب سوچتا سوچتا نجانے کب سو گیا۔

☆☆☆

"کیوں نہیں آؤ گی؟ تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا، فون پر یہ آواز سعد نے سن لی وہ کچن میں آ رہا تھا، وہ ایکدم سے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور سب سننے لگا۔

"یار کیا کروں میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے تم نے مجھ پر کہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔" ناجیہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا، پھر دوسری طرف سے ملنے کی جگہ کا تعین کیا گیا۔

"او کے اسی جگہ نا جہاں ہم پچھلے ہفتے ملے تھے؟" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں آ جاؤں گی، اچھا خدا حافظ۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا، سعد کا یہ سب سن کر خون کھول رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ناجیہ کا گلا دبا دے، مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا

تھا، اس لئے یہ بہت ضبط کر کے آفس کے لئے نکل پڑا۔

راستے بھر وہ یہ سوچتا آیا کہ آج یہ قصہ ختم کر دوں گا، یا آر یا پار، ایک فیصلہ کرنا ہو گا ناجیہ کو، میں مزید اس آگ میں نہیں جل سکتا، وہ آفس میں بھی سارا وقت گھڑی دیکھتا رہا، اس کی بے چینی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔

"کیا بات ہے ڈیئر، تم بتاتے کیوں نہیں، کیا جھگڑا ہوا ہے ناجیہ سے۔" ندا نے پوچھا۔

"چھوڑ دو مجھے اکیلا، چلی جاؤں یہاں سے۔" وہ ایکدم غصے سے دھاڑا۔

"تم مجھ پر چلائے۔" ندا کو بھی غصہ آ گیا۔

"ہاں اور تم کان کھول کر سن لو کہ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے، گیٹ آؤٹ۔" وہ غصے سے بولا۔

"وہاٹ؟ تم نے مجھے گیٹ آؤٹ کہا؟" ندا غصہ سے کانپ رہی تھی۔

"ہاں تمہیں ہی کہا ہے، چلی جاؤ اکیلا چھوڑ دو مجھے۔" وہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

سعد کرسی پر گر سا گیا، اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا، اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا، اس وقت تین بجے تھے۔

وہ فوراً آفس سے باہر آیا گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل پڑا، وہ بہت رف ڈرائیو کر رہا تھا، کئی بار اس کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا، گھر کے پاس پہنچ کر اس نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں سے کسی کی اس پر نظر نہ پڑ سکے، وہ ناجیہ کا پیچھا کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ جاتی کہاں ہے اور کس سے ملتی ہے آج یہ سب جاننا چاہتا تھا، وہ گاڑی میں ہی بیٹھا اس کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا یہ ٹائم ہی نہیں گزر رہا تھا، مگر پھر ایکدم سے اسے ناجیہ کا چہرہ نظر آ گیا، وہ سیٹ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا، ناجیہ آج بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی، لائیٹ پنک ساڑھی میں بہت فریش لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا، وہ سبک رفتاری سے چلتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی، پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو سعد نے بھی اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک محتاط فاصلے پر گاڑی رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا، آخر پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی سی ویو کے قریب ایک ریسٹورنٹ کے باہر رک گئی، سعد نے بھی ایک طرف کر کے گاڑی پارک کی اور دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر اندر داخل ہو گئے، ناجیہ ایک ٹیبل کی طرف بڑھی، سعد بھی ایک ایسی ٹیبل پر بیٹھ گیا جہاں اسے وہ ناجیہ کی ٹیبل پر نظر رکھ سکے اور ان کی گفتگو سن سکے، اس نے اپنے لئے چائے کا آرڈر دیا گو اس کا کچھ کھانے پینے کو دل نہ تھا مگر وہ ایسے تو بیٹھ نہیں سکتا تھا اک اک پل اس پر بھاری گزر رہا تھا اس کی نظریں جیسے ناجیہ پر چپک ہی گئی تھیں، وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"اب آ بھی جاؤ میں کب تک ویٹ کروں۔" اس کے لہجے میں مصنوعی ناراضگی تھی۔

"او کے۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور انٹرلیس کی طرف دیکھنے لگی، سعد کی نظریں بھی گیٹ پر جا رکی، اس کا غصہ عروج پر تھا، وہ بہت ضبط کیے بیٹھا تھا کہ اچانک گیٹ پر سارہ نمودار ہوئی، پچھلے پندرہ دن سے وہ اپنی والدہ کے ہاں رہنے گئی ہوئی تھی، وہ اندر آ کر پہلے اردگرد کا جائزہ لینے لگی اور پھر ناجیہ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی وہ دونوں بہت گرم جوشی سے ملیں۔

"یار تو بھی نا، اب بس کر۔" ناجیہ نے سارہ سے کہا۔

"کیا بس کروں۔" سارہ بولی۔

"یار سعد بہت پریشان رہنے لگا ہے، کہیں کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے، ایک یہی تو خرابی ہے تمہارے اندر دل بڑا نازک ہے تیرا۔" سارہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"ہاں یار، کیونکہ میں واقعی اس سے محبت کرتی ہوں اور اس نے جو بھی میرے ساتھ کیا مگر میں نے بھی تو اسے اتنے دن سے تنگ کر رکھا ہے کہ وہ میری وجہ سے بہت پریشان ہے، بس میں اسے مزید پریشان نہیں کر سکتی۔" ناجیہ بولی۔

سعد یہ سب سن رہا تھا اور وہ سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا، وہ اٹھا اور ان کی ٹیبل کی طرف بڑھا، سعد کو دیکھتے ہی دونوں کھڑی ہو گئیں۔

"آپ یہاں۔" ناجیہ کے منہ سے نکلا۔

"جی میں یہاں اور یہ ہے تمہارا نیا دوست۔" سعد نے سارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سعد میں نے یہ سب اپنا گھر بچانے کے لئے کیا۔" ناجیہ گھبرا کر ایکدم بول پڑی۔

"سعد بھائی۔" سارہ نے ناجیہ کو اشارے سے چپ رہنے کو کہا اور بولی۔

"سعد بھائی آپ کو ٹھیک راستے پر لانے کے لئے یہ سب میرا آئیڈیا تھا، کیونکہ آپ کی بے وفائی کی وجہ سے ناجیہ نے خود کو بالکل فراموش کر دیا تھا، اگر میں یہ سب نہ کرتی تو ایک دن آپ کا گھر تباہ ہو جاتا، سعد بھائی عورت اپنے گھر اور سہاگ کی سلامتی کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے جیسے کہ ناجیہ نے کیا، اس نے اپنی نیچر سے ہٹ کر ایک ڈرامہ کیا صرف اور صرف آپ کے لئے، آپ کا پیار پانے کے لئے، تو اس میں کیا غلط ہے، عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے شوہر کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی، بس سعد بھائی مجھے اور کچھ نہیں کہنا میں جا رہی ہوں ناجیہ اللہ تمہارا سہاگ سلامت رکھے۔" وہ یہ کہتے ہوئی چلی گئی۔

"رکیں سارہ۔" سعد نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"تھینک یو سارہ، تم نے میری آنکھیں کھول دی، میں اپنی جنت کو باہر تلاش کرنے نکلا تھا، مگر وہ تو میرے گھر میں ہی تھی، تھینک یو وری مچ۔" سعد نے تشکر بھری نظروں سے سارہ کو دیکھا، وہ مسکرائی اور چلی گئی۔

"سوری ناجیہ میں بھٹک گیا تھا، مجھے معاف کر دو۔" سعد نے ناجیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

ناجیہ کے لئے یہی بہت تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، وہ سعد کا ہاتھ تھام کر مسکرانے لگی اور پھر دونوں ایک ساتھ باہر نکل پڑے، اپنی خوشیوں کی منزل کی طرف جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ان کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

کتاب نگر

رسیدی ٹکٹ

مصنف: امرتا پریتم

تبصرہ: سیمیں کرن

عمومی طور پر ضخیم خودنوشت یا سوانح عمری کے برعکس امرتا پریتم کی خودنوشت بظاہر "رسیدی ٹکٹ" ہی معلوم ہوتی ہے مگر جو پڑھنے بیٹھو تو اک اک جملے میں احساس کی وہ گہرائی و شدت ہے کہ لکھنے بیٹھو تو شاید اک الگ کتاب مرتب ہو جائے، یہ خودنوشت پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ بہادر دلیر اور بظاہر بے باک مصنفہ احساس کی کس شدت و گہرائی کی مالک تھی اور کیسے نرم و نازک دل کی مالک۔

"رسیدی ٹکٹ" عنوان کی وہ خود وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں، "اک دن خوشونت سنگھ نے دوران گفتگو کہا۔

"تمہاری سوانح کا کیا ہے، بس اک حادثہ، لکھنے بیٹھو تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے۔"

"رسیدی ٹکٹ شاید اس لئے کہا کہ باقی ٹکٹوں کا سائز بدلتا رہتا ہے لیکن رسیدی ٹکٹ کا وہی چھوٹا سا رہتا ہے۔"

امرتا پریتم کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں بلکہ امرتا کا نام لیں تو چھم سے ساحر لدھیانوی کا نام دریچہ ذہن پہ یوں چمکنے لگتا ہے جسے لازم و ملزوم ہوں دونوں اک دوجے کے لئے، مرحوم اظہر جاوید مدیر "تخلیق" نے سچ ہی تو لکھا تھا۔

"رسیدی ٹکٹ" اس عہد کی بوطیقا ہے، چاہت کی دستاویز ہے اور اپنے رومانی و روحانی وسیلے سے اہل دل کی دھڑکنوں میں بسی رہے گی،

لکھنے والے مر جاتے ہیں، مگر تحریریں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تابندہ و درخشندہ رہتی ہیں۔

امرتا نے کہا تھا، "میں تڑ نے گھڑے دا پانی تے کل تیک نہیں رہنا۔

ساحر نے کہا۔

کل اور آ جائیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے، تم سے بہتر سننے والے
لیکن امرتا اور ساحر، ساحر اور امرتا، کبھی کبھی فراموش نہیں ہوں گے، "رسیدی ٹکٹ" الفت کے نصاب کا روشن حصہ بنی رہے گی۔

اس خودنوشت میں ان کی زندگی کے وہی گوشے نظر آئیں گے جو امرتا کے خیال میں سامنے لانے ضروری تھے، یہ خودنوشت گویا یادوں کی برات ہے، اک تسبیح کے دانوں کی صورت گرتی یادیں نہیں، کہیں وہ دکھ ہیں وہ احساس جو لمحوں نے دل کی گود میں ڈالے اور کہیں وہ کامیابیاں، اک خالص سچی بہادر عورت بھی نظر آئے گی، مردانہ سماج میں، جسے اپنے خاص ہونے کا احساس ہے اور کتاب میں بہت سی تفصیل اپنے مختلف ممالک کے دوروں کے علاوہ اپنے کام کی تفصیل اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم کے بارے ہے، امرتا کہتی ہیں۔

"میرے اپنے ملک میں بھی دوسری زبان والوں نے مجھے بڑی عزت دی ہے، اردو والوں نے میری قریب پندرہ کتابیں اردو میں شائع کی ہیں، دو گجراتی، دو ملیالم، دو مراٹھی والوں نے اور ہندی والوں نے تو سب شائع کی ہیں بلکہ

اقتصادی آزادی مجھے ہندی زبان سے ہی حاصل ہوئی ہے۔"

نظم، ناول نگاری، افسانہ نویسی سب میدانوں میں امرتا نے اپنے ہنر کو آزمایا اور اپنا لوہا منوایا۔

اس خودنوشت کا طرز تحریر عام ڈگر سے کچھ ہٹ کر ہے کتاب کے آغاز میں 1918ء کی سرخی کے نیچے لکھا ہے۔

"یہ 1918ء کی لحد سے نکلا، ایک لمحہ ہے، میرے وجود سے بھی اک سال پہلے کا۔"

اسی باب میں اپنے والدین کے متعلق، ان کے بیاہ کے متعلق امرتا کی شخصیت پر اپنے باپ کے نقوش بہت گہرے ہیں، ان کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں اک خاص آدمی تھے۔

"آج نصف صدی بعد سوچتی ہوں، فقیری اور امیری، دونوں بیک وقت میرے مزاج میں ہیں اور یہ مزاج اپنے نقوش کی مانند مجھے والد سے ملا ہے، شاید ان کی نظر بھی میری نظر میں شامل ہے، کبھی یہی پتہ نہیں چلتا کہ میں اپنی نظروں میں منظور ہوں کہ نہیں، شاید اسی لئے ساری عمر لکھتی رہی کہ میری نظروں میں جو کچھ میرا ان چاہا ہے وہ سارا میرا چاہا بن جائے، جیسے اس وقت بھی دنیا کو نہیں سوچتی تھی صرف سوچتی تھی کہ میرے والد مجھ سے خوش ہوں، آج بھی دنیا کی فکر نہیں کرتی، فکر کرتی ہوں صرف یہ کہ میرا اپنا آپ مجھ سے خوش ہو، والد کے روبرو کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، اپنے آپ سے بھی نہیں بول سکتی۔"

امرتا کے والد بھی نظم کہتے تھے، ان کا تخلص پیوکھ تھا اور بقول امرتا۔

"انہوں نے پیوکھ لفظ کو پنجابی میں الٹا کر میرا نام امرت رکھ دیا اور اپنا تخلص ہمکاری، حرف کی عزت کرنا باپ نے یوں سکھائی کہ کسی کتاب کا ورق زمیں پر پڑا ہوتا ادب سے اٹھا لیتے اور بھولے سے بھی پاؤں آنے پر خفا ہوتے یوں حرف اور حرف لکھنے والے ہاتھوں سے ادب کا رشتہ اوائل عمر سے ہی جڑ گیا، لیکن وہ کہتی ہیں۔"

"لیکن اپنے ہمعصروں سے جتنے اداس تجربے ہوئے ہیں حیران ہوں حرفوں اور قلموں کے ادب کا آبیثی درخت جڑوں سے کیوں نہیں سوکھ گیا۔"

اسی طرح امرتا جب اپنے ساتھ اپنے خیال کے ساتھ جڑے اک سایہ کا ذکر کرتی ہیں تو لکھتی ہیں۔

"میرے لئے غیر جسمی کچھ نہیں، چھوٹی عمر میں جب گورو ہر گو بند جی یا گورو گوبند سنگھ کا خواب آتا تھا، میں ان کے گھوڑے کو، باز کو، یا گلے میں پڑی تلوار کو ہمیشہ ہاتھ سے چھو کر دیکھتی تھی۔"

تو دل میں اک خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ کیا خدا کی حسی معرفت کی تمنا کیا ہر سپر نارمل دل میں جنم لیتی ہے۔

31 جولائی 1930ء کی سرخی تلے اپنی والدہ کو کھوتے کے سانحے کا ذکر اور دل میں وہ غم و غیض کا لاوا پھٹ پڑتا کہ "خدا کسی کی نہیں سنتا بچوں کی بھی نہیں۔" اور پھر والد کا زبردستی پوجا پاٹ کی طرف بٹھانا و بلانا۔

"بظاہر جب جسمانی طور پر میری کم سنی ان کے حق والدیت سے ٹکر نہ لے سکتی میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی، آنکھیں بھی موند لیتی لیکن اپنی شکست کو اپنے دل کا عقب بنا لیتی، اب اگر آنکھیں میچ کر میں خدا کو یاد نہ کروں تو وہ میرا کیا کر لیں گے۔"

ان دنوں میں دیکھے گے اپنے خوابوں کو

امرتا بیان کرتی ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ خواب نہ صرف امرتا کے خیال کی وسعت و طاقت کے غماز ہیں بلکہ فرار کی شدید خواہش بھی پنہتی نظر آتی ہے اور لاشعور طور پر اپنے قدو قامت وسوچ پرواز کی عظمت کا احساس ہے۔

"میرا سولہواں سال" بھی اک سرخی ہے اس خودنوشت کی، اک ایسی سرخی جو تا حیات توانائی کے سرچشمے کی طرح امرتا کے ساتھ رہی اور کار تخلیق کا کارن بنتی رہی، "عمر کا سولہواں سال جب جانا پہچانا سب تن کے کپڑوں کی طرح تنگ ہو جاتا ہے۔" امرتا کہتی ہیں۔

"(خدا کی ذات کی طرح ہر صورت میں) حسین تصور ایک محبوب کے چہرے کا ہو یا زمین کے چہرے کا، اس میں فرق نہیں، یہ دل کے سولہویں سال کے ساتھ دل کے تصور کا رشتہ ہے اور میرا یہ رشتہ ابھی قائم ہے) اب بھی اردگرد کا سب کچھ تن کے کپڑوں کی مانند روح کو تنگ لگتا ہے، ہونٹ زندگی کی پیاس سے خشک ہو جاتے ہیں، عرش کے ستاروں کو ہاتھ سے چھونے کا دل چاہتا ہے اور کوئی بے انصاف چاہے دنیا میں کسی کے ساتھ اور کہیں بھی واقع ہو، اس کے خلاف میرے گلے اور چھاتی پر وکس ملی تھی، کتنی دیر ملتی رہی تھی اور لگا تھا، یوں پاؤں کے بل کھڑی میں پوروں سے انگلیوں سے اور ہتھیلی کے ساتھ اس کی چھاتی کو ملتی ہوئی ساری عمر بتا سکتی ہوں، میرے بیچ کی خالص عورت کو اس پل کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اور تیسری بار، یہ خالص عورت، میں نے اس وقت دیکھی تھی، جب اپنے اسٹوڈیو میں امروز نے اپنا پتلا سا برش اپنے کاغذ سے اٹھا کر سرخ رنگ میں ڈبو یا تھا اور پھر اٹھ کر اس نے اس برش کے ساتھ میری پیشانی پر اک بندیا لگا دی تھی۔"

ساحر کو چاہا اور اپنے ناول وشاعری میں سمو دیا بے باکی وسچائی سے اس تعلق کو مانا، خود لکھا کہ ساحر کو کچھ "اشو" ناول "اک سی انیتا" میں اور پھر "دلی دیاں گلیاں" میں کئی نظموں میں، سنہرے سب سے طویل نظم اور پھر جدائی در آنے پر امروز کو اپنایا تو دل کی سچائی سے پہلے شوہر کو چھوڑا تو اس خودنوشت میں "اک قرض" سمجھ کر اتارنے کی کوشش کی جنہوں نے چاہا ان کو بھی لکھا اور جنہوں نے گندی گالیوں سے نوازا وہ بھی لکھ دیا، اک بے باکانہ سچائی "آئینہ گری نظر آئے گی آپ کو امرتا کے ہاں قلم کا حق آخری بوند تک ادا کرنے کی ہمت، امروز کو بھی اس کا کریڈٹ جاتا ہے اور امرتا نے خراج تحسین ان الفاظ میں دیا۔

"اور امروز کو معلوم ہے، میں نے ساحر سے محبت کی تھی، یہ معلوم ہونا اپنے آپ میں اہم بات نہیں ہے، اس سے پرے، جو کچھ بہت اہم اور بڑا ہے، وہ امروز کا میری ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ لینا ہے۔"

یہ سچائی کا علم تمام عمر امرتا نے تھامے رکھا۔

"تین چار سال، پیشتر جب ویت نام کے صدر ہوچی منہہ دہلی آتے تھے تو ایک ملاقات میں انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دے کر کہا تھا۔

"ہم دونوں دنیا کی غلط قوتوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں، میں تلوار کے ساتھ، تم قلم کے ساتھ۔"

محبتوں، نفرتوں، دکھ درد، احساس کی تمام شدتوں، آنسوؤں، سانسوں میں آگ سلگ پڑتی ہے۔"

"خاموشی کا دائرہ" اور "نفرت کا اک دائرہ" اک لکھاری جو اک خوبرو عورت ہے ذہین

ہے اک ایسی کشش کی حامل جو ہمعصروں کو اپنی جانب کھینچتی ہے، یہ تلخ وشیریں تجربات بھی امرتا نے لفظوں میں محفوظ کر دیے ہیں۔

اس خود نوشت میں آپ کو امرتا پریتم بطور اک لکھاری کے ہی نہیں ملیں گی بلکہ اپنے اندر کی ''خالص عورت'' سے بھی وہ ملواتی ہیں۔

یہ خالص عورت اپنے لاشعور میں اپنے مرد کے تراشے ہیولے کو لئے پھرتی تھی اور آج جب وہ ساحر کی شکل میں سامنے آیا تو۔

''میں نے جب اس کو اول مرتبہ دیکھا، تو مجھ سے بھی پہلے میرے دل نے اس کو پہچان لیا، اس وقت میری عمر اٹھائیس برس کی تھی۔''

امرتا کی پہلی شادی سولہ سترہ برس کی عمر میں ہوئی تھی لیکن اک سایہ اک تصور ان کے ساتھ ہمیشہ رہا اور ساحر کی شکل میں منتقل ہو گیا لیکن وہ خود کہتی ہیں کہ ان کے اندر کی عورت ہمیشہ ثانوی درجے پر رہی اور ادیب کا روپ نمایاں رہا مگر۔

''تاہم زندگی میں تین مواقع ایسے آئے تھے، میں نے اپنے بیچ کو خالص عورت کو جی بھر کر دیکھا تھا، اس کا روپ اتنا بھرپور تھا کہ میرے اندر کے ادیب کا وجود میری یاد سے محو ہو گیا تھا۔''

پہلا وقت وہ تھا جب امرتا پچیس برس کی ہونے کے باوجود ماں نہیں بنی تھی اور خوابوں میں پودوں میں اگے پھولوں میں بچے کے اگتے چہرے دیکھتی تھی۔

دوسری بار جب بیمار ساحر کو دیکھا ''ساحر آیا تو اس کا ہلکا سا بخار تھا، اس کے گلے میں درد تھا، سانس کھنچا کھنچا سا تھا، اس روز اس کے دوستوں دشمنوں، پنجابی پریس کی عداوتوں کا ذکر کھلے دل سے کیا ہے۔

اس کتاب میں ان کے بظاہر بہت مضبوط نظر آتے عکس کے اک نرم و نازک احساس کی شدت و اک فلاسفرانہ سوچ کا عکس جھلکتا ہے۔

میری دوست کے عنوان کے تحت لکھتی ہیں۔

سینتیس سال لمبی اک تسلی ہے جس کا نام اوتار ہے، یہی دوست ہے جو آج بھی میرے منہ سے ساحر کی بیماری کا حال سن کر بمبئی گئی تو اس ہسپتال تک بھی پہنچ گئی، جہاں ساحر تھا، جا کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی، اس کی پیشانی چومی اور رو کر اس کا حال دریافت کرتی رہی میرے پاس آئی تو کہنے لگی۔

''گئی تھی اس کے سینے پر سر رکھا تو محسوس ہوا، یہ میں نہیں، تو ہے تیری جگہ گئی تھی، تو بن کر۔'' یہ دوستی کی کیسی بلندیاں ہیں بھی کبھی میری آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں۔''

''جنگ جاری ہے'' آخری عنوان کے تحت پنجابی پریس کی ذمہ داری کا گلہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ کردار یا تو مخاصمانہ رہا یا خاموش۔

لیکن یہ اعتراض بھی ہے کہ اس خود نوشت نے انہیں بہت محبت کرنے والے قاری دیے۔

امرتا پریتم کے ادبی مقام سے کسی کو انکار نہیں مگر ''رسیدی ٹکٹ'' جیسی خود نوشت لکھ کر ادیب اور قاری دونوں کے لئے جو معیار انہوں نے تخلیق کیا اس کو چھونا اس معیار کو پانا کچھ آسان نہیں۔

تحریم محمود

جب برائی زیادہ ہو جائے

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیند سے جاگے اور فرمایا۔

''لا الہ الا اللہ، خرابی ہے عرب کی اس آفت سے جو نزدیک ہے، آج یاجوج اور ماجوج کی آڑ اتنی کھل گئی۔'' (یعنی انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی سے حلقہ بنایا) میں نے عرض کیا۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم تباہ ہو جائیں گے، ایسی حالت میں جب ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ہاں، جب برائی زیادہ ہو گی۔'' (یعنی فسق و فجور یا زنا یا اولاد زنا یا معاصی) (صحیح بخاری)

سعدیہ جبار، ملتان

رضائے الٰہی

امیر المومنین حضرت سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں۔

''مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں کس حال میں صبح کروں گا، آیا اس پر جس کو میری طبیعت ناپسند کرتی ہے یا اس حال پر کہ جس کو میری طبیعت پسند کرتی ہے، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میری بھلائی اور بہتری کس میں ہے۔''

یہ بات اللہ تعالیٰ کی تدبیر، رضا مندی، اس کی پسندیدگی اور اختیار اور اس کی قضاء پر اطمینان و سکون ہونے کے سبب فرمائی۔

فرح عامر، جہلم

یادیں

بس یہی مشکل ہے کہ بھول جانا انسان کے بس میں نہیں، جو حادثہ ایک دفعہ گزر جائے، وہ یاد بن کے بار بار گزرتا ہے، بھولنے کی کوشش ہی اسے زندہ رکھتی ہے، انسان ظالم کو معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کے ظلم کو بھول نہیں سکتا، بھول جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔

موسم گزر جاتے ہیں لیکن یاد نہیں گزرتی، مرحوم زمانوں کی یاد مرحوم نہیں ہوتی، پرانے چہرے نئے چہروں میں نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں، پرانے غم نئے غم میں شامل نظر آتے ہیں۔

پرانی یاد نئی زندگی کے ساتھ چلتی ہے، نہ درد نہ یاد انسان کے اندر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے، یاد سے نجات کی کوشش دلدل سے نجات کی کوشش کی طرح رائیگاں ہو جاتی ہے۔

آنسہ ممتاز، رحیم یار خان

خشک چشمے

☆ لوگوں پر جو بھی بلا نازل ہوتی ہے وہ آنکھ کے سبب سے ہوتی ہے، نعمت و مصیبت دونوں آنکھ میں رکھ دی گئی ہیں۔

☆ جو نیک بخت ہیں وہ ماں کے شکم ہی سے نیک بخت پیدا ہوتے ہیں اور جو بد بخت

ہیں وہ بھی اس کے شکم ہی سے بدبخت نکلتے ہیں۔

☆ شریف، پارسا ہو جاتا ہے تو تواضع اختیار کرتا ہے، کمینہ، پارسا ہو جاتا ہے تو تکبر اختیار کرتا ہے۔

☆ دل آنکھ کی تابع ہے، آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے اور دل کے بگڑنے کے بعد شرم گاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

☆ اگر کسی نے تیرے ایذا کے لئے راہ میں کانٹے بکھیر دیے ہیں تو، تو اس کے راستے میں انتقاماً کانٹے نہ رکھو، وگرنہ دنیا میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

☆ اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی حقیقی کرم ہے۔

فائزہ قاسم، سکھر

روشن حرف وہ سارے

☆ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنا اور لوگوں پر اعتبار کرنا محض اس لئے نہ چھوڑ دیں کہ ان میں سے کچھ نے آپ کو مایوس کیا ہے، کوئی نہ کوئی شخص اور کوئی نہ کوئی پہلو آپ کا ضرور ہے۔

☆ جب آپ پہلا قدم اٹھا لیتے ہیں، تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، گھڑا چاہے کچا ہو پھر بھی پار پہنچا دیتا ہے۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

☆ احساس کمتری اور احساس برتری میں مبتلا انسان کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆ ذرا نا موافق حالات کی سوئی چبھی، شکل ہی نہیں حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔

فریال امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ

طرز تخاطب

ایک تاجر نے بہلول کو دیکھا، تو کہنے لگا۔

"یا شیخ میں کون سا مال خریدوں کہ مجھے فائدہ ہو؟"

بہلول نے جواب دیا۔

"روئی اور لوہا خرید لو۔"

تاجر نے ایسا ہی کیا، کچھ عرصے میں اس کی قیمت کئی گناہ بڑھ گئی اور تاجر کو بہت زیادہ فائدہ ہوا، کافی عرصہ گزر جانے کے بعد تاجر نے ایک بار پھر بہلول کو دیکھا تو کہنے لگا۔

"اے پاگل بہلول، اس سال میں کون سا مال خریدوں جو مجھے فائدہ ہو؟"

"اس سال پیاز اور تربوز خرید لو۔" تاجر نے اس بار بھی بہلول کے کہنے پر عمل کیا اور پیاز و تربوز کا اسٹاک کر لیا، لیکن کچھ ہی دن میں پیاز اور تربوز دونوں سڑ گئے اور اس مرتبہ تاجر کو بہت زیادہ نقصان ہوا، تاجر نے بہلول کے پاس جا کر اس غلط مشورے کی وجہ دریافت کی، بہلول کہنے لگا۔

"اے تاجر تم نے پہلی بار مجھے یا شیخ کہہ کر پکارا تھا، اس لئے میں نے عقل و منطق کے ساتھ تمہیں مشورہ دیا، لیکن تم دوسری بار مجھے پاگل کہہ کر تخاطب کیا، اس لئے میں نے تمہیں اپنے پاگل پن میں مشورہ دیا، پس تم اپنے نقصان کے ذمہ داری مجھ پر نہیں ڈال سکتے، کیونکہ کوزے میں وہ ہی نکالا جاتا ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔"

نعیم امین، کراچی

منافقت

اگرچہ اہل وفا ہیں خلوص کے بھوکے
مگر خلوص نہیں شرط دوستی کے لئے
یہ نکتہ ہم کو سکھایا ہے عہد حاضر نے
منافقت بھی ضروری ہے آدمی کے لئے

ہما رائے، کراچی

یاد

سکوت شام جب خاموش کر جائے زمانے کو
ستارے آئیں جس دم نور کی چادر بچھانے کو
نسیم صبح جب چلتی ہو دنیا کے سلانے کو
یہ الفاظ دگر جب نیند آ جائے زمانے کو
تو تم یہ جان لینا کہ کوئی تم کو یاد کرتا ہے

نازیہ کمال، حیدر آباد

غیر ملکی کہاوتیں

☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ جہاں صدق و خلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، ورنہ تنہائی ہی تمہاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)

☆ کپڑے کاٹنے سے پہلے سات بار ناپ لو کیونکہ اسے کاٹنے کا ایک ہی موقع ملتا ہے۔ (چینی کہاوت)

☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (اسپینی کہاوت)

☆ گھر میں حقیقی معنوں میں صرف ایک نوکر کام کرتا ہے، وہ ہے گھر کا مالک۔ (جرمنی کہاوت)

☆ جو بات عقل چھپاتی ہے، نشہ اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

☆ زبان عمر کو چھوٹا کرتی ہے، جبکہ زبان سر کی نگہبان بھی ہے۔ (ایرانی کہاوت)

☆ بزدل مریض کو کوئی ڈاکٹر اچھا نہیں کر سکتا۔ (افغانی کہاوت)

☆ دولت جب بولتی ہے تو سچائی بھی بعض دفعہ خاموش ہو جاتی ہے۔ (مصری کہاوت)

☆ نیند آدھی غذا کا کام کرتی ہے۔ (سوڈانی کہاوت)

☆ پیٹ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے کان نہیں ہوتے۔ (اردنی کہاوت)

نبیہ آصف، قصور

گوہر آبدار

☆ کہانی میں نام اور تاریخ کے سوا سب کچھ سچ ہوتا ہے اور تاریخ میں نام اور تاریخ کے سوا کچھ بھی سچ نہیں ہوتا۔

☆ سانس کا سفر ختم ہو جاتا ہے، لیکن آس کا سفر باقی رہتا ہے، یہ ہی تو وہ سفر ہے جو انسان کو متحرک رکھتا ہے اور متحرک ہونا زندگی کی علامت ہے، یہ علامت رگوں میں خون کی طرح دوڑتی رہے تو انسان مایوس نہیں ہوتا، چاہے سانس کا سفر ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

☆ گزرا ہوا واقعہ گزرتا ہی تو نہیں ہے بلکہ وہ یاد بن کر بار بار گزرتا ہے۔

☆ محبت اور بارش ایک جیسی ہوتی ہے، دونوں ہی یادگار ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ بارش ساتھ رہ کر جسم بھگواتی ہے اور محبت دور رہ کر آنکھیں بھگو دیتی ہے۔

☆ کبھی کبھی خلوص، خون سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

مریم رباب، خانیوال

☆☆☆

نازیہ کمال ---- حیدرآباد

یہ ضد ہے ہماری کہ ایسے چھین لیں سب سے
ہم اور زمانے سے تقاضا نہیں کرتے
گوشہ تنہائی میں رو لیتے ہیں اکثر
ہم شہر کی گلیوں میں تماشا نہیں کرتے

....

ہم نے اپنی اداسی کا اس طرح بھرم رکھا
رابطے کم کر دیے مغرور کہلانے لگے

....

محور سوچ دونوں کا ایک ہی ہے
مجھے اس سے اور اسے خود سے فرصت نہیں ملتی

ہمارائے ---- کراچی

ڈھلنے لگی تھی رات کو تم یاد آ گئے
پھر اس کے بعد رات بہت دیر تک رہی

....

بہت امید رکھنا اور پھر بے آس ہونا بھی
بشر کو مار دیتا ہے بہت احساس ہونا بھی

....

عشق ہے اپنے اصولوں پہ ازل سے قائم
امتحاں جس کا بھی لیتا ہے رعایت نہیں کرتا

مریم رباب ---- خانیوال

محبت کے سفر میں دل جلا کر چین ملتا ہے
تمہارے درد کی محفل سجا کر چین ملتا ہے
کبھی احساس ہوتا ہے بہاروں کے اجڑنے کا
کبھی سوکھے ہوئے پتے اٹھا کر چین ملتا ہے

....

تیر کھائے ہیں ہم نے اپنوں سے

یہ کرم خیر خواہ کرتے رہے
اپنا سمجھا تھا ہم نے جن کو قدیر
وہ ستم بے پناہ کرتے رہے

....

تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریرہ

نبیہ آصف ---- قصور

یوں ذہن میں جمال رسالت سما گیا
میرا جہاں فکر و نظر سما گیا
اس کے قدم سے پھوٹ پڑا چشمہ بہار
وہ دشت زندگی کو گلستان بنا گیا

....

میں کرب کے تپتے صحرا میں کھڑا ہوں
آقا تیری رحمت کو دیکھ رہا ہوں
گو مجھ کو عقیدت کا سلیقہ تو نہیں ہے
اتنا ہی کافی ہے تیرے در پہ کھڑا ہوں

....

یہ آسمان محبت پہ کیسی رونق ہے
چمکتا عشق محمدؐ میں ہر ستارا ہے

اُم خدیجہ ---- شاہدرہ لاہور

کون اجڑا ہوگا بھری دنیا میں ہماری طرح محسن
وہ بھی نہ ملا ہم کو اور ہم خود کو بھی گنوا بیٹھے

....

تیرے قریب رہ کر تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بد حواسیاں نہ گئیں

....

ہیں دفن مجھ میں میری کتنی رونقیں مت پوچھو

اجڑ اجڑ کر جو بستا رہا وہ شہر ہوں میں

ثمینہ رفیق ---- کورنگی کراچی

مغرور ہی سہی مجھے وہ اچھا بہت لگا
وہ اجنبی تو تھا مگر اپنا بہت لگا
روٹھا ہوا تھا ہنس تو پڑا مجھے دیکھ کر
مجھ کو اس قدر بھی دلاسا بہت لگا

....

باقی ہیں تیری یاد کے کچھ نقش ابھی تک
دل بے سرو سامان سہی ویران تو نہیں

....

نہ وہ آنکھ ہی تیری آنکھ تھی نہ وہ خواب ہی تیرا خواب تھا
دل منتظر تو پھر کس لئے تیرا جاگنا اسے بھول جا
وبساط جاں ہی الٹ گیا وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اسے پکارنے سے حصول کیا اسے مت بلا اسے بھول جا

ثناء حیدر ---- سرگودھا

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن ہیں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نماز شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

....

سوچا کیسے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اسے یاد بھی نہیں
ہم جی کو خوں کر گئے جس کے ملال میں

....

عمر بھر کی ہیں مسافتیں یہ دوریاں یہ فاصلے
تم چاہو تو کچھ عجب نہیں یہ پل ہیں سر ہو جائیں
میں کاٹ سکوں گا تنہا نہ تم کاٹ سکو گے
یہ زیست کے کٹھن راستے ہمسفر ہو جائیں

رمشہ ظفر ---- بہاول پور

جاگا نہیں گیا کبھی سویا نہیں گیا
ہم سے حساب ہجر میں نہیں رکھا گیا

اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کیے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

....

تمہاری یادیں کسی مفلس کی پونجی جیسی
جسے ہم ساتھ رکھتے ہیں جسے ہم روز گنتے ہیں

....

تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستور الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی

درثمن ---- میاں چنوں

سوچتا ہوں کبھی تیرے دل میں اتر کر دیکھ لوں
کون بسا ہے تیرے دل میں جو مجھے بسنے نہیں دیتا

....

دین دھرم سب پاپ ہوئے غربت تقویٰ چھین گئی
رات گئے کل شہر سے باہر رہبر رستہ بیچ رہا تھا
تعلیم کا زیور پہن کر بھی بہنیں میری کنواری ہیں
یہ کہہ کر کل اک مفلس بچہ اپنا بستہ بیچ رہا تھا

....

سدا رہے جکڑے قسمت کی جو زنجیروں میں
ہمارا نام بھی شامل ہے ان اسیروں میں
وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑان بھرتی ہے
اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں

آسیہ وحید ---- لاہور

وہ محبتوں کے سودے بھی عجیب کرتا ہے فراز
بس مسکراتا ہے اور دل خرید لیتا ہے

....

تمہارا ساتھ تسلسل سے چاہیے مجھ کو
تھکن زمانوں کی لمحوں میں کب اترتی ہے

....

ہمیں آ کر منا لینا
کسی بھی شام سے پہلے
اداسی ٹھہر جاتی ہے
تمہارے نام سے پہلے

جویریہ ناصر ---- گلبرگ لاہور

کاش ایسا ہو اب کے بے وفائی میں کروں
تو پھرے قریہ بہ قریہ کوبہ کو میرے لئے
میں لامحدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تو بہے دریا بہ دریا جو بہ جو میرے لئے

....

روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو
ہم نے یہ سوچ کر ہی تم کو خفا رکھا ہے

....

تاروں کو گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

رابعہ ارشد ---- فیصل آباد

تمام عمر کی بیداریاں بھی سہہ لیں گے
ملی ہے چھاؤں تو بس ایک نیند سو لیں آج

....

کچھ ایسی بھی گزری تھیں تیرے ہجر کی راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

....

ہم رہا ہونے کو تھے جب خواہشوں کی قید سے
اس کو نیند اچھی تو مجھ کو رت جگا اچھا لگا

مسرت مصباح ---- لاڑکانہ

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں

....

بھول کر ذات تم کو یاد کیا
بات بے بات تم کو یاد کیا
نیند ناراض ہو گئی ہم سے
ہم نے جس رات تم کو یاد کیا

....

گردش دوراں زمانے کی نظر آنکھوں کو نیند
کتنے دشمن اک رسم دوستی سے ہو گئے

اُم ایمن ---- گوجرانوالہ

گزرتے ہیں یہ لمحے خاموشی سے
مگر ایسے کہ نیندیں ہی اڑا دیں

....

برسات کے موسم سے تجھے پیار بہت تھا
اب دیکھ لے آ کر میری بھیگی ہوئی آنکھیں

....

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں پہ دھوپ کہیں بارشوں کا موسم ہے

عابدہ سعید ---- گجرات

رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

....

رتوں کا قاعدہ ہے یہ وقت پہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رک گیا فریاد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

....

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کسی مٹی میں بونا ہے

سعدیہ جبار ---- ملتان

آنکھ تازہ منظروں کی آس میں کھو جائے گی
دل پرانے موسموں کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

....

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لا دے

....

تمہاری یاد کے موسم بھی رخ بدلنے لگے
ہوا تھمی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے

☆☆☆

بلقیس بھٹی

ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں نثار صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا؟

”جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔“

اُم خدیجہ، شاہدرہ لاہور

غلط فہمی

ایک حسین وجمیل عورت اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی، اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور سر بھی بڑا سا گومڑا تھا، ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے دوران چوٹوں کا سبب معلوم کیا تو خاتون نے جواب دیا۔

”یہ میرے شوہر کی عنایت ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔

”مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ کے شوہر تو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں؟“

خاتون نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”جی، میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھی۔“

ثمینہ رفیق، کورنگی کراچی

مسٹر کافی

اک یار سے میں نے کہا دو لفظ ہی لکھ دو
چلتی ہے سفارش یہاں اور تم ہو [illegible]
کہنے لگے کافی کی پیالی کو اٹھا
بس نام بتا دینا مرا نام ہے کافی

ثناء حیدر، سرگودھا

جوتے

اس بات پہ ہم کو تو تعجب نہیں مطلق
کھائے ہیں جو بغداد میں مردود نے جوتے
تاریخ کے صفحات پہ دیتے ہی گواہی
کھائے ہیں ہر اک دور میں نمرود نے جوتے

رمشہ ظفر، بہاول پور

دیکھ بھال

بھنوا کے پہلے کھائیں کلیجی کی بوٹیاں
معشوق نے ڈکار لی پھر دیکھ بھال کے
اس میں قصور عاشق مرحوم کا بھی تھا
کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے

درثمن، میاں چنوں

اعتراف گناہ

تین خواتین گپ شپ کر رہی تھیں کہ سنجیدہ موضوعات بھی زیر بحث آ گئے، ایک خاتون بولیں۔

”آج کل زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، موت

صائمہ محمود

سعدیہ جبار: کی ڈائری سے ایک نظم

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو
زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدمی تو تم بھی ہو
آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے
آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے
آہنگ سے آدمی سے وابستہ
آدمی کے دامن سے آدمی ہے وابستہ
ان سے تم نہیں ڈرتے
ان کہی سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی
اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
روح کی زباں بن کر
راہ کا نشاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو
روشنی تو ہم بھی ہیں
شہر کی فصیلوں پر دیو کا جو سایہ تھا
پاک ہو گیا آخر خاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی چاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق سے جیسے راہ رو کا فوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو
شہر بھی بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو
ہاں ابھی تو تم بھی ہو
ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں
تم ابھی سے ڈرتے ہو۔

آنسہ ممتاز: کی ڈائری سے خوبصورت غزل

ہمارا یہ تم کو سلام آخری ہے
سنو! آج تم سے کلام آخری ہے
اگر ہو سکے تو بھلا دینا ہم کو
بس ایک چھوٹا سا کام آخری ہے
ابھی آرزوؤں کے صحرا ہیں پیاسے
مگر آنسوؤں کا یہ جام آخری ہے
مریض محبت کی اے چارہ سازو
تمہارے نگر میں یہ شام آخری ہے
ذرا دیر ٹھہرو قضا کے فرشتو!
لبوں پہ ہمارے پیام آخری ہے
کوئی مل سکے گا نہ امجد کے جیسا
ترے حسن کا یہ غلام آخری ہے

فرح عامر: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

بالکل اچانک بھی آ سکتی ہے، ہمیں کم از کم ایک دوسرے کے سامنے اپنی سب سے بڑی برائی یا گناہ کا اعتراف کر لینا چاہیے، ابتدا میں ہی کرتی ہوں، میرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ میں نے جو رفاہی تنظیم بنائی ہے، اس کے تمام فنڈز خورد برد کر چکی ہوں۔"

دوسری خاتون نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا۔

"میرا گناہ یہ ہے کہ میں پچھلے چھ سال سے اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں۔" تیسری خاتون بولیں۔

"مجھ میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ مجھے جس کا بھی راز معلوم ہو جاتا ہے، وہ میں ادھر ادھر ضرور بتاتی پھرتی ہوں، اچھا، اب میں چلتی ہوں۔"

عاصمہ سرور، وہاڑی

خصوصی پرواز

بیس گھنٹے کے سفر پر روانہ ہونے والی مسافر پرواز کی ائیر ہوسٹس نے بھرپور انداز میں سب مسافروں کو خوش آمدید کہا اور شیریں لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں اپنے ادارے کی طرف سے تمام مسافروں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے پرسکون اور محفوظ سفر کے لئے ہماری کمپنی کا انتخاب کیا، آپ کو بتاتے چلیں کہ ایک چھوٹی اور غیر معمولی خبر یہ ہے کہ ٹی بیگز اور ملک پاؤڈر ختم ہونے کی وجہ سے چائے یا کافی دستیاب نہیں ہو گی۔" یہ سنتے ہی مسافر سرد آہیں بھرنے لگے۔

ائیر ہوسٹس دوبارہ قاتل مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ایک اور خبر یہ ہے کہ لنچ اور ڈنر کا انتظام نہ کرنے کے سلسلے میں ہماری خدمت قبول فرمائیں، اگر ہم مطلوبہ سامان خریدنے جاتے تو ممکن تھا کہ ہماری پرواز لیٹ ہو جاتی، لہٰذا ہم نے آپ کے قیمتی وقت کو اہمیت دی، انسان گھر میں بھی جا کر کھا پی سکتا ہے۔" یہ سنتے ہی وہ مسافر جن کا بھوک سے برا حال تھا، انتہائی غصے میں بولے۔

"ارے اس جہاز میں کیا پینے کا پانی بھی نہیں ہے؟"

ائیر ہوسٹس ایک کافرادا کے ساتھ مسکرا کر بولی۔

"اس بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس ایک ڈیڑھ لیٹر منرل واٹر موجود ہے۔"

یہ سنتے ہی مسافروں نے غصے کے عالم میں کہا۔

"اسے گلاس میں ڈالو اور شرم سے ڈوب مرو۔" یہ سن کر ائیر ہوسٹس کا چہرہ چمک اٹھا، اس نے گردن جھکائی اور پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ کتنے اچھے ہیں، آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ، اگر آپ پینے کے لئے پانی مانگ لیتے تو ہمیں کتنی پرابلم ہوتی۔"

آسیہ وحید، لاہور

ہر جگہ

مکینک کے انٹرویو ہو رہے تھے، ایک سردار جی جب آئے تو ان سے پوچھا گیا۔

"پہلے یہ بتائیں کہ بجلی کی موٹر کیسے چلتی ہے۔" سردار جی نے مسکرا کر کہا۔

"بہت آسان سوال ہے بجلی کی موٹر تو ہر جگہ ایسے ہی چلتی ہے گڑ......گڑ......گڑ۔"

عابدہ سعید، گجرات

☆☆☆

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے پر
اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
کچھ راکھ لئے جھولی میں
اور سر پہ سیاہو کار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ خواب سجل مسکانوں کے
کچھ بول بہت دیوانوں کے
کچھ الفاظ جنہیں معانی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

فائزہ قاسم: کی ڈائری سے ایک غزل

پھر وہی میں ہوں وہی درد کا صحرا یارو
تم بے بچھڑا ہوں تو دکھ پائے ہیں کیا کیا یارو
پیاس اتنی ہے کہ آنکھوں میں بیاباں چمکیں
دھوپ ایسی ہے کہ جیسے کوئی دریا یارو
یاد کرتی ہیں تمہیں آبلہ پائی کی رتیں
کس بیاباں میں ہو میرے تنہا یارو
تم تو نزدیک رگ جاں سے تھے تمہیں کیا کہنا
میں نے دشمن کو بھی دشمن نہیں سمجھا یارو
آسماں گرد میں گم ہے کہ گھٹا چھائی ہے
کچھ بتاؤ کہ میرا شہر ہے پیاسا یارو
کیا کہوں کہ وہ گل ہے کہ شبنم غزل ہے کہ غزال
تم نے دیکھا ہی نہیں اس کا سراپا یارو
اس کے ہونٹوں کے تبسم میں تھی خوشبو غم کی
ہم نے محسن کو بہت دیر میں سمجھا یارو

فریال امین: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

”دعا“

تم مجھے بہت عزیز ہو
سوچتا ہوں خدا سے
تمہارے لئے کیا مانگوں
دولت وشہرت علم واقبال مندی
خوشی وکامرانی
شادمانی محبت یا شادی عشق
سکون جاں یا بے تابی روح
کون سی دعا مانگوں، اچھا سنو!
میں تمہارے لئے
سب سے اچھی دعا مانگتا ہوں
کہ عجب نہیں میرا خدا تمہیں بھی
قلب مطمئن عطا کر دے

نعیم امین: کی ڈائری سے ایک نظم

اک دن
تم نے مجھ سے کہا تھا
دھوپ کڑی ہے
اپنا سایا ساتھ ہی رکھنا
وقت کے ترکش میں جو تیر تھے کھل کر برسے ہیں
زرد ہوا کے پتھریلے جھونکوں سے
جسم کا پنچھی گھائل ہے
دھوپ کا جنگل، پیاس کا دریا
ایسے میں آنسو کی اک اک بوند کا
انساں ترسے ہیں
تم نے مجھ سے کہا تھا
سب کی پہچان بھی رکھنا
میرے دل میں جھانک کے دیکھو
دیکھو ساتوں رنگ کا پھول کھلا ہے
وہ لمحہ جو میرا تھا وہ میرا ہے

☆☆☆

عین غین

سعدیہ جبار ---- ملتان

س: ع غ جی کیا کر رہے ہیں؟
ج: تم کیا کر رہی ہو۔
س: لو یہ کیا بات ہوئی الٹا ہم سے سوال؟
ج: چلو بتا ہی دیتے ہیں کیا یاد کرو گی۔
س: اب بتا بھی دیں؟
ج: مجھے بے صبرے لوگ پسند نہیں ہیں صبر سے کام لو۔
س: آپ عید الاضحیٰ پر کیا پسند کرتے ہیں؟
ج: سب کچھ پسند ہے آپ مرضی جو بھیج دیں۔
س: ہم تو حلوہ پوریاں بنائیں گے کیسے بھیجوں مشکل ہو جائے گی۔
ج: ویسے ہی تمہاری نیت نہیں ہے بہانے نہ بناؤ۔
س: ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں؟
ج: میں خود آجاؤں کھا بھی لوں گا اور مل بھی لوں گا۔

فرح عامر ---- جہلم

س: ہوں دیکھیں ع غ جی آپ تو حد سے بڑھ گئے، آپ کو انگلی پکڑائی آپ ہاتھ پکڑنے لگے۔
ج: توبہ توبہ ہوش کے ناخن لو میں بھلا تمہارا ہاتھ کیوں پکڑنے لگا میرے لئے کوئی کمی ہے۔
س: دل میں بسنے والوں سے ماہانہ کرایہ وصول کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟
ج: اسے دل کے ساتھ اپنی آنکھوں میں بھی بسا لیں۔
س: آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے الٹے پلٹے جوابات پڑھ کر اب حنا کے قارئین کیا سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟
ج: کیا غضب کے جواب دیتا ہے یہ بندہ۔
س: چلیں آج جلدی سے اپنی فیورٹ ڈش اور مشروب کا نام بتا دیں؟
ج: پی جی ایام کی تلخی کو ہنس کے ناصر۔
س: آپس کی بات ہے، آپ وہی عین غین ہیں ناں جو تین سال پہلے......؟
ج: ہاں ہاں وہی ہوں جس نے تمہیں قرض خواہوں سے بچایا تھا۔
س: میرا دل آج کل بے حد اداس ہے، اگر میرے سوالوں کے سیدھے منہ جواب نہ دیئے تو میں......؟ آگے آپ خود سمجھدار ہیں؟
ج: پہلے یہ بتاؤ دل اداس کیوں ہے اور وہ بھی آج کل۔

رضوان علی ---- رحیم یار خان

س: وقت طوفان کب اٹھاتا ہے؟
ج: جب تم کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو اور ”گرل“ کا بھائی آجائے۔
س: کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟
ج: بہت ضروری ہے ورنہ۔
س: سکون کی تلاش؟
ج: اپنے اندر تلاش کرو۔
س: کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟
ج: کون کہتا ہے۔

س: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟
ج: جب بیوی میکے ہو۔
س: آپ اتنی زیادہ ذہین کیوں ہیں؟
ج: یہی بات کل امان اللہ سے بھی کہہ رہے تھے۔

فائزہ قاسم —— سکھر

س: اب کیا ہوگا؟
ج: وہی جو ہم چاہتے ہیں۔
س: جدائی کی رات بہت طویل اور کربناک کیوں ہوتی ہے؟
ج: اکیلے میں ڈر جو لگتا ہے۔
س: وفا کی راہ میں آج میں اکیلی ہوں؟
ج: تیں سی لائی بے قدراں نال یاری۔
س: کیا گئے ہوئے لمحات واپس آسکتے ہیں؟
ج: گیا وقت پھر کب ہاتھ آتا ہے۔
س: کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی نہ ہو؟
ج: تاکہ گزری ہوئی باتوں پر کبھی خوش کبھی رنجیدہ ہوسکیں۔
س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟
ج: دل آنے کے ڈھنگ ہیں۔

فریال امین —— ٹوبہ ٹیک سنگھ

س: آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں یا کلیاں؟
ج: کلیاں کیوں کہ انہیں ابھی کھلنا ہوتا ہے۔
س: آپ کو بھینس کے آگے بین بجانا کیسا لگتا ہے؟
ج: مجھے تو چین کی صرف بنسری بجانی آتی ہے۔
س: سلجھی ہوئی حسینوں اور الجھی ہوئی حسینوں میں کیا فرق ہے؟
ج: جو ایک سمجھدار انسان اور ایک ناسمجھ انسان میں ہے۔
س: انسان جیتے جی کب مرتا ہے؟
ج: جب اس کی عقل کام نہ کرے۔
س: عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس بات کی تمنا کرتی ہے؟
ج: نئے ماڈل کی کار، وسیع و عریض بنگلہ اور دولت مند شوہر۔
س: اگر میں تمہاری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوچھوں کہ بوجھو تو؟
ج: بوجھ لیں گے۔

نسیم امین —— کراچی

س: ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں کئی دنوں سے؟
ج: اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔
س: ایک ڈال پر طوطا بیٹھا، ایک ڈال پر مینا ع غ جی کیا کہتا؟
ج: دونوں کو صحیح جگہوں پر رہنا چاہیے۔
س: اگر خواب صرف خواب ہی رہیں تو؟
ج: خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔
س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ اپنی جان کو روتے ہیں؟
ج: شادی بور کے لڈو ہیں جس نے کھائے وہ بھی پچھتائے جس نے نہیں کھائے وہ بھی پچھتائے۔
س: عورت اپنی عمر اور مرد اپنی آمدنی کیوں چھپاتے ہیں؟
ج: یہی چیز تو فساد کی جڑ ہے۔
س: لوگ کہتے ہیں عشق خلل ہے دماغ کا؟
ج: تبھی تو عاشقوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

نازیہ کمال —— حیدرآباد

س: یہ زندگی تیرے بغیر کیسے کٹے گی؟
ج: جیسے اب تک کٹی ہے۔

☆☆☆

افراح طارق

ہرے بھرے کباب

اشیاء

پودینہ	چار گٹھی
بیسن	ایک کپ
ہری مرچ	دس عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
ثابت دھنیا بھنا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر بڑے سائز کے	دو عدد
تیل	ڈیپ فرائی کے لئے

ترکیب

پودینے اور ہرا دھنیا کو صاف کر کے پتے الگ کرلیں اور انہیں دھو کر باریک کاٹ لیں، پیاز، ٹماٹر اور ہری مرچ کو باریک کاٹ کر اس آمیزے میں نمک، ثابت دھنیا اور بیسن ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں، جب یہ سخت آٹے کے پیڑے کے مانند ہو جائے تو اس کو ایک بڑے رول کی شکل دے دیں، اب ایک دیگچی میں پانی گرم کریں اور اس کے اوپر چھلنی رکھ کر اس پر رول رکھ دیں، کچھ دیر اسے بھاپ میں سخت ہونے دیں، اس کے بعد اس کے سلائس کاٹ لیں، کڑاہی میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں اور میں سلائس ڈال کر گولڈن براؤن کرلیں، مزے دار ہرے بھرے کباب تیار ہیں املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

یوگرٹ مٹن

اشیاء

بکرے کا گوشت دھولیں	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
پیاز باریک کاٹ لیں	دو عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ درمیانی سائز کی	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مصالحہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب

دیگچی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز ڈال کر گولڈن براؤن ہونے تک تلیں، گوشت، نمک اور ادرک لہسن پیسٹ ڈال دیں، دو منٹ تک بھون کر تقریباً چار گلاس پانی گوشت میں ڈال کر گلنے کے لئے چھوڑ دیں، (اگر پانی خشک ہو جائے اور گوشت نہ گلے تو تھوڑا پانی اور ڈال دیں) آدھی ہری مرچ گرائنڈر میں پیس لیں، جب گوشت گل جائے تو دہی پھینٹ کر اس میں ملا دیں اور ساتھ ہی پسی ہوئی ہری مرچ بھی ملا دیں، جب دہی کا پانی بھی خشک ہو جائے تو باقی کی ثابت ہری مرچوں کے درمیان میں کٹ لگا کر گوشت میں ڈال دیں، ہلکی آنچ پر مزید دس منٹ پکائیں، جب تیل اوپر آجائے تو اوپر سے پسا ہوا گرم مصالحہ ڈال دیں، مزے دار یوگرٹ مٹن تیار ہے، روغنی نان اور سلاد کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

جہانگیری سیخ کباب

اشیاء

قیمہ	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
کچری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
سونٹھ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
پیاز باریک کٹی ہوئی	دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا کوٹ لیں	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
کاجو باریک چوپ کرلیں	تین کھانے کے چمچے
خشخاش پیس لیں	ایک چائے کا چمچ
دیسی گھی	حسب ضرورت
ناریل پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
بیسن	دو کھانے کے چمچے
دہکتا ہوا کوئلہ	ایک عدد

ترکیب

ایک پیالے میں قیمہ، ادرک، لہسن پیسٹ، کچری پاؤڈر، سونٹھ، گرم مصالحہ پاؤڈر، پیاز، ثابت دھنیا، نمک، لال مرچ کا پاؤڈر، خشخاش، ناریل پاؤڈر اور بیسن ڈال کر اچھی طرح مکس کریں، جس طرح آٹا گوندھتے ہیں اس طرح گوندھ لیں، اس کو بیس منٹ کے لئے رکھ دیں، پھر درمیان ڈبل روٹی یا پیاز کا چھلکا رکھ کر کوئلہ رکھیں، دو تین قطرے دیسی گھی ٹپکا کر ڈھک دیں۔

اب اس قیمے کو سیخوں پر سیخ کباب کی طرح چڑھا کر دہکتے کوئلے پر سینک لیں، دیسی گھی کا بگھار لگا کر سرونگ ڈش میں نکال لیں، پراٹھوں یا نان کے ساتھ سرو کریں۔

منگولین گوشت

اشیاء

گوشت	آدھا کلو
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
چینی	آدھا چائے کا چمچ
گرم مصالحہ پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچ

سوس بنانے کے لئے:۔

مرغی کی یخنی	چوتھائی کپ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت
سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
چلی سوس	آدھا چائے کا چمچ
چینی	آدھا چائے کا چمچ
کارن فلور	ڈیڑھ چائے کا چمچ
ہری مرچ	آٹھ عدد
لہسن کے جوئے	چار عدد
ثابت لال مرچ	آٹھ سے دس عدد
ثابت سیاہ مرچ	چوتھائی چائے کا چمچ
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا

ترکیب

مرغی کی یخنی میں سویا ساس، سرکہ، چینی سوس، چینی اور کارن فلور ڈال کر مکس کر کے سوس تیار کریں۔

کڑاہی میں دو چمچے تیل گرم کریں، اس میں لال مرچ ڈال کر کڑکڑائیں اور گوشت، گرم مصالحہ پاؤڈر، سویا ساس اور سرکہ ڈال کر تقریباً پانچ منٹ کے لئے فرائی کریں، دوسری کڑاہی میں تھوڑا سا تیل ڈالیں، اس میں ہری پیاز، سیاہ مرچ اور چینی ڈال کر پکائیں، جب سارا مصالحہ بھون جائے تو گوشت ڈالیں اور ساتھ ہی سوس بھی ڈال دیں اور پکا کر گاڑھا کرلیں سادہ ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

کابلی چنے کے کباب

اشیاء

کابلی چنے ابلے ہوئے	آدھا کلو
آٹا	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
سفید تل	تین کھانے کے چمچے
تیل	فرائی کے لئے

ترکیب

چنے اچھی طرح ابال کر میش کرلیں، اس میں آٹا، نمک، لال مرچ، سیاہ مرچ پاؤڈر، ہری مرچ، زیرہ اور تل ڈال کر مکس کریں، ہاتھ سے گول کباب بنائیں، تیل گرم کر کے کبابوں کو ہلکا فرائی کر کے دونوں طرف سے گولڈن کرلیں کیچپ اور کھٹی میٹھی املی سوس کے ساتھ سرو کریں۔

ہنٹر بیف

اشیاء

بیف	ڈیڑھ کلو
دار چینی	چار اسٹکس
ثابت سیاہ مرچیں	تین چائے کے چمچے
لونگیں	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ کٹا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
لیموں رس نکال لیں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
قلمی شورہ (کالا نمک)	دو کھانے کا چمچ
دیسی گڑ	تین کھانے کے چمچے

ترکیب

بیف کو کانٹے سے اچھی طرح گود لیں، دار چینی، ثابت سیاہ مرچیں، لونگ، سفید زیرہ، نمک، قلمی شورہ اور دیسی گڑ ملا کر مصالحہ کو اچھی طرح پیس لیں، اس کے بعد لیموں کا رس اور پسا ہوا مصالحہ گوشت پر لگا کر چار سے پانچ دن کے لئے فریج میں رکھیں اور روزانہ گوشت کو گود لیں، چار پانچ منٹ کے بعد تین کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں، تیار ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے سلائس کاٹ لیں، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

شکارپوری کباب

اشیاء

قیمہ	ایک کلو
لونگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
دار چینی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
چھوٹی الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
جاوتری	ایک چٹکی
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچ
ادرک، لہسن	چار کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
ہری مرچ	آٹھ عدد
لہسن	دس جوئے
پیاز	دو عدد
کشمش	دس عدد

ترکیب

ایک برتن میں قیمے کے ساتھ لونگ، دار چینی، چھوٹی الائچی، جاوتری، سرخ مرچ، لہسن، ادرک کا پیسٹ اور نمک ملا کر گلا لیں اور ٹھنڈا کر لیں، ٹھنڈا ہونے کے بعد پیس کے ان کی چھوٹی چھوٹی گیندیں بنا لیں، کشمش سمیت باقی ہرا مصالحہ پیس کر ان گیندوں میں بھر لیں اور انڈے میں ڈبو کر تل لیں، پودینے کی چٹنی اور نان کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لئے بے شمار دعائیں لئے ہوئے۔

ابتدا سے اب تک تہذیب انسانی نے جو ترقی کی ہے وہ علم کی ہر مرہون منت ہے، کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے معیاری تعلیمی نظام ناگزیر ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جو قومیں علم سے دور اور عیش و عشرت میں پڑی ان کا زوال شروع ہو گیا، اس تیز رفتار دنیا میں جب کہ ہر گزرتا لمحہ ترقی و تبدیلی کا پیغام لا رہا ہے، اپنا وجود قائم رکھنے اور دنیا سے منوانے کے لئے ضروری ہے کہ علمی اور عقلی جدوجہد میں پیچھے نہ رہیں ورنہ ہر میدان میں پیچھے رہ جائیں گے۔

آج ہم جن مشکلات سے گزر رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم جدید علوم سے دور رہیں ہمارے گورنمنٹ تعلیمی ادارے زبوں حالی کا شکار ہے، جن نجی تعلیمی اداروں میں جدید سہولیات موجود ہے وہ پاکستان کی تقریباً ساٹھ فیصد آبادی کی پہنچ سے باہر ہے، جس ملک میں غربت، افلاس اور جہالت کا راج ہو وہاں ترقی کا تصور بھی محال ہے، تمام تر قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود آج ہم کشکول لئے دنیا کے سامنے سراپا سوال بنے کھڑے ہیں تو یقیناً یہ ہماری اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔

یاد رکھیے کوئی بھی قوم ہو یا فرد اپنے حالات بدلنے کے لئے خود محنت اور کوشش کرنا پڑتی ہے تب ہی قدرت بھی ساتھ رہتی ہے۔

اپنا خیال رکھیے گا ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں اور اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیے گا یہ سوچ کر نہ جانے کس کی زبان سے نکلنے والی دعا ہماری بخشش کا سبب بن جائے، اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے، ہمارے گناہ معاف فرمائے اور ہمیں اور ہمارے پیارے ملک پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

اس سے پہلے کے ہم آپ کے خطوط کی طرف چلیں آسان اور کامیاب زندگی گزارنے کا انتہائی آسان نسخہ نوٹ کر لیجیے۔

دورود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کا ورد اپنی روزمرہ زندگی کا لازمی جز بنا لیجیے پھر دیکھیے دنیا کی کامیابیاں آپ کی منتظر ہوں گی انشاء اللہ۔

لیجیے اب چلتے ہیں خطوط کی کھٹی میٹھی محفل میں یہ پہلا خط ارسہ زبیر کا اوکاڑہ سے موصول ہوا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہے۔

بارہ اکتوبر کا حنا عیدالضحیٰ نمبر کے ساتھ خوبصورت ٹائٹل سے سجا ملا، ٹائٹل گرل کی آنکھوں کی خوبصورتی کی کیا ہی بات ہے، حمد و نعت اور پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں کی تعریف کیا کریں الفاظ ہی نہیں ملتے، سید اختر ناز ہر موقعہ ہر لحاظ ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

جزاک اللہ۔

انشاء نامہ میں انشاء جی "آگے والے آدمی" کا دکھڑا سناتے ہوئے ملے، یہ مسئلہ تو ہم سب کا ہے ہر شخص آگے والے آدمی سے تنگ ہے، اس کے بعد ہم نے طیبہ ہاشمی کی تحریر کی طرف دوڑ لگائی، پچھلے دو ماہ سے انتظار تھا اس تحریر کا، طیبہ ہاشمی آپ ایک طویل عرصے کے بعد اپنی تحریر کے ساتھ آئی اور ہماری تمام شکایتوں کا ازالہ کر دیا، بے حد خوبصورت ماضی کے اوراق سے لی گئی تحریر، بڑی خوبصورت سے آپ نے واقعات کو لکھا، یوں لگ رہا تھا کہ سب ایک فلم کی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہو، آگرہ کی خوبصورتی کو آپ کے لفظوں میں ہم نے محسوس کیا، تھوڑا سا بد حزہ باقی آئندہ ماہ پڑھتے ہوئے، لیکن اگلی قسط کا اب شدت سے انتظار بھی ہے، سعدیہ عابد بھی طویل تحریر کے ساتھ آئی، موضوع اچھا تھا مگر کہیں کہیں کہانی مصنفہ کی گرفت سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، اس مرتبہ سندس جبیں کے ناولٹ کی قسط بھی شائع ہوئی، معذرت کے ساتھ سندس جی، اس مرتبہ کی آپ کی لکھی گئی قسط کافی بے جان سی لگی، یوں جیسے آپ نے نہ چاہتے ہوئے لکھا ہو دل سے نہیں لکھا ورنہ تو آپ ماشا اللہ بے حد اچھا لکھتی ہیں آخر یہ بے رخی کیوں؟

سلسلے وار ناول دونوں ہی اچھے تھے، جہاں فوزیہ غزل اپنی تحریر میں ہمیں اپنے ملک کی خوبصورتی سے متعارف کروا رہی ہے وہیں وہ ماریا کے دل میں بڑی خوبصورتی دین اسلام کی محبت کو اجاگر کر رہی ہے، اریبہ کی مشکلات بھی کم ہوتی نظر آ رہی ہے، ویسے فوزیہ جی اریبہ کے کردار میں ہمیں من و سلویٰ کی زینی کی جھلک نظر آ رہی ہے۔

اُم مریم کا انداز ہمیشہ کی طرح سبک ندی کی مانند جو بڑی خاموشی سے مگر بڑی روانی سے چلتی ہے، مریم جی آپ ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں لیکن نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ معاذ آپ کا چہیتا کردار ہے، اس کردار کو آپ نے بڑی سے لکھا، آپ کیا کہتی ہیں؟

افسانے بھی اچھے تھے مگر کنول ریاض کا افسانہ سب سے بہترین تھا، کنول ریاض جس عورت کو محبت اور عزت ایک ساتھ ملتی ہے وہ اگر سارا دن بھوکی بھی رہتی ہے اس کے پاس کوئی دنیاوی آسائش نہیں تو بھی وہ اس کرہ ارض کی خوش قسمت ترین عورت ہے" قرۃ العین رائے کا افسانہ بھی بہترین تھا بلکہ رافعہ اعجاز کا افسانہ بھی حقیقت سے قریب تر تھا، مستقل سلسلے عید کی مناسبت سے بھی اچھے تھے، جبکہ خبر نامہ کچھ خاص نہیں تھا، حنا کا دسترخوان سے اس عید پر میں نے خوب فائدہ اٹھایا، جبکہ نیا سلسلہ ایک دن حنا کے ساتھ میں مصباح نوشین کی سارا دن روداد دلچسپ تھی۔

آپی میں پہلی مرتبہ اس محفل میں آئی ہوں، یقیناً آپ مجھے اگنور نہیں کریں گی اور اس محفل میں جگہ دیں گی۔

ارسہ زبیر سب سے پہلے محفل میں آپ کو خوش آمدید، اکتوبر کا شمارہ عید نمبر آپ کو پسند آیا الحمدللہ ہماری محنت وصول ہوئی، آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین کو مل گئی، ہم آپ کی قیمتی رائے کے اگلے ماہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

ثمینہ بٹ: لاہور سے لکھتی ہیں۔

اس بار حنا سات تاریخ کو مل گیا، عید نمبر سے سجی سنوری ٹائٹل گرل اچھی لگی۔

اسلامیات والا حصہ حسب معمول بے حد سبق آموز اور شاندار تھا، سردار سر کی باتیں دل پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں، ہم بھی ان کی گہری

فکر انگیز باتوں میں تھوڑی دیر کو کھو کر رہ گئے اور پھر آگے آ گئے میرے پسندیدہ انشاء جی "آگے والا آدمی" بن کر اور مجھے لگا کہ یہ تو شاید لکھا ہی میرے لئے گیا ہے، مجھے بھی ہمیشہ آگے والے آدمی نے بہت پریشان کیا ہے۔

مصباح نوشین کے ساتھ دن گزار کر اچھا لگا، خاص طور پر ڈاکٹر حذیفہ اور پرنس اسوہ سے ملاقات بہت اچھی لگی، مصباح اللہ آپ کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے اور آپ کے بچوں کی خوشیاں آپ کو دیکھنی نصیب فرمائے، آمین ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور آپ سے مل کر واقعی بہت اچھا لگا۔

"کاسہ دل" لمبا انتظار کروانے کے بعد واپس آ ہی گیا، یہ قسط بھی اچھی تھی، افسانے اس بار چھ تھے، سمیرا گل کا "تہی داماں" حقیقت کے قریب لگا، واقعی ایک رشتہ عام رشتوں کا متبادل نہیں ہو سکتا، ہر رشتے کا ہماری زندگی میں ایک خاص مقام ہوتا ہے۔

ثمینہ بٹ کی "خزاں کا پھول" رسموں، رواجوں اور ذات پات کی قید میں پابند محبت آخر کار خزاں کے پھول کی طرح مرجھا ہی جاتی ہے، کنول ریاض نے بہت اچھے طریقے سے عورت کی مشکل کو بیان کیا، وہ ہی مشکل جو عورت کے لئے محبت اور عزت میں سے کسی کو چننے میں پیش آتی ہے۔

قرۃ العین رائے نے بہت زبردست سرپرائز دیا اپنے پیا کو، مگر یہ سرپرائز رانیہ کو بہت مہنگا بھی پڑ سکتا تھا۔

فرح طاہر قریشی کا "لاحاصلی کا حاصل" بھی اچھی کاوش تھی، لالچ واقعی انسان کو لے ڈوبتا ہے، ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، رافعہ اعجاز نے "بے تیغ سپاہی" کے بارے میں بہت اچھا لکھا، واقعی کالی بھیڑیں تو ہر شعبہ زندگی میں ہوتی ہیں مگر کچھ شعبے بد اچھا بدنام برا کی مثال پر عین صادق آتے ہیں، او ور آل تمام افسانے اپنے اپنے انداز میں بہت اچھے اور سبق آموز تھے۔

اور اب آتی ہوں مکمل ناولز کی طرف، طیبہ ہاشمی کا "سلطنت" ماضی کے خوبصورت رنگوں سے سجی خوبصورت تحریر، مگر باقی آئندہ نے مزہ ہی کرکرا کر دیا، اس لئے تفصیلی تبصرہ بھی باقی آئندہ اور سب سے اچھا ناول سعدیہ عابد کا "قربانی کی راہ میں" اس مہینے کی بہترین تحریر، زبردست سعدیہ نے بہت خوبصورت انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا، مگر چند چیزیں جو مجھے کھٹک رہی ہیں وہ اقصم اور ارباز کی شادی کے بعد کئی جگہوں پر ٹائم پیریڈ کا فرق، سعدیہ پلیز برا مت مانیے گا۔

باقی تمام سلسلے زبردست رہے، تمام سلسلوں میں ہی سب کچھ اچھا تھا، او ور آل حنا اس بار بھی زبردست رہا، مستقل ناول دونوں ہی اپنی مخصوص رفتار سے حسب معمول اچھے جا رہے ہیں۔

فوزیہ جی یہ تو ہو گیا تبصرہ اور اب میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اپنی ان تمام قارئین بہنوں کا جنہوں نے میری دونوں تحریروں "لاج" اور "ہلچل" کو پسند کیا، شکریہ جی بہت بہت شکریہ۔

ثمینہ بٹ بہت بہت شکریہ آپ کی آمد عید نمبر آپ کو پسند آیا، یہ جان کر خوشی ہوئی آپ نے اپنی بیٹیوں کے بارے میں بتایا، اللہ پاک انہیں مزید کامیابیوں سے نوازے، سعدیہ عابد کی تحریر میں جن غلطیوں کے بارے میں بتایا وہ بالکل درست ہے، ہم معذرت خواں ہیں کہ ہماری توجہ اس طرف کیوں نہ گئی، انشاء اللہ آئندہ خیال رکھیں گے، آپ کی تحریر مل گئی ہے کوشش کریں گے کہ جلد شائع کریں گے اپنا خیال رکھیئے گا اور دعاؤں میں

یاد رکھیئے گا، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

نورین شاہد: رحیم یار خان سے تشریف لائی ہے اور وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہے۔

سب سے پہلے آئے "کاسہ دل" کی طرف سندس جی پلیز دوبارہ چھٹی مت کیجئے گا میرا فیورٹ ناولٹ ہے، پلیز شاہ بخت اور علیعہ کی غلط فہمی کو دور کر دیں اور حبا کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ بھی ختم کر دیں کافی سزا بھگت لی ہے حبا نے، اب "تم آخری جزیزہ ہو" کی بات ہو جائے ام مریم آپ جو گانے شامل کرتی ہیں میرے پسندیدہ ہوتے ہیں خیر آپ تیمور کو کم شامل کیا کریں زہر لگتی ہیں اس کی حرکتیں اور یہ پرنیاں نے اتنی جلدی ہار مان لی پلیز اسے کچھ نہ ہوا اور یہ معاذ کا کردار بڑا ڈھیٹ ہے جہان اور ڑالے کی جوڑی تو بن گئی باقی آپ پر چھوڑا بس کچھ غلط نہ ہوا اس کے بعد آئے فوزیہ غزل کے ناول کی طرف آپی آپ جس طرح پاکستان کی خوبصورتی بیان کرتی ہیں سچ دل خوش ہو جاتا ہے اپنے وطن کی تعریف پر خدا ہمارے ملک کو بری نظروں سے بچائے آمین، فوزیہ آپی یہ وہاج کو اتنا سکون میں دیکھنا اچھا نہیں لگا مگر صبا سے اس کی شادی سے شاید شہریار اور سعیہ کی غلط فہمی دور ہو جائے، سعدیہ عابد کا مکمل ناول بھی پسند آیا بہت خوبصورت تحریر تھی، سعدیہ جی آپ کی "سلطنت" میں طیبہ ہاشمی کا تاریخ کو شامل کرنا بھلا لگا خاص طور پر ہیروئن کا اپنے آپ کو ہم کہنا ویسے لفظوں پر آپ کی گرفت قابل دید ہے اگلی قسط کا انتظار مشکل لگ رہا ہے، افسانے مجھے ہمیشہ سے سب ہی اچھے لگتے ہیں اس دفعہ بھی تمام بہنوں نے زبردست افسانے لکھے "تہی داماں" مریم نے ایک رشتے کی خاطر اتنے رشتے ٹھکرا کر نا فرمانی کی، "خزاں کا پھول" بہت اچھا لگا اداس مگر یاد رہنے والا، کنول ریاض نے بالکل ٹھیک لکھا عورت عزت اور محبت کی متلاشی ہوتی ہے اور بیک وقت دونوں خوش نصیب عورتوں کو ملتی ہیں قرۃ العین رائے نے بھی زبردست لکھا واقعی مرد کی محبت کو آزمانا نہیں چاہیے "لاحاصلی کا حاصل" فرح جی بالکل ٹھیک لکھا کبھی کبھی محبت ماں کی محبت اور شان کے آگے آ جاتی ہے جس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا، "بے تیغ سپاہی" رافعہ جی آپ نے بالکل درست کہا ہم صرف منفی رخ دیکھتے ہیں تصویر کا جبکہ آنکھوں سے اوجھل بھی ایک رخ ہوتا ہے نجانے کتنے سپاہی ایسے ہی جام شہادت نوش کرتے ہیں اور اپنے پیاروں کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں، ایک دن حنا کے نام میں مصباح نوشین سے ملاقات شاندار رہی ان کی روٹین جاننا اچھا لگا مستقل سلسلے تمام ہی زبردست ہوتے ہیں، فوزیہ شفیق جی جب آپ خطوں کے جواب دیتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے پلیز میری تحریروں کا بتا دیں، وہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

نورین شاہد کیسی ہو ڈیئر؟ خیریت تو تھی نہ جو آپ غائب رہیں؟ اکتوبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی رائے مصنفین کو مل گئی یقیناً وہ اس پر غور کریں گی، (فوزیہ غزل، ام مریم اور سندس جبیں آپ نے پڑھ لیا نہ نورین کیا کہہ رہی ہے) معذرت کے ساتھ کہ آپ کی تحریر ناقابل اشاعت ہے ابھی پڑھیں گے اور غور کریں گے کہ افسانہ لکھنے کے لئے کن کن لوازمات کا ہونا ضروری ہے اپنا خیال رکھیے گا اور اپنی رائے سے نوازتی رہیے گا شکریہ۔

نام نا معلوم: نا معلوم جگہ سے ایک ایسا خط ہے جی میں نہ تو جگہ کا نام لکھا گیا ہے اور نہ لکھنے والے

کا نام، اب بتائیں ہم کریں تو کیا کریں، خیر دیکھتے ہیں کہ اس گمنام تبصرے میں کس طرح کی رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے بے شمار دعاؤں کے بعد لکھا گیا ہے۔

آپی کیا بات ہے دو ماہ ہو گئے ہیں میرا کوئی بھی لیٹر شائع نہیں ہوا ہر بار اتنی حسرت سے اپنے لیٹر کو ڈھونڈتی ہوں میری غزلیں بھی شائع نہیں ہوئی آپی اگر شائع ہونے کے قابل نہیں تو پلیز بتا دیں آپی میں نے جو افسانہ بھیجا تھا کیا وہ بھی اشاعت کے قابل نہیں ہے پلیز آپی مجھے مایوس نہ کیجئے گا، حنا کی طرف اس ماہ کا شمارہ لیا جلدی سے قسط وار ناولز کی طرف بڑھی جس کا مجھے ہمیشہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے، اُم مریم صاحبہ کا ناول جس کا مجھے شدت سے انتظار رہتا ہے، پرنیاں کے ساتھ تو پہلی مرتبہ ہی بہت برا ہوا تھا لیکن اس مرتبہ تو بہت ہی برا ہوا بے چاری کو اتنی سزا دی گئی کیا اتنا پیار کرنے والا مرد اتنا بدل سکتا ہے اپنی محبت کو پس پشت ڈال کر نفرت کو ہوا دے رہا ہے تو اس میں حقیقت کا عکس نظر آتا ہے جیسے یہ سب بالکل سامنے ہو جب معاذ کا پرنیاں کے لئے اتنا پیار دیکھتی تھی تو ایک حسرت سی ہونے لگتی تھی کہ کاش کوئی اتنا چاہنے والا ہو لیکن شاید یہ سب کتابی باتیں ہوتی ہیں کوئی کسی کو اتنا پیار نہیں دیتا اب سندس جبیں کی طرف آتے ہیں تو آپی میں شاہ بخت کے ساتھ بہت برا سلوک ہو رہا ہے اور سندس جبیں صاحبہ توفل کو آپ نے کہاں غائب کیا اب تو معصب صاحب ستارا سے رشتہ جوڑنے والے ہیں تو توفل کا کیا بنے گا آپی باقی افسانے تو ابھی پڑھے نہیں اس لئے کچھ کہہ نہیں سکتی بہرحال سب بہت ہی اچھے ہوتے ہیں آپی پلیز میری چیزیں شائع کرنے کی کوشش کریں پلیز۔

گمنام بہنا پہلے تو آپ جلدی سے کاغذ قلم اٹھائیں اور اپنا نام و مقام لکھ کر بھیجیں، یقیناً جن خطوط کے شائع نہ ہونے کا آپ نے آپ نے شکوہ کیا ہے وہ کچھ ایسے ہی ہوتے ہوں گے، بے نام خطوط شائع نہیں کیے جاتے اس ماہ صرف اس لئے آپ کو اس محفل میں جگہ دی ہے کہ آپ جان لیں ہمارے پاس کوئی ایسا علم نہیں جس کے ذریعے آپ نام جان کر آپ کے تبصرے پر لکھیں اور اسے شائع کریں، یقیناً آپ کی تحریریں اور شاعری بھی انہی وجوہات کی بنا پر ناقابل اشاعت قرار دی گئی ہوں گی، آئندہ اس بات کا خیال رکھیے گا اور تبصرہ، افسانہ یا شاعری بھیجتے وقت اپنا نام اور جگہ کا نام ضرور لکھیے گا، اکتوبر کے شمارے کی پسندیدگی کے لئے آپ کا شکریہ۔

عشل خان وردگ۔ جہلم سے لکھتی ہیں۔

اکتوبر کا شمارہ اٹھ تاریخ کو ملا، ٹائٹل پر ماڈل بہت اچھی لگ رہی تھی، حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفید ہو کر پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں تو دل کو سکون آ گیا، اس کے بعد سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول "کاسہ دل" کی طرف چھلانگ لگائی، سندس جی یہ کہانی پہلے کی نسبت بہت بورنگ ہوتی جا رہی ہے اور سستی سے بھی، اب جلدی سے اس کا اینڈ کر دیں، اس میں شاہ بخت میرا پسندیدہ کردار ہے، حبا کا اتنا بھی قصور نہیں تھا کہ اسے معاف ہی نہ کیا جا سکے، اس کے بعد فوزیہ غزل کے ناول "وہ صبح امید کا ستارہ" میں انٹری ماری تو حیران پریشان رہ گئی، یہ کیا؟ اریبہ کی ماں بھی اسے چھوڑ کر چلی گئیں، بہت دکھ ہوا۔

اُم مریم کا ناول "تم آخری جزیرہ ہو" یہ تبصرہ لکھنے کی وجہ یہی ناول ہے، اُم مریم یہ ناول

بہت ہی بورنگ جا رہا ہے (معذرت کے ساتھ) پچھلے چند ماہ سے یہ ایک ہی جگہ پر رکا ہوا ہے، سارے ناول میں معاذ اور پرنیاں ہی ہیں ژالے اور جہان کو زیادہ دیا کریں، معاذ اور پرنیاں کو اب جلدی سے ٹھیک کر دیں، یہ کیا پرنیاں ٹھیک تو معاذ بگڑا ہوا اور اگر معاذ ٹھیک تو پرنیاں کو اپنی انا یاد آ جاتی ہے، مریم جی آپ یہ بھول ہی گئی ہیں کہ ژالے کی کوئی ماں نیلما بھی تھی اب اس راز کو بھی جلدی سے کھول دیں، اُم مریم آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ کے کردار اتنے خوبصورت، معصوم اور دولت مند ہوتے ہیں کہ بندہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے، حقیقت سے دو اور رومینس سے بھرپور، مہربانی کر کے ان میں تھوڑا رومینس ڈالا کریں، فوزیہ شفیق میں کسی بھی رسالے میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں پلیز مایوس مت کرنا۔

عشل خان وردگ اس محفل میں خوش آمدید، آپ کا نام بے حد خوبصورت ہے اس کے معنی کیا ہیں ضرور بتایئے گا، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کا پیغام اُم مریم، فوزیہ غزل اور سندس جبیں کو مل گیا ہے یقیناً وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گی، اگلے ماہ بھی آپ کی رائے کا انتظار رہے گا شکریہ۔

عشاء بھٹی: ڈیرہ غازی خان سے لکھتی ہیں۔

حنا سب معمول بارہ کو موصول ہوا، سرورق اس بار کچھ خاص نہ لگا خصوصاً ماڈل، اشتہارات پر سرسری نظر دوڑا کر آغاز "کچھ باتیں ہماریاں" سے کیا جہاں انکل کی باتوں نے ہمیشہ کی طرح دل چھو لیا۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" سے مستفید ہو کر "انشاء نامہ" پڑھا تو بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"ایک دن حنا کے نام" کا یہ سلسلہ بہت زبردست ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اس خوبصورت سلسلے نے حنا کی دلکشی میں چار چاند لگا دیے،

اس کے بعد اپنی ہارٹ فیورٹ فوزیہ غزل کے ناول "وہ ستارہ صبح امید کا" پڑھا جہاں سعدیہ کا بچپنا موڈ ہی آف کر گیا، اب اریبہ کا کیا ہوگا؟ شکر ہے سندس نے بھی دیدار کروایا۔

"کاسہ دل" ہمیشہ کی طرح چھایا رہا، پلیز سندس جی! شاہ بخت اور علینہ کو جلد از جلد ایک کر دیں، بیچارے شاہ بخت پر بہت ترس آتا ہے۔

اسید کی جنونیات بھی بہت بری لگتی ہے، سندس جی! کیا ہی اچھا ہو اگر حبا اور اسید کی زندگیوں میں محبت کے رنگ بکھیر دیئے جائیں معاف کرنا بھی تو بڑائی ہے، اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مکمل ناول میں طیبہ ہاشمی کی "سلطنت" میں قدم رکھا تو چکرا کر رہ گئی، طیبہ جی! یہ آپ نے ہمیں کس زمانے میں پہنچا دیا، جہاں گم جانے کا خدشہ لاحق ہو۔

سعدیہ عابد، "قربانی کی راہ میں" کھڑی طمانیت سے مسکرا رہی تھیں، ویری ویلڈن سعدیہ جی آپ کی قربانی رائیگاں نہیں گئی، اچھے لوگوں کے ساتھ سبھی گزر بسر کر سکتے ہیں، برے انسان کو اچھا بنا کر زندگی گزارنا بڑی بات ہے۔

اُم مریم کا "تم آخری جزیرہ ہو" عجیب سا رخ اختیار کر گیا ہے، معاذ کی حرکتیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مترادف ہے، اُم مریم جی! یہ بدتمیز معاذ بالکل اچھا نہیں لگا ہمیں تو بس شوخ و شرارتی سا معاذ پسند تھا۔

افسانے سبھی لاجواب تھے خصوصاً میری فیورٹ قرۃ العین رائے کا "مورا پیا موسے بولت نہ"، کنول ریاض "عورت، عزت اور محبت" کے

ساتھ آئیں اور دل میں جگہ پا گئیں، ویری ویلڈن "خزاں کا پھول" ثمینہ شیخ کا افسانہ بھی اچھا لگا، مستقل سلسلے بھی خوب تھے۔

"کس قیامت کے یہ نامے" میں فوزیہ آپی کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل کو لگی اور ان پر عمل کرنے کا عہد کیا تا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔

عشاء بھئی خوش رہو، ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی آپ کا بھرپور تبصرہ ملا، آپ کی رائے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتی ہے، حنا کا پسند کرنے کا شکریہ، اگلے ماہ بھی آپ کی محبتوں کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

مشعل وردگ: جہلم سے لکھتی ہیں۔

حنا ہمیشہ کی طرح سات اکتوبر کو مل گیا، سر ورق پر نظر پڑی تو دل خوش ہو گیا ماڈل انتہائی حسین تھی معصوم سی اور ڈری سہمی سی، سب سے پہلے چھلانگ لگا کر "کاسہ دل" پر پہنچ گئے شکر ہے سندس جبیں کی سواری بار برداری دو ماہ کے وقفے کے بعد تشریف لے ہی آئی، سندس جبیں اتنا لمبا وقفہ ہم قاری لوگوں کو فیڈ اپ کر دیتا ہے پلیز اس طرف توجہ دیں، آپ لکھ بہت زبردست رہی ہیں

"تم آخری جزیرہ ہو" ام مریم معذرت کے ساتھ آپ انتہائی فضول اور بونگا لکھ رہی ہیں، رومینس، رومینس اور دولت، دولت اور حسن، حسن اور بس یہی تین چیزیں کثرت سے آپ کی کہانی میں نظر آ رہی ہیں، جہان اتنا بے غیرت اور زینب اس سے بھی زیادہ، دونوں شادی شدہ ہو کر ایک دوسرے کو چھوڑنے کو تیار نہیں نہ جہان کو اپنی مردانگی کا خیال نہ ہی زینب کو اپنی نسوانیت کا اور دوسری طرف معاذ اور پرنیاں کیا ہی کہنا بھائی معاذ صاحب تو لگتا ہے ڈاکٹری پڑھنے کے ساتھ نصرت فتح علی خان اور غالب صاحب کے شاگرد ہیں، آپ کی کہانی کے کرداروں میں ہر طرف دولت و حسن ہی بکھرا پڑا ہے، اتنا حسن اور دولت اچھے اچھوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دے۔

"وہ ستارہ صبح امید کا" سعیہ اور شہریار کا کردار بہت اچھا سا ہے، میاں بیوی میں چلیں اتنا لڑنا اور جھگڑنا لگا رہتا ہے۔

وہاج کے ساتھ اینڈ میں سب بہتر اور اچھا مت کیجئے گا عام زندگی میں تو ایسے لوگ ہمیشہ بچ جاتے ہیں کم از کم ہم کہانیوں میں تو انصاف کو دیکھ کر اپنے دکھ کا ازالہ کر لیں۔

باقی حنا بھی اچھا تھا خاص کر "عورت، عزت اور محبت" کنول ریاض ویلڈن بہت بہت اچھا لکھا دریا کو کوزے میں بند کر دیا، "قربانی کی راہ میں" سعدیہ عابد کہانی میں کوئی ترتیب نہ تھی شروع مریم شاہ سے ہو رہی ہے تو اینڈ انعم یہ ہو رہا ہے اور مریم اور منیب کا ایک جملے میں اینڈ کر دیا کیا اتنی تذلیل کے بعد بھی عورت اتنی جلدی معاف کر دیتی ہے۔

"لاحاصل کا حاصل" فرح طاہر نے بھی کافی اچھا لکھا ویلڈن فرح، محبتیں تو نظر نہیں آتی اور چند ماہ پرانی محبتیں یاد رہ جاتی ہیں۔

مشعل خان وردگ اس محفل میں تھوڑی سی کیوں بہت زیادہ جگہ ہے آپ کے لئے، آیئے بیٹھیے اور نہ صرف ہماری طرف سے بلکہ اس محفل کے بھی دوستوں کی طرف سے خوش آمدید، حنا کا پسند کرنے کا شکریہ آپ کی رائے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، ہم آئندہ بھی آپ کی قیمتی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆